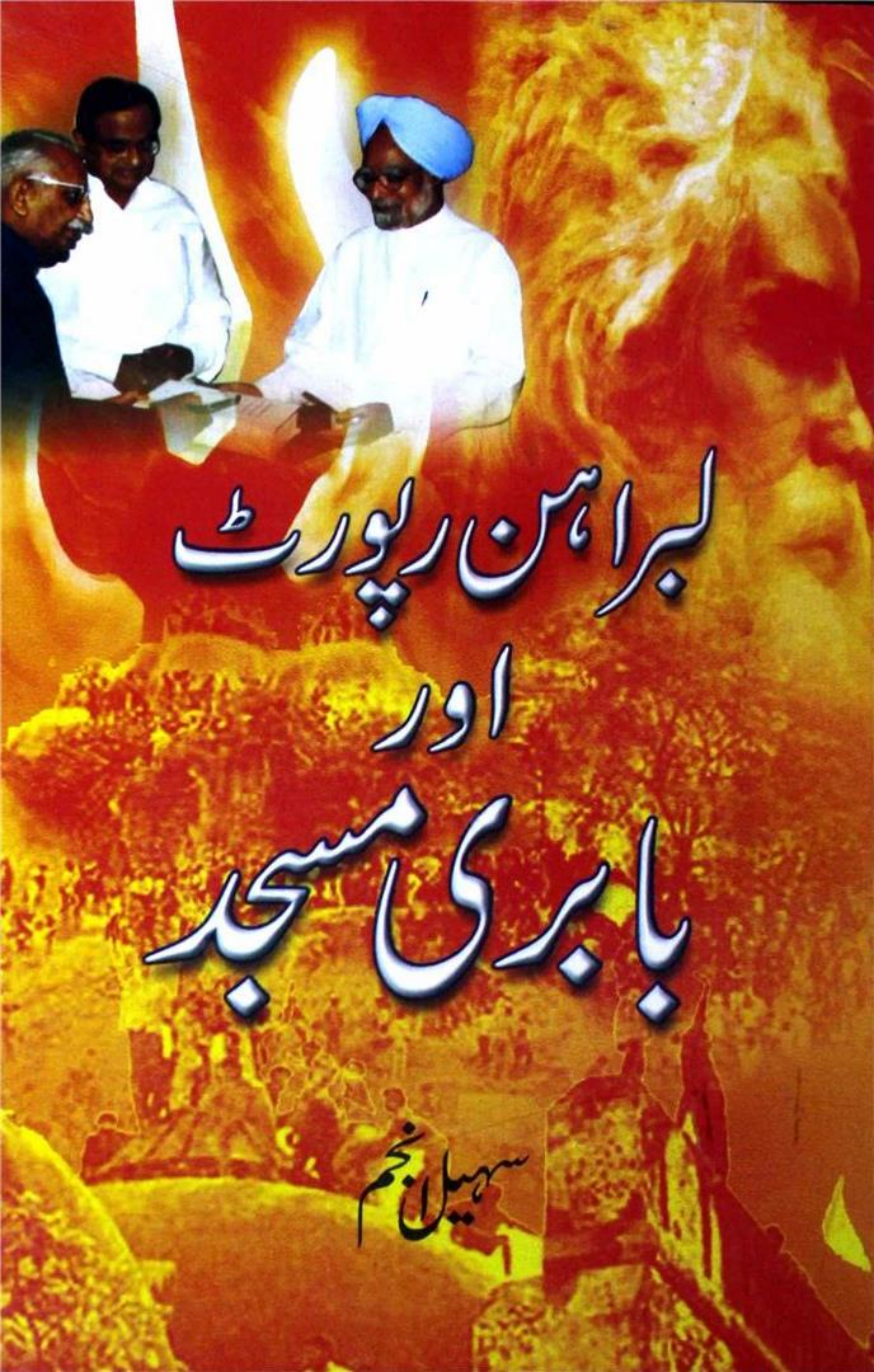




لبرائن رپورٹ

اور

بابری مسجد

سہیل انجم

لبر اہن کمیشن رپورٹ

اور

بابری مسجد

ترجمہ و ترتیب

سہیل انجم

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب :	لبر اہن کمیشن رپورٹ اور بابری مسجد
نام مرتب :	سہیل انجم
	D-78/A شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
اشاعت :	2010ء
تعداد :	گیارہ سو
صفحات :	332
قیمت :	
ناشر :	الکتاب انٹرنیشنل
	مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

ملنے کے پتے:

- ۱۔ حکیم صدیق میموریل ٹرسٹ، جوڈھپور، راجستھان
- ۲۔ مکتبہ ترجمان ۴۱۱۶ اردو بازار، دہلی
- ۳۔ مکتبہ مسلم بربر شاہ، سرینگر، کشمیر
- ۴۔ دارالمعارف محمد علی بلڈنگ، ممبئی
- ۵۔ مکتبہ معاذ منڈی میر عالم پتھرگٹی، حیدرآباد

فہرست

6	سہیل انجم	پیش لفظ
10	ابن احمد نقوی	حکایت پندار و پشیمانی
24		باب اول: لبراہن کمیشن رپورٹ کے اہم حصوں کی تلخیص
25		☆ بابر ی مسجد کا انہدام منظم سازش کا نتیجہ
34		☆ مسلم قیادت کی ناکامی
41		☆ اتر پردیش میں صدر راج؟
51		☆ سفارشات
57		☆ قصور وار ٹھہرائے گئے افراد کی فہرست
60		باب دوم: لبراہن کمیشن رپورٹ کا جائزہ
62	کل دیپ نیر	☆ رپورٹ نے سیاسی نظام کو بے نقاب کر دیا
66	سید شہاب الدین	☆ نیم صداقت پر مبنی ایک دستاویز
75	پی، سی، الیگزینڈر	☆ سب سے کمزور پہلو
79	محفوظ الرحمن	☆ جسٹس لبراہن کا عذر لنگ
84	موہن چراغی	☆ 6 دسمبر - تاریخ کا سیاہ ترین دن
94	فرحت احساس	☆ بابر ی مسجد تحریک اور مسلم قیادت
101	مسلم پرسنل لا بورڈ	☆ 68 ملزموں کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے
105	ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس	☆ لبراہن کمیشن رپورٹ، ایک جائزہ

- ☆ لبر اہن رپورٹ کی افادیت، ایک مطالعہ 114 مشتاق احمد ایڈوکیٹ
- ☆ کارروائی کی سفارش کیوں نہیں 125 ہرش مندر
- ☆ رپورٹ کی کچھ باتیں صحیح کچھ غلط 128 محمد عبدالرحیم قریشی
- ☆ سنگھ پر یوار کب تک جھوٹ بولے گا 135 ویر سنگھوی
- ☆ اے۔ ٹی۔ آر ایک مایوس کن دستاویز 139 ڈاکٹر منظور عالم
- ☆ جمہوریت، قیادت اور ہندوفاشزم کے منہ پر طمانچہ 142 ڈاکٹر سید عبدالباری
- ☆ واچپٹی بھی اتنے ہی ذمے دار جتنے کہ نرسمہاراؤ 151 موہن سنگھ
- ☆ تاریخ کے اوراق سے کچھ تلخ حقائق 154 سید منصور آغا
- ☆ سترہ برسوں کی ضرورت نہیں تھی 165 ایم جے۔ اکبر
- ☆ رپورٹ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا 167 معصوم مراد آبادی
- ☆ تاخیر سے اہمیت ختم نہیں ہو جاتی 173 ظفر یاب جیلانی
- ☆ کیا حکومت کوئی کارروائی کرے گی 177 ظفر آغا
- ☆ قاتلوں کو کب سزا ملے گی 182 سید علی
- ☆ فوتیدار سے جرح کیوں نہیں کی گئی 186 پنکج دوہرا
- ☆ کیا لبر اہن کمیشن کی جانچ کے لئے..... 188 مانس چکرورتی
- باب سوم: انکوائری کمیشنوں کا قیام: کتنا مفید کتنا لا حاصل؟** 191
- ☆ انکوائری کمیشنوں اور بعض رپورٹوں کا جائزہ 192 سہیل انجم
- ☆ انکوائری کمیشن: اقسام اور صورتحال 204 رام پنیانی
- ☆ کمیشن سچائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں 209 پنکج چتر ویدی
- ☆ رپورٹ مسترد کرنے کا اختیار حکومت کو نہ ہو 213 یوسف حاتم مچھالہ
- ☆ کمیشنوں نے مجرموں کو بے نقاب کیا ہے 217 شبنم ہاشمی

- ☆ انگواڑی کمیشن ایک فریب
220 وصی احمد نعمانی ایڈوکیٹ
- باب چہارم: انہدام کی دلخراش کہانی: عینی شاہدوں کی زبانی**
227
- ☆ انہدام کا جھوٹ اور سچ
228 پر بھاش جوشی
- ☆ آنکھوں دیکھا چھ دمبہر
233 پیوش ترپاشی
- ☆ مارک ٹلی کا سفر نامہ اجودھیا
239 مارک ٹلی
- ☆ اجودھیا میں تین دن
255 ایس۔ پی سنگھ
- ☆ صحافیوں نے چھ دمبہر کو کیا دیکھا
264
- ☆ سٹیزنس ٹریبونل میں گواہیوں کی تلخیص
269
- ☆ رام کی جے بولنے والوں نے.....
277 پر بھاش جوشی
- ☆ انہدام کے بعد وزیر داخلہ کی دروغ بیانی
281 ہریندر بویجہ
- باب پنجم: تاریخ کی گواہی**
284
- ☆ بابری مسجد کا قضیہ تاریخ کے آئینے میں
285
- ☆ سلگتے شہر کا سفر نامہ اور چند حقائق
295 مکلیشور
- ☆ تاریخی دستاویزات میں رام مندر کا ثبوت نہیں
312 دو جیندر نرائن جھا
- ☆ آرکیالوجی آف بابری مسجد اجودھیا
318 سریندر کور اور شیر سنگھ
- ☆ رام مندر کی موجودگی کا دعوا بے معنی
328 پروفیسر رام سرن شرما

پیش لفظ

سہیل انجم

بابری مسجد کا انہدام آزاد ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا المناک اور ہیجان انگیز واقعہ ہے، جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی روح تک کو چھلنی کر دیا ہے۔ اس دہشت انگیز اور فتنہ ساز عمل اور اس کے رد عمل کے حوالے سے فرقہ وارانہ تصادمات اور قتل و خوں ریزی کی ایک طویل داستان بھی ہے جو مہذب سماج کی پیشانی پر ایک بدنما اور ناقابل تحلیل داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی محرومیوں اور نامرادیوں کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے جو باعث کرب ہے۔ مسلمانوں کے دل و جسم پر لگنے والے زخموں کے منہ تو بھرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بھرتے رہیں گے، مسلمان ہر ذلت اور ہر رسوائی کو فراموش کرتے رہے ہیں اور کرتے بھی رہیں گے، لیکن بابری مسجد انہدام کی شکل میں انہیں جس زخم کا تحفہ ملا ہے وہ نہ تو مندمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے فراموش کیا جاسکتا ہے۔ جب بھی دسمبر کی تاریخ آتی ہے یہ زخم ناسور بن جاتا ہے اور اس سے اٹھنے والی ٹیس دوچند ہو جاتی ہے۔

بابری مسجد کا موضوع وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ یہ ایسا کر بناک باب ہے جو کبھی بھی مکمل نہیں ہو گا۔ انہدام کے بعد اس وقت کی حکومت نے ان خوں چکاں حقائق کا پتہ لگانے اور مجرموں کی نشاندہی کرنے کے لئے، جن کا علم بچے بچے

کو تھا اور جو بے حد بھیا تک اور ناقابل تردید تھے، جسٹس من موہن لبراہن کی سربراہی میں ایک جانچ کمیشن قائم کیا تھا۔ اسے تین ماہ کا وقت دیا گیا تھا جو بہت زیادہ تھا۔ پھر بھی لبراہن کمیشن نے معلوم حقائق کو قلم بند کرنے اور عالمی سطح پر شناخت شدہ مجرموں کی فہرست سازی میں سترہ سال لگا دئے۔ بہر حال کمیشن کی رپورٹ نہ صرف حکومت کے حوالے کی جا چکی ہے بلکہ وہ پارلیمنٹ میں بھی پیش ہو چکی ہے اور اس پر حکومت نے ایک مجہول اور لولی لنگڑی کارروائی رپورٹ بھی پیش کر دی ہے۔ اگر ہم غور کریں تو یہ پورا عمل مسلمانوں کے ساتھ ایک مذاق اور بھیا تک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح رپورٹ میں کوئی نئی بات نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بے دلی سے تیار کی گئی ہے، اسی طرح حکومت کی کارروائی رپورٹ بھی ہے جو محض خانہ پری ہے۔

لبراہن رپورٹ پر تبصرہ آرائی کا سلسلہ جاری ہے اور اس میں انصاف پسند برادران وطن اور دیانت دار غیر مسلم صحافی اور دانشور پیش پیش ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ انھوں نے بابری مسجد انہدام کے خلاف اپنے قلم کو تیغ بے نیام کر لیا تھا۔ رپورٹ پر الگ الگ رائیں ظاہر کی جا رہی ہیں اور اظہار رائے کرنے والوں کی اکثریت اسے ایک ناکارہ رپورٹ بتا رہی ہے۔ تاہم اس سے انکار کرنے والے بہت کم ہیں کہ اگرچہ اس رپورٹ کی روشنی میں کسی کارروائی کا امکان ناممکن نظر آتا، پھر بھی اس کی دستاویزی حیثیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

میں نے اس خیال کے تحت کہ چونکہ اب بابری مسجد قضیہ کے تعلق سے ایک اہم باب بند ہو گیا ہے، مناسب سمجھا کہ لبراہن رپورٹ کے بعض اہم اور قابل ذکر حصوں سے اردو داں طبقہ کو روشناس کراؤں، اس کے اہم حصوں کی تلخیص کی ہے۔ اس کتاب ”لبراہن کمیشن رپورٹ اور بابری مسجد“ میں وہ تلخیص موجود

ہے۔ رپورٹ پر جو رد عمل سامنے آیا ہے، میں نے اس کا بھی انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسی باتوں کی تکرار نہ ہو، تاہم کچھ ناگزیر تکراروں سے بچنا مشکل تھا۔ مسلم و غیر مسلم صحافیوں، تجزیہ نگاروں اور دانشوروں کے مضامین اس باب میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اس تنازعہ سے متعلق دیگر حقائق بھی جمع کر دئے ہیں۔ جیسے کہ بابر مسجد انہدام کے دلخراش واقعے پر عینی شاہدوں نے کیا کچھ کہا ہے اور چھ دسمبر کو اجودھیا میں صحافیوں نے کیا دیکھا اور ان پر کیا گزری۔ انہدام کے بعد دہلی میں انسانی حقوق کی بعض تنظیموں نے حقائق کو قلم بند کرنے اور انھیں ایک دستاویزی شکل میں مرتب کرنے کے لئے ایک سٹیزنس ٹریبونل کا انعقاد کیا تھا۔ اس کی رپورٹ کے کچھ اہم حصوں کی تلخیص بھی کتاب میں شامل ہے۔ بی بی سی کے سابق نمائندے مارک ٹلی نے چھ دسمبر کو کیا دیکھا تھا، ان پر کیا گزری تھی اور انہدام کے کئی سال کے بعد جب انھوں نے دوبارہ اجودھیا کا دورہ کیا تو کیا دیکھا، اس پر ان کا سفر نامہ اجودھیا روشنی ڈالتا ہے۔ جری، بے باک اور انصاف پسند صحافی پر بھاش جوشی، نڈرا اور حق گو ہندی ادیب اور صحافی مکلیشور اور ڈی این جھا اور رام سرن شرما جیسے مستند مورخوں کے مضامین، جو سنگھ پر یوار کے فسطائی عزائم کو بے نقاب کرتے اور رام مندر کے دعوے کو باطل قرار دیتے ہیں، قارئین کے مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انکوائری کمیشنوں کی افادیت وغیرہ افادیت کے تعلق سے بھی بھرپور مواد یکجا کیا گیا ہے۔

میں ان کرم فرماؤں کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں معاونت کی۔ بالخصوص روزنامہ قومی آواز کے سابق مدیر جناب موہن چراغی، جناب فرحت احساس، جناب ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس، جناب مشتاق احمد ایڈوکیٹ اور جناب ڈاکٹر سید عبدالباری کا میں ممنون ہوں کہ انھوں نے اس

خاکسار کی گزارش پر اپنے خیالات کو مضمون کی شکل میں قلمبند کیا۔ میں بزرگ صحافی جناب محفوظ الرحمن کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر اپنے مشوروں سے نوازا۔ جناب عارف اقبال کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے بھی مواد کی فراہمی میں گراں قدر تعاون دیا۔ اگر میں جناب ابن احمد نقوی کے تئیں اظہار تشکر نہ کروں تو نہایت نا انصافی ہوگی کہ انھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود بیش قیمت مقدمہ تحریر فرمایا۔

بہر حال، کتاب ”لبراہن کمیشن رپورٹ اور بابرہ مسجد“ آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو نہایت کم وقت میں تیار کی گئی ہے۔ اسے بابرہ مسجد کے موضوع پر ایک دستاویزی رخ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔



حکایت پندار و پشیمانی

ابن احمد نقوی

بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ اس قدر سنگین و المناک تھا کہ اس وقت کے صدر جمہوریہ نے اسے گاندھی جی کی شہادت کے بعد کا سب سے بڑا قومی المیہ قرار دیا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ 6 دسمبر 1992 کو جو کچھ ہوا اس کے اضطراب کی لہریں پوری دنیا میں پہنچیں اور سیکولر جمہوری ہندوستان کو عالمی برادری میں خفت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تو بیرونی دنیا کی بات تھی اندرونی طور پر ملک کی پہلی اور دوسری اکثریت کے درمیان مغائرت کی جو خلیج صدیوں سے ایک زیریں لہر کے طور پر جاری تھی وہ ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے اثرات نسلوں جاری رہنے کا شدید اندیشہ ہے۔

بابری مسجد کی شہادت کے پیچھے ایک نہیں کئی عوامل کار فرما تھے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ یہ ایک مذہبی تنازعہ نہیں سیاسی حکمت عملی تھی اس کا مقصد فرقہ وارانہ منافرت اور کشیدگی کو انتہا تک پہنچا کر ایسی فضا ہموار کرنا تھا جس سے عام انتخابات میں سنگھ پر یوار کو لامحدود فائدہ حاصل ہو اور وہ مرکز میں اقتدار پر قابض ہو جائے۔ شاہ بانو کیس میں مسلمانوں کا غیر معتدل جذباتی رویہ، ایک ہمدرد لیکن سیاسی طور پر دور اندیشی سے بڑی حد تک محروم، ناتجربہ کار وزیراعظم پر دباؤ ڈال کر سپریم کورٹ کے فیصلہ کو پارلیمانی کارروائی کے ذریعہ کالعدم کروانا اور یوں عدلیہ اور اس کے درمیان صف آرائی پیدا کر کے اکثریت کے ہر حلقہ میں مسلمانوں کے خلاف بدظنی

کی فضا پیدا کرنا اس سے سنگھ پر یوار نے پورا فائدہ اٹھایا، منڈل کمیشن کی سفارشات بروئے عمل لانے کے فیصلہ سے دلت اور سورن ہندوؤں کے درمیان جو کشمکش اور کشیدگی پیدا ہوئی اس تصادم کو روکنے اور عوامی توجہ اس مسئلہ سے ہٹانے کے لئے اڈوانی نے سوم ناتھ سے اجودھیا تک رتھ یا ترا شروع کی۔ یہ گویا بابرئ مسجد کے انہدام کا اولین قدم تھا۔

ادھر شاہ بانو کیس میں پارلیمانی مداخلت کے بعد جو سیاسی رد عمل ہوا اس نے راجیو گاندھی کو سراسیمہ کر دیا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے اتنے سنگین اور دور رس اثرات ہوں گے اور یہ فرقہ وارانہ رخ اختیار کر لے گا جس سے خود کانگریس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ارون نہرو اور ویر بہادر سنگھ کی تحریک پر بابرئ مسجد کا تالہ کھلوا دیا گیا تاکہ مشتعل اکثریت کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج پانڈے کے فیصلہ کے بعد ملک میں ایک جشن کا سماحول پیدا ہو گیا یہ سنگھ پر یوار کی پہلی بڑی فتح تھی اس سلسلے میں۔ کیونکہ مقامی عدلیہ کو استعمال کیا گیا تھا اس لئے حکومت کے پاس عذر تھا کہ یہ اس کا نہیں عدالت کا فیصلہ ہے۔ لبرائن کمیشن کی رپورٹ پر بحث کے دوران سی پی ایم کے ممبر باسودیو آچاریہ نے انکشاف کیا کہ بابرئ مسجد کا تالہ کھولنے کے عدالتی فیصلہ کے بعد انہوں نے وزیراعظم کو مشورہ دیا تھا کہ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی جائے لیکن ان کی بات ان سنی کر دی گئی۔ ظاہر ہے راجیو گاندھی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہائی کورٹ سے اس فیصلہ کے خلاف حکم امتناعی حاصل کر لیا گیا تو اس کے نتیجے میں جو اشتعال پھیلے گا حکومت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور چونکہ اس فیصلہ سے راجیو گاندھی ایک بڑے طبقے میں ”ہیرو“ بن گئے تھے اس لئے وہ اس کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اس لئے شیلا نیاں بھی کرا دیا گیا۔ ہر آدمی کا ایک ووٹ کی بنیاد پر قائم جمہوریت میں عوامی مقبولیت ایسے

ہی جذباتی اقدامات سے حاصل ہوتی ہے۔

6 دسمبر 1992 کو جو کچھ ہوا وہ مکمل طور سے منصوبہ بند تھا۔ لبرائن رپورٹ میں بھی اس کی تائید کی گئی ہے کہ اتنا بڑا حادثہ اچانک اور غیر منصوبہ بند طور پر نہیں ہو سکتا تھا کارسیوک پھاؤڑے، رسیاں، کدال وغیرہ لے کر آئے تھے۔ دو ڈھائی لاکھ کا ہجوم تھا اس ہجوم کو مشتعل کرنے کے لئے سنگھ کے لیڈر تقریریں کر رہے تھے اوما بھارتی نعرے لگا رہی تھیں ایک دھکا اور دو بابر مسجد توڑ دو۔ اٹلی جنس کی جو رپورٹیں 6 دسمبر سے پہلے حکومت کو بھیجی گئیں ان میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ مسجد کے انہدام کا شدید خطرہ ہے۔ مرکز میں کانگریسی سرکار تھی جس کے سربراہ نرسمہاراؤ تھے جنہیں خود ان کی پارٹی کے ممبران ان کی بے عملی کے سبب ”دھکا مار پردھان منتری“ کہتے تھے۔ یوپی کی بی جے پی سرکار کلیان سنگھ کی سربراہی میں مسجد کو گرانے میں مکمل تعاون دے رہی تھی سپریم کورٹ میں حلف نامہ داخل کرنے کے باوجود کلیان سنگھ اس تخریبی منصوبہ میں سرگرمی کے ساتھ شریک تھے۔ جسٹس لبرائن کا یہ کہنا کہ نرسمہاراؤ مسجد کو بچانے کے لئے بہت کچھ نہیں کر سکتے تھے ایک عذر لنگ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اقدام کا جذبہ یا منصوبہ ہی نہیں تھا ورنہ وزیر اعظم اور مرکزی سرکار کوئی اقدام کرنا چاہے تو اس کے اختیارات وسائل اور موثر حکمت عملی سے ہر فتنہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اب وزیر داخلہ چدمبزم کا یہ عذر پیش کرنا کہ نرسمہاراؤ نے کلیان سنگھ پر اعتبار کر کے غلطی کی اور کانگریس کو اس غلطی کی بھاری قیمت چکانی پڑی، نرسمہاراؤ کے بچاؤ کی ایک کمزور دلیل ہے۔

بابری مسجد کا انہدام آزاد ہندوستان کی تاریخ میں عبادت گاہ کی مساماری کا دوسرا دلخراش واقعہ تھا اس سے پہلے 1984 میں اندرا گاندھی کے حکم پر سکھوں کی مقدس ترین عبادت گاہ امرتسر میں سورن مندر (گولڈن ٹیمپل) پر فوجی یلغار تھی۔ اس سلسلے میں بھی سرکاری طور پر یہی جواز پیش کیا گیا تھا کہ بھنڈراں والے کی تخریبی

کاروائیوں کے خلاف یہ اقدام کیا گیا۔ حالانکہ جیسا کہ سابق وزیراعظم چندر شیکھر نے کہا تھا کہ بھنڈراں والے کو سورن مندر سے نکالنے کے لئے فوجی اقدام کے علاوہ دوسرے طریقے بھی استعمال کئے جاسکتے تھے۔ اس اقدام سے بھی ملک اور قوم کو رسوائی اور بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان ایسی خلیج پیدا ہوئی کہ ان میں صدیوں سے جو گہرا سماجی رشتہ تھا اس کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔ اندرا گاندھی کو اس فیصلے کی قیمت اپنے خون سے چکانی پڑی۔ پھر 1984ء کے سکھ دشمن فسادات ہوئے اس گھلو گھارا (قتل عام) میں خود دلی میں ہزاروں سکھ مارے گئے اس میں حکومت کی چشم پوشی آشکارا تھی۔

یہ ایک اذیت ناک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ملک میں اکثریت کی بے لگام حکمرانی کا ذہن پیدا کر دیا گیا۔ سب کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی کہ اکثریت کو اقلیتوں کو سزا دینے کا حق حاصل ہے۔ اسی ذہنیت نے فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ انتظامیہ نے مشتعل ہجوم کا تشدد (Mok Violence) کی تھیوری وضع کر کے مجرموں کے خلاف کوئی تعزیری یا تادیبی کارروائی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فسادات کے بعد عینی شہادتوں کی بنیاد پر اگر فساد یوں کو پکڑا بھی گیا تو عدالت میں ”معتبر ثبوت“ نہ ہونے کی بنیاد پر وہ سب بری ہو گئے۔ اس سے جرم اور سفاکی کو اور بھی فروغ ہوا پھر سیاست نے اس سفاکی کو اپنے اقتدار کا آلہ کار بنایا۔ اقلیت کے کسی فرد یا طائفہ کے کسی غلط قدم کی اس کے پورے فرقہ کو وحشیانہ سزا دینے کا رواج عام ہو گیا۔ اندرا گاندھی کو ان کے سکھ محافظوں نے قتل کیا۔ اکثریت نے قانون ہاتھ میں لے کر پورے سکھ فرقہ کو سزا دی۔ بابر مسجد کے سلسلے میں بھی یہی ہوا مسجد کے وجود کا انکار کر کے اسے مندر قرار دیا گیا سرکاری طور پر اسے متنازعہ ڈھانچہ کہا گیا تاکہ مسجد کا نام نہ آ سکے۔ یہ تنازعہ ملک کی تقسیم کے اثرات کے تحت شروع ہوا۔ اس دور میں جب تقسیم کا زخم تازہ تھا رات کے

اندھیرے میں بابرؒی مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئیں وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے انہیں ہٹانے کا حکم دیا اس وقت یوپی میں پنڈت گووند ولہ پنت وزیر اعلیٰ تھے انہوں نے اس سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو اس بارے میں تحمل سے کام لینے اور عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ مسئلہ کا حل تلاش کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تھا بھی نہیں۔ پھر جب بابرؒی مسجد کو رام مندر قرار دے کر ملک میں جذباتی ہیجان پیدا کیا گیا تو مسلمانوں نے اپنی افتاد طبع کے مطابق وہی جذباتی راہ عمل اختیار کی جس کے وہ آزادی سے قبل مسلم لیگ کی بے بصیرت سیاست کے تحت عادی ہو چکے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ جس طرح شاہ بانو کیس میں وہ حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنی بات منوا چکے ہیں اسی طرح جذباتی اشتعال ہیجان اور شعلہ گفتاری سے وہ حکومت اور سنگھ پر یوار کو بھی جھکا سکتے ہیں۔ اس دور میں نام نہاد مسلم قیادت کا مزاج دیکھئے تو اشتعال صف آرائی اور چیلنج کے سوا کوئی سنجیدہ آواز بمشکل سنائی دیتی تھی جو آواز اٹھتی بھی تھی وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتی تھی۔ اشتعال کا یہ عالم کہ ایک پیر جی نے اعلان کر دیا کہ اگر بابرؒی مسجد گرائی گئی تو ملک کا کوئی مندر سلامت نہیں رہے گا۔ یہ چیلنج دے کر پیر و مرشد تو اپنی خانقاہ کے سجادہ پر سو گئے لیکن سنگھ پر یوار میں اس کا جو اثر ہوا وہ آگ پر پٹرول ڈالنے سے کم نہیں تھا بد قسمتی سے مسلمانوں نے کبھی مولانا آزاد کی دیہ وری کی قدر نہیں کی اقبال نے کہا تھا ے

قوتِ فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے

جب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

واقعی تقسیم کے بعد مسلمانوں پر جو زوال آیا اس نے ان کی قوت فکر و عمل کو فنا

کر دیا تھا انہوں نے بدلے بدلے حالات کا ادراک کئے بغیر گفتار کے غازی بن کر اس آتشگیر اور دھماکہ خیز صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اپنی قیادت کی

دکانیں سجانے اور اقتدار کی روٹیاں سینکنے کے لئے انہوں نے اس مسئلہ کو گرم تو بنالیا۔ جسٹس لبراہن نے اپنی رپورٹ میں مسلم تنظیموں کے کردار پر جو تنقید کی ہے وہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ دراصل رول تو مسلمانوں کو یقین نہیں تھا کہ بابر مسجد واقعی شہید کر دی جائے گی وہ اسے سنگھ پر یوار کی گیدڑ بھکیاں ہی سمجھتے رہے اور فریق مخالف کی آواز کو دبانے کے لئے اس سے بھی زیادہ پر شور انداز میں جواب دینے کو ہی واحد راستہ سمجھنے لگے۔ حالانکہ اس وقت یہ معرکہ آرائی غالب اور مغلوب کے درمیان تھی۔ سنگھ پر یوار مسلمانوں کو ٹھوکر مار کر انہیں ان کی اوقات بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ مغلیہ دور میں نہیں جی رہے ہیں اور نہ یہ انگریزی اقتدار کا زمانہ ہے جب بقول شوکت تھانوی انگریز ہے سرکار تو اولاد ہے مومن۔ کا ماحول ہو۔ اب وہ اس قوم کے ماتحت جی رہے ہیں جو اس احساس کے ساتھ بیدار ہوئی ہے کہ اسے ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہے اور مسلمانوں نے صدیوں تک اسے غلام بنائے رکھا۔ تین ہزار سے زیادہ مندر توڑے۔ محمود غزنوی اور اورنگ زیب جیسے حکمران مسلط کئے۔ آزادی کے بعد جو سب سے پہلا کام ہوا وہ یہ تھا کہ سردار پٹیل کی سرپرستی میں سومنات مندر کی تعمیر نو کی گئی اور صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اس کا افتتاح کرایا گیا۔ گویا مندر ایک سرکاری تقریب کے ذریعہ بحال کیا گیا۔ مسلمانوں پر لازم تھا کہ ان باتوں پر غور کرتے اور حالات کا رخ دیکھتے ہوئے صف آرائی کی راہ اختیار نہ کرتے۔ لیکن جب جذباتی اشتعال کو ہی اپنی شناخت بنالیا جائے تو انجام وہی ہونا تھا جو 6 دسمبر کو سامنے آیا۔ اکثریت نے اپنے مزاج کے عین مطابق پہلے بابر مسجد کو منہدم کیا اور پھر مسلمانوں کا قتل عام بھی کیا وہی اقلیت کو سزا دینے کا بے دریغ حق استعمال کیا گیا سکھوں اور مسلمانوں کو سزا دینے کے بعد اڑیسہ میں عیسائیوں کے خلاف بھی یہی حربہ استعمال کیا گیا۔ وہاں آرائیں ایس سے وابستہ ایک سادھو کے قتل کا الزام لگا کر عیسائیوں کے خلاف بزن بولا گیا

ایسی خوں ریزی ہوئی کہ فرانس کے صدر سرکوزی اور ویٹی کن میں خود پوپ نے اس پر اضطراب کا برملا اظہار کیا۔ اکثریت کی یہ ذہنیت آج بھی برقرار ہے اور آئندہ بھی اس سفاک رد عمل کے ظہور کا اندیشہ کم نہیں ہوا ہے۔ بابرؒی مسجد کی شہادت کے مجرمین بھی وہی ہیں جن کے دامن سے بابائے قوم گاندھی جی کے خون کے دھبے آج تک دھلے نہیں ہیں شاید اسی لئے صدر جمہوریہ نے گاندھی جی کے قتل اور بابرؒی مسجد کے قتل کو ایک جیسا ہی المیہ قرار دیا تھا۔ بہر کیف بابرؒی مسجد کے انہدام کے بعد ملک کی سیاسی صورت حال میں بھی انقلابی تبدیلی آئی سنگھ پر یوار جس کی پارلیمنٹ میں حاضری صرف دو ممبران پر مشتمل ہوتی تھی وہ بابرؒی مسجد کے ملبہ پر چڑھ کر دلی کے تحت طاؤس پر براجمان ہو گیا سیکولر جمہوریہ ہند میں غیر سیکولر (فرقہ پرست) عناصر کو اقتدار حاصل ہوا اور یکا یک سب کچھ بدل گیا۔ اس وقت بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی نہرو، سہاش اور آزاد کا ہندوستان بابرؒی مسجد کے انہدام سے اٹھے غبار میں گم ہو گیا اور ساور کر اور گول والکر کا ہندو راشٹر سامنے آ گیا۔ اڈوانی اس غبار سے سب سے بڑے رام بھگت اور ہیرو بن کر ابھرے اور سارے سیوم سیوک وزیر بن گئے۔ اکثریت کے ہاتھوں اقلیت کو عمومی سزا دینے کا خوفناک عمل پھر دوہرایا گیا۔ بابرؒی مسجد کے پس منظر میں گودھرا میں کارسیوکوں کو ریل کے ڈبہ میں جلا دیئے جانے کا افسانہ میڈیا نے تراشا اور گجرات کی مودی سرکار نے ”ہندوؤں کو اپنا غصہ نکال لینے کا غیر تحریری فرمان جاری کر کے گجرات میں مسلمان کی نسل کشی کی سرپرستی کی اور پولیس نیز انتظامیہ کو اس معاملے میں عضو معطل بنا دیا گیا۔ آج بھی گجرات کے مسلمان اپنے گھروں کو واپس جانے کا حوصلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔

عبرت کی بات یہ ہے کہ سنگھ پر یوار جس طوفانی انداز میں اقتدار میں آیا تھا اسی تیزی سے وہ اقتدار کی سیڑھی سے پھسل کر گر گیا۔ 2004 اور 2009 کے عام انتخابات نے اڈوانی اور بال ٹھا کرے کو دکھا دیا کہ ان کے اقتدار کا وہ پودا جسے وہ

ایک تناور درخت سمجھ رہے تھے اس کی جڑیں کس قدر کمزور تھیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اڈوانی کو خود ان کی پارٹی نے ہی اوندھے منہ گرا دیا ہے۔ یہ بوڑھا سیوم سیوک بھارت کا پردھان منتری بننے کے سنہرے خواب دیکھ رہا تھا اب عملاً سیاسی زوال کا شکار ہو کر پس منظر میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ نریندر مودی جسے مابعد گودھرا قتل عام سنگھ پر یوار کا چھوٹا سردار قرار دے کر اڈوانی سے بھی پہلے ملک کا ویرا عظیم بننے کی بشارت دی گئی تھی 2009 کی انتخابی ہزیمت کے بعد پھر گجرات کے خول میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ خود آ رالیں الیں نے بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ کسی نے بی جے پی کی نئی قیادت کے لئے اس کا نام نہیں لیا۔ اب نہ ہندو ووٹر ”مندروہیں بنائیں گے“ کے نعرہ پر دھیان دیتے ہیں نہ خود بی جے پی کا ہر قائد اسے منہ سمجھتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ چوہان نے جو آ رالیں الیں اور بی جے پی کے ہی پیروردہ ہیں اعلانیہ کہا کہ رام مندر ان کا ایجنڈا نہیں ہے۔ ترقیاتی کام ہی ان کا اصلی ایجنڈا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ صرف 2 دہائی سے کم عرصہ میں ہی صورت حال میں کیسی انقلابی تبدیلی آئی ہے۔

مسلمانوں پر باری مسجد کے انہدام کا جو اثر ہوا وہ تو ایک فطری بات تھی جذباتی صدمہ نے انہیں بے حال کر دیا۔ پھر وہ سنبھلے اور ایک نئے شعور و ادراک کے ساتھ ان پر ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ مسلمانوں کی نئی نسل نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ مندر مسجد کے جھگڑے گھٹیا سیاست کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ملت کا اصل مسئلہ ایک روشن اور محفوظ مستقبل کی تعمیر ہے۔ جس طرح سومات مندروں توڑے جانے کے بعد ہندو فنا نہیں ہو گئے اسی طرح باری مسجد کے انہدام سے بھی مسلمان فنا نہیں ہوں گے۔ عبادت گاہوں کی تباہی ہمیشہ غالب اور مغلوب کے درمیان کشمکش کا باعث بنی ہے یہ تاریخی حقیقت ہے۔ ان جذباتی صدموں سے کچھ عرصہ تک ضرور احساس کے زخم تڑپاتے ہیں پھر آہستہ آہستہ ہرزخم مندمل ہو جاتا ہے مسلمانوں کی نئی

نسل اس مسئلہ پر جذباتی ہیجان کا شکار نہیں ہے یہ ایک مثبت رجحان ہے۔ ہاں بابری مسجد کی بربادی کے بعد نئی نسل تیزی سے دین کی طرف مراجعت کر رہی ہے نوجوانوں میں اپنے مذہب کو سمجھنے اور دینی شعائر کی پابندی کا جو روح پرور جذبہ پیدا ہوا ہے اسے بابری مسجد کے نقصان کی تلافی کہہ سکتے ہیں۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بابری مسجد کے انہدام سے اکثریت کے جارحانہ رخ کا جو بھیانک پہلو سامنے آیا اسی کے ساتھ عام ہندو ذہن کی باضمیری رواداری اور احساس پشیمانی کے ایسے منظر بھی سامنے آئے جس نے انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا۔ خشونت سنگھ نے لکھا تھا کہ 6 دسمبر کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہندوؤں میں اس قد پشیمانی کا غلبہ تھا کہ اس رات بہت سے ہندوؤں کے گھروں میں چولہا نہیں جلا۔ اتر پردیش کے مقتدر کانگریسی لیڈر پنڈت کملاپتی تریپاٹھی جو بڑے قدامت پسند ہندو تھے کہا کرتے تھے کہ بابری مسجد گرانے کے لئے جو پہلا پھاؤڑا چلے گا وہ پہلے میرے سر پر گرے گا۔ افسوس کہ اس سانحہ سے قبل ہی پنڈت جی دنیا چھوڑ چکے تھے۔

اکٹھے برہمچاری جی نے بابری مسجد کے تنازعہ میں جس بیباکی اور حق گوئی کا مظاہرہ کیا اسے کون بھلا سکتا ہے۔ اس تنازعہ میں بہت سے ہندوؤں کا کہنا تھا کہ ہم رام مندر کے نام پر یہ جھگڑا کھڑا کر رہے ہیں جبکہ جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے رام چندر جی نے اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں راج پاٹ چھوڑ کر بن باس لے لیا تھا کیا ہم اسی جذبہ کے تحت اپنے چھوٹے بھائی (مسلمانوں) کے حق میں اس تنازعہ سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ غرض ایسی رواداری کے دل گداز مظاہر اس دور میں سامنے آئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہندو سماج سے ہندو تو کی جارحیت کو خارج کر دیا جائے تو یہ سماج بے حد روادار، وسیع القلب اور حق و ست ہے۔ سوامی وویکانند، ہندو مت کی روحانیت اور اسلام کی حرکی روح کے امتزاج سے ملک میں ایک نیا معاشرہ

تشکیل دینے کے متمنی تھے۔ گاندھی جی نے جہاں ہندو سماج سے چھوت چھات کا ختم کرنے کی جدوجہد کی وہیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے بھی سرگرم رہے مسلمانوں سے ہمدردی کی پاداش میں ہی انہیں اپنی جان کی قربانی دینی پڑی۔

مرارجی بھائی ڈیپائی سابق وزیراعظم نے ایک ریڈیو انٹرویو میں بتایا تھا کہ جس دور میں وہ سومنات (مندر) کے ٹرٹی تھے مندر کے کمپلکس میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو ویران پڑی تھی۔ انہوں نے وہاں ایک موزن اور ایک امام کا تقرر کر دیا تاکہ مسجد میں نماز ہوتی رہے۔

بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے کی مہم میں سنگھ پر یوار کی راہ میں سپریم کورٹ سب سے بڑی چٹان ثابت ہوئی ہے۔ آج تک ہندو تو وادی عدالت کے حضور یہ ثابت نہیں کر سکے کہ بابری مسجد کی تعمیر رام مندر کو توڑ کر کی گئی تھی۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے ذریعہ کھدائی، جاپانی ماہرین کے ذریعہ دوبارہ کھدائی کسی کو بھی کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکا جو سنگھ کے دعویٰ کی تائید کر سکے۔ سوامی پر مہس رام مندر بنانے کے بڑے مدعی تھے انہوں نے آخری عمر میں شیلپوجن کرنے کے لئے مرن ورت رکھا۔ واجپئی سرکار ان کے اس قدم سے گھبرا گئی کہ اگر وہ چل بے تو عوامی اشتعال کا مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ شیلپوجن وغیرہ میں سپریم کورٹ کا صورت حال برقرار رکھنے (Status quo) کا حکم حائل تھا لہذا سرکار نے اٹارنی جنرل سولی سہراب جی کے ذریعہ سپریم کورٹ میں عرضی پیش کی کہ بطور استثناء ایک بار شیلپوجن کی اجازت دیدی جائے تاکہ سوامی جی کی جان بچائی جاسکے۔ معاملہ کی سماعت چیف جسٹس بی این کرپال کر رہے تھے۔ سولی سہراب جی کی دلیلوں کے جواب میں جسٹس کرپال نے کہا کہ کل اگر مسلمان عدالت میں استغاثہ کریں کہ ہمیں ایک بار بابری مسجد کے چبوترے پر نماز پڑھنے کی اجازت دیدی جائے تو اس پر سنٹرل گورنمنٹ کا رد عمل کیا ہوگا۔ چیف جسٹس کے اس چبھتی سوال پر اٹارنی جنرل

لا جواب ہو گئے اور سرکار کو خاموش ہو کر ہٹ جانا پڑا اور سوامی جی یہ حسرت لئے ہوئے ہی راہی عدم ہو گئے۔

بابری مسجد کے انہدام کا ایک جواز جو سنگھ پر یوار پیش کرتا ہے یہ ہے کہ یہ سومنات کی تباہی کا بدلہ تھا۔ صلیبی سامراج نے ذہنوں میں یہ زہر گھول دیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں دوسرے مذہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا۔ سنگھ پر یوار نے مسلمانوں کے دور اقتدار میں گرائے گئے مندروں کے اعداد و شمار بھی اکٹھے کر لئے اور سب کو بتایا گیا کہ تین ہزار مندر مسلم حکمرانوں نے گرائے۔ یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ مطلق العنان مسلم حکمرانوں نے کیا کیا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ایک برائی دوسری برائی کے لئے وجہ جواز بن سکتی ہے۔ بابری مسجد توڑ کر سنگھ پر یوار نے وہی جرم کیا جس کا الزام وہ غزنوی اور اورنگ زیب پر لگاتا رہا ہے۔

اسلام نے کبھی عبادت گاہوں کو منہدم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی تلقین کی۔ اگر اللہ ایک گروہ کو دوسرے کے ہاتھوں پسپا نہ کرتا تو خانقاہیں کلیسا یہودیوں کے معبد اور مسجدیں جہاں بکثرت اللہ کا ذکر ہوتا ہے، منہدم کر دئے جاتے۔ دیکھئے یہاں مساجد کی حفاظت سے پہلے یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی بات کہی گئی ہے۔ حالانکہ اس دور میں کلیساؤں اور راہبوں کی خانقاہوں میں شرک کا ارتکاب ہونے لگا تھا پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے انہدام کا نہیں ان کی حفاظت کا عہد کیا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تھے تو اسے حکم دیتے تھے کہ عورتوں بچوں بوڑھوں اور غیر متحارب افراد کو قتل نہ کریں جو لوگ عبادت گاہوں میں معتکف ہیں انہیں پریشان نہ کرنا۔ یعنی کسی مجاہد کو کسی عبادت گاہ

کی بے حرمتی کرنا تو کجا اس میں قدم رکھنے کی بھی ممانعت کر دی گئی تاکہ وہاں موجود عبادت گزاروں کو پریشانی نہ ہو۔ اسی لئے عربوں نے کہیں بھی عبادت گاہوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ شبلی نعمانی نے اپنی گراند تہذیب ”الفاروق“ میں لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو مدائن کے شاہی محل میں مجاہدین پہنچے جمعہ کا دن تھا اس لئے مسلمانوں نے شاہی محل کے گلزار میں نماز جمعہ ادا کی وہاں ہر طرف مجسمے اور مورتیاں نصب تھیں مسلمانوں نے نہ کسی مورتی کو توڑا نہ کسی مجسمے کو اس کی جگہ سے ہٹایا۔ شبلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ہمارے ہندوستانی فضلاء کو اس پر حیرت ہوگی کہ سپہ سالار حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ جو ایک ممتاز صحابی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے اور دربار رسالت کے فیض یافتہ تھے انہوں نے محمود غزنوی اور اورنگ زیب والا رویہ کیوں نہیں اپنایا۔

اب اگر کوئی مسلمان حکمران یا طائفہ کسی عبادت گاہ کی بے حرمتی کرتا ہے یا منہدم کرتا ہے تو اسلام کے سراسر اس کی ذمہ داری ہرگز عائد نہیں ہوتی۔ اسلام کی تعلیم وہ ہے جو قرآن و سنت میں دی گئی ہے۔

بعض لوگ فتح مکہ کے بعد مسجد حرام (کعبہ) سے بتوں کو نکال پھینکنے کو اسلام کی عدم رواداری کے طور پر پیش کرتے ہیں ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ کعبہ کی تعمیر مسجد کے طور پر ہوئی تھی حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اللہ کے نبی تھے۔ انہوں نے جب خانہ تعمیر نہیں کیا تھا اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کے لئے مسجد بنائی تھی۔ اور جب ہم نے ابراہیم کو کعبہ کی جگہ دکھائی اور کہا کہ میرے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام، عبادات کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک کرو۔ مشرکین مکہ نے مسجد بیت الحرام کو بت خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسلام نے اس عبادت گاہ کو اس کی اصل پر بحال کیا اور اللہ کا گھر شرک کی آلودگی سے پاک ہو گیا۔ بابر کی مسجد کی جگہ کبھی مندر تھا بھی

نہیں جو اس کی اصل پر بحال کرنے کا مسئلہ اٹھے۔

اب رہی لبرائین رپورٹ کی بات تو اس میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جو پہلے معلوم نہیں تھی اس کمیشن پر آٹھ کروڑ روپیہ صرف کیا یہ رقم بابر مسجد کی شہادت کے بعد فسادات کے شکار مسلمانوں کی باز آباد کاری پر صرف کی جاسکتی تھی یہ بہتر مصرف ہوتا۔ لبرائین رپورٹ سے پہلے جسٹس سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ زیادہ اہم ہے اس میں بابر مسجد کی شہادت کے بعد 1993 کے آغاز میں ممبئی میں ہونے والے مسلمانوں کے قتل عام کے لئے شیو سینا کو مجرم گردانا گیا ہے۔ آج تک اس رپورٹ پر کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا سارے مجرم اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہیں حکومت ڈرتی ہے کہ اگر شیو سینا کے خلاف کارروائی کی گئی تو مہاراشٹر میں اس کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ یہی سیاسی مفاد پرستی ہماری جمہوریت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

6 دسمبر کی دلخراش داستان کو جناب سہیل انجم نے اپنی مرتب کردہ اس ضخیم کتاب میں ایک تاریخی دستاویز کے طور پر پیش کر دیا ہے معتبر مبصرین کے منتشر مضامین کی شیرازہ بندی کر کے انہوں نے ایک ایسی کتاب تیار کر دی ہے جس سے اس سانحہ کے تمام پہلو سامنے آ جاتے ہیں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس ہجانی اور طوفانی دور میں بھی جبکہ پورا ملک جنون میں مبتلا ہو گیا تھا، اس وقت بھی غیر جذباتی انداز میں سوچنے اور صحیح ڈھنگ سے حالات کا تجزیہ کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ تنگ نظری کی گہری تاریکیوں کے اس ماحول بھی رواداری کے چراغ روشن تھے۔ شرنے کچھ مدت کے لئے ضرور خیر کے جذبہ کو دیا تھا لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ شر کبھی خیر پر غالب نہیں آ سکتا انجام کار غلبہ خیر کے لئے ہی ہے۔

آج شر کا وہ طوفان بڑی حد تک سرد ہو چکا ہے۔ لبرائین کمیشن ہو یا اس پر ہونے والی بحث یا میڈیا کی رائے زنی۔ کثرت رائے کا فیصلہ یہی ہے کہ 6 دسمبر

کا المیہ قومی رسوائی کا آئینہ دار ہے اس سے ہندوستانی قوم، ہندوستانی جمہوریت، ہندوستانی دستور اور ہندوستان کی سیکولر روایات کی بے آبروئی ہوئی۔ جناب سہیل انجم ایک معروف اور معتبر صحافی ہیں ان کا ضمیر بیدار ہے اس لئے وہ اپنے قبیلے کی بد اعمالیوں کی پردہ داری نہیں کرتے پردہ دری بلکہ نشر زنی کرتے ہیں۔ میڈیا کے راز ہائے درون پردہ کی داستان انہوں نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے صحافت اور صحافیوں کے روشن کردار کو اجاگر کیا ہے کہ جذباتی ہیجان میں بھی نہ ان کے قدم ڈگمگائے نہ قلم کج روی کا شکار ہوا۔ سلام ہو ان پاکیزہ کردار صحافیوں پر کہ انی کی پامردی اور حق پرستی نے ملک و قوم اور صحافت کی آبرورکھ لی۔

جناب سہیل انجم کی یہ کاوش ایک کارنامہ ہے جس کے لئے وہ ہم سب کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔



باب اول

لبر اہن کمیشن رپورٹ کے اہم حصوں کی تلخیص

بابری مسجد کا انہدام منظم سازش کا نتیجہ

آر ایس ایس اور اس کے حامیوں نے اجودھیا مہم کے لیے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے بار بار ایک لفظ 'جٹانا' کا استعمال کیا۔ دراصل آر ایس ایس کا اس بات پر زور تھا کہ مثبت سوچ رکھنے والوں کو ناکارہ بنا دیا جائے اور مدلل اور قابل قبول باتوں کو دبا دیا جائے۔ حالانکہ اجودھیا مہم کو عام اور اوسط ہندو کی بھی چاہی یا انچاہی حمایت حاصل نہیں تھی۔ لیکن یہ مہم ایسے لوگوں کو خاموش کرانے میں کامیاب رہی کیونکہ لوگوں کو یہ خوف تھا کہ اگر وہ اسکی مخالفت کریں گے تو انہیں ہندو مخالف یا ملک کا غدار قرار دی۔ دے یا جائے گا۔ آر ایس ایس نے لفظ آندولن کا استعمال کیا لیکن یہ مہم کبھی بھی آندولن نہیں بنی۔

ریلیوں اور یا تراؤں کا مقصد عام جذباتی لوگوں کو اجودھیا میں مندر تعمیر کے مطالبے کا حصہ بنانا تھا۔ جب تک بی جے پی اس کام میں شامل نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ جیسا کہ شہوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس مہم کے لیے جتنے پیسوں کی ضرورت تھی وہ آر ایس ایس کی ذیلی تنظیموں کی تجویزوں سے آئے تھے اور مختلف ناموں پر مختلف بینک کھاتوں سے حاصل ہوئے تھے۔ لاعلم ذرائع کے ساتھ ساتھ بینک اکاؤنٹس سے بھی پیسے دیے گئے۔ آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بی جے پی کے لیڈروں نے بھی وقتاً فوقتاً پیسے دیے۔ اختصار کے ساتھ یہ بتانا کافی ہوگا کہ اربوں روپے اکٹھے کئے گئے اور انہیں 6 دسمبر 1992 کے واقعات کو انجام دینے میں استعمال کیا گیا۔

اتنی بڑی رقم کا استعمال پر سرمایہ حاصل کرنے سے لیکر عمارت گرانے تک کی

تمام کارروائیوں کو چلانا دراصل واضح طور پر ایک منظم منصوبے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ چھان بین سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کارسیوکوں کو جٹانا اور اجودھیا اور فیض آباد میں ان کے قیام کا بندوبست کرنا نہ تو اچانک ہوا اور نہ ہی لوگوں کی مرضی سے۔ یہ پوری طرح منصوبہ بند تھا اور اس کی سازش تیار کی گئی تھی۔ آ ر ایس ایس کے کارکنوں نے جس طرح منظم انداز میں اتنے بڑے پیمانے پر کارسیوکوں کو اجودھیا میں یکجا کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف علامتی کارسیوکا کے لیے نہیں تھا۔ تحریک کے لیڈروں اور سیاسی و سماجی تنظیموں کے ذمے داروں کے اس وعدے میں دم نہیں ہے کہ متنازعہ عمارت کا انہدام کارسیوکوں نے غصے اور جذبات میں آ کر کیا تھا۔ حملے کا طریقہ، مسجد منہدم کرنے والے کارسیوکوں کی تھوڑی تعداد، اور بڑی تعداد میں آئے لوگوں کے لیے جگہ کی کمی، گنبدوں میں گھسنے والے کارسیوکوں کی شناخت پوشیدہ رکھنا، گنبد کے نیچے سے مورتیوں اور کیش کے ڈبوں کو ہٹانا، اور انہیں بعد میں عارضی مندر میں دوبارہ رکھنا، مندر کی تعمیر اور انہدام کے لیے اوزاروں اور سامانوں کو اکٹھا کرنا یہ تمام باتیں واضح طور پر اس نتیجے کی جانب لے جاتی ہیں کہ عمارت گرانے کا کام پوری تیاری اور پیشگی منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا تھا۔ عمارت کے انہدام کے لیے بڑی تعداد میں کارسیوکوں کی شرکت وزیر اعلیٰ جیسے لوگوں سے عام طور پر چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ حکومت نے اعتراف کیا ہے کہ اس کے پاس اطلاعات فراہم کرنے کے کئی ذرائع تھے۔ یہ بات آ ر ایس ایس کے چیف کے، ایس سدرشن سے بھی نہیں چھپائی جاسکتی تھی۔ ان کے سویم سیوکوں کو اس جگہ پر کئے جانے والے ہر کام کی تفصیل بتادی گئی تھی۔ یہ بات ورنے کٹیار اور اشوک سنگھل جیسے لیڈروں سے بھی نہیں چھپائی جاسکتی تھی جو 6 دسمبر 92 سے پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔

تمام ثبوتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ 6 دسمبر کے تمام واقعات جو رام جی کے جنم استھان پر پیش آئے ایک منظم پلاننگ کا نتیجہ تھے۔ کچھ غلط قسم کے لیڈروں نے رام جیسے آدرش وادی مہاتما کے نام پر عوام کے اثر دھام کو ایک بے قابو بھیڑ میں بدل دیا تھا۔ اس بات کے بھی ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ بی جے پی، آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد، شیو سینا اور بجرنگ دل کے کچھ لیڈران پیسے یا طاقت کی لالچ میں اس مہم میں شریک ہوئے۔ یہ لیڈران کسی نظریہ کے پابند نہیں تھے۔ نہ ہی ان کو مذہب سے کوئی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اجودھیا معاملے کو اپنی کامیابی کی شاہراہ سمجھی اور اس پر دوڑ پڑے۔ اس دوڑ میں کتنے لوگ مریں گے اس سے ان کو کوئی مطلب نہیں تھا۔ یہ لیڈران نظریات پسندوں کے ذریعے دی گئی تلوار چلاتے ہوئے جلاد کا کام کر رہے تھے۔

جن لوگوں نے متنازع عمارت گرائی اور سماجی تانے بانے کو توڑ دیا وہ عام لوگ ہی تھے۔ انہیں اینٹ پتھر کی عمارت سے یا جس پڑوسی کے ساتھ وہ اس وقت تک رہ رہے تھے، جب ان کا ضمیر مذہبی جنون اور کٹر پنہنتی سوچ کے شور میں ڈوب گیا تو اس بات سے ان کو کوئی مطلب ہی نہیں رہ گیا۔ اس کام میں جن لوگوں نے شرکت کی، ان کی بقیہ زندگی تک جو افسوس اور پچھتاوا سایے کی طرح ان کا پیچھا کرتا رہے گا، وہی ان کی سزا ہے۔

مینڈیٹ کے ساتھ کھلواڑ:

بابری مسجد / رام جنم مندر کی متنازع عمارت کو دھوکے اور ڈھٹائی کے ساتھ تباہ کیا گیا۔ یہ کارروائی ایک جمہوری انداز میں منتخب حکومت کے لیے مناسب نہیں تھی۔ کسی بھی ریاست کی حکومت اور انتظامیہ عوام کے اعتماد، امنگوں اور خوشیوں کا بھنڈار ہوتی ہے۔ کوئی بھی حکومت صرف ان لوگوں کی نمائندہ نہیں ہوتی جن کے

ووٹوں سے وہ منتخب ہوئی ہو بلکہ ان لوگوں کی بھی نمائندہ ہوتی ہے جو ووٹ نہیں دیتے یا نہیں دے پاتے یا جو اس کے مخالف ہوں یا اس سے مختلف نظریہ کے پابند ہوں۔ جو حکومت اپنے مینڈیٹ کے تئیں مخلص ہوتی ہے اسے کسی بھی کام کے لیے بے ایمانی یا ڈھٹائی کا راستہ اختیار نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن جب کوئی حکومت اپنی خواہش کو چھپانے کے لیے گھٹیا طریقے اپناتی ہے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت کا کام قانون کی رضامندی اور عوام کی توثیق سے محروم ہے۔ بی جے پی کا یہ دعوہ اگر مان لیا جائے کہ وہ عوام کے مینڈیٹ پر عمل کر رہی تھی، تو پھر اسے متنازع عمارت گرانے کے لیے چال بازی کا راستہ کیوں اپنانا پڑا۔

وزیر اعلیٰ اور ان کے کابینی رفقا کو اس کا پورا احساس تھا کہ ان کا یہ کام پوری طرح غیر قانونی ہے اور غیر اخلاقی بھی ہے ورنہ وہ اسے باضابطہ طور پر حکومت کے ایجنڈے میں شامل کرتے۔ کلیان سنگھ، ان کے وزرا اور بعض چندہ افسران نے ایسے حالات پیدا کئے کہ ان کا متنازعہ عمارت کے انہدام کے علاوہ اور کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل سکتا تھا۔ انہوں نے دو فرقوں کے درمیان کی خلیج کو بہت وسیع کر دیا جس سے پورے ملک میں قتل عام ہوا۔ انہوں نے اسٹیٹ کو قانونی، اخلاقی اور آئینی کنٹرول سے آزاد کر دیا اور عملاً اور عمداً ایک عمارت کا انہدام کروا دیا جس کے بعد انار کی پیدا ہو گئی۔

آر ایس ایس کی متوازی حکومت:

آر ایس ایس نے ریاست میں ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی، ایک طرف جہاں وزیر اعلیٰ اور ان کے وزرا کا بہت بڑا قصور ہے کہ انہوں نے ایسے حالات پیدا کئے وہیں دوسری طرف پرم ہنس رام چندر داس، اشوک سنگھل، ونے کٹیار، وشنو ہری ڈالمیا، وام دیو، کے ایس سدرشن، شیشادری، لال جی ٹنڈن، کلرج

مشر اور گووند اچاریہ وغیرہ نے کلیان سنگھ کی قیادت میں ایک وفاق بنا رکھا تھا اور ان کو اس تحریک کے سربراہوں ایل کے اڈوانی، ایم ایم جوشی اور اٹل بہاری واجپئی جیسے لوگوں کی حمایت حاصل رہی ہے۔ کلیان سنگھ حکومت نے مرکزی حکومت اور سپریم کورٹ میں دروغ بیانی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور آئینی جمہوریت کی دفعات سے ان کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے جمہوریت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی مخالفت کی تو انہیں تیزی سے ہٹا دیا گیا اور ان کی طاقت چھین لی گئی۔ پولیس، ضلع مجسٹریسی، مقامی انتظامیہ اور سرکاری مشینری کو لالچی بنادیا گیا اور اس طرح وہ اپنی ذمے داریاں کھو بیٹھے۔ پولیس اور ایڈمنسٹریشن سرعام آرائس ایس کے کاموں کی حمایت کرتے رہے۔ قانون کی طاقت کا استعمال آئین کے وقار کو مجروح کرنے والوں کے خلاف نہیں کیا گیا بلکہ جو لوگ ریاست میں متوازی حکومت چلا رہے تھے، ان کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف اس طاقت کا استعمال کیا گیا۔

آرائس ایس، بی جے پی، شیو سینا اور بجرنگ دل کو ملا دیا جائے تو وہ ایک بھیانک یونٹ بن جاتا ہے جس کے پاس بہت تیز اور چالاک دماغ ہے اور بھیڑ کے ساتھ توڑ پھوڑ کرنے کی عظیم طاقت ہے۔ آرائس ایس، بی جے پی، وشو ہندو پریشد، ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ جیسی مسلسل اپنی شکل بدلتی تنظیموں کے ذریعے اپنے بانیان کے مشتبہ اور مشکوک اصولوں کو نافذ کرنے کے لیے ایک قیادت موجود ہے۔ ان نظریہ سازوں کے لیے اپنا ہدف ہی اہم ہے۔ اور مذہب، علاقہ ریزرویشن اور ذات برادری وغیرہ کے پردے میں سیکولرزم اور تکثیریت پسند سماج کے خلاف چل رہی تحریک میں متنازع عمارت کا انہدام ایک کامیاب جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آرائس ایس، بی جے پی وغیرہ نے سیکولرزم کو ختم کرنے کی خطرناک سازشیں تیار کی ہیں اور انہوں نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ انہوں نے سیکولرزم کی تشریح نو کی ہے اور جو مفہوم پیش کیا ہے وہ اس

کے اصل مفہوم کے یکسر برعکس ہے۔ سیکولرزم کی ان کی تشریح نہ تو کسی کے مفاد میں ہے اور نہ ہی ہمارے آئین میں دیے گئے آدرشوں کے مماثل ہے۔

وفادار افسران کی تقرری:

اتر پردیش حکومت کے حفاظتی انتظامات اصولی اور کاغذی طور پر ہر قسم کے خطرے سے نمٹنے کے اہل تھے۔ لیکن ان انتظامات کو بے اثر کر دیا گیا تھا۔ جان بوجھ کر ایسے انتظامات کئے گئے جو 6 دسمبر کے غیر معمولی حالات کا سامنا کرنے کے اہل نہیں تھے۔ دراصل وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں میں بہت بڑی طاقت ہوتی ہے لیکن اس کا استعمال چوکس اور ایماندار رسول افسران، پولیس سرورسز اور عدلیہ کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا تھا۔ کلیان سنگھ نے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالتے ہی ان افسران کا تبادلہ شروع کر دیا جو اجدھیا میں صورتحال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے حق میں تھے۔ انہوں نے ایسے افسران کو تعینات کیا جو ان کے مشن میں معاون تھے۔ یہ تقرریاں محض اس لیے کی گئی تھیں کہ عمارت کا انہدام کر دیا جائے جو کہ بی جے پی اور آ ر ایس ایس کی انتخابی مہم کا حصہ تھا۔

دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ جن کے ہاتھ میں ڈنڈا اور بندوق ہے وہ بھی دوستانہ جذبہ رکھنے والے ہوں اور کارسیو میں کوئی خطرہ نہ بنیں۔ فیض آباد اور اجدھیا میں نئے افسروں اور ہمدرد پی اے سی کو تعینات کیا گیا تاکہ عمارت کا انہدام کیا جاسکے۔ دراصل اس روز یہ وردی پوش ہی کارسیوک بن گئے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ وہ طاقت کا استعمال نہ کریں اور کوئی بھی حالات ہوں کارسیوکوں اور ان کے لیڈروں پر گولی نہ چلائیں۔ اس طرح پولیس والوں نے آنسو گیس اور لٹھی چارج کا بھی استعمال نہیں کیا۔ تشدد پر آمادہ کارسیوکوں سے بچنے کے لیے پولیس کو جو ڈھالیں دی گئی تھیں وہ انہوں نے کارسیوکوں کو دے دیں اور کارسیوکوں نے ان کا خوب استعمال اور غلط

استعمال کیا۔ جب دھینگا مشتی شروع ہوئی تو پولیس افسران وہاں سے ہٹ گئے وہاں ایسے حالات بنائے گئے کہ متنازعہ عمارت تک رسائی آسان ہو جائے۔ سی سی ٹی وی کیمروں اور دیگر سرکاری آلات کو بیکار کر دیا گیا تا کہ بد معاشوں کی شناخت چھپی رہے اور وہ عمارت تک آسانی سے پہنچ سکیں۔ حکومت نے ایک بھی ویڈیو کیمرے کا انتظام نہیں کیا تا کہ اس وقت کے حالات کو ریکارڈ کیا جاسکے۔ حکومت و انتظامیہ کے اقدامات نے کارسیو کوں کو بے خوف و نڈر کر دیا تھا اور انہیں اپنے تحفظ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ مجموعی طور پر 6 دسمبر 1992 کو آئین و قانون کے وقار کے تحفظ کے کسی ارادے اور نیت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ ریاست اس مشترکہ مہم میں اپنی مرضی سے سازشی اور معاون بن گئی تھی جس نے اسلام کی علامت کے طور پر موجود عمارت کو منہدم کرنے کے نام پر ہندو تو وادی نسل کے احیاء کا اعلان کر رکھا تھا۔

سنگھ پر یوار کے نقلی اعتدال پسند:

اجودھیا میں مندر تعمیر کی مہم کی تمام ذمہ داری اور قصور سنگھ پر یوار کے سر جانا چاہئے۔ وہ مختلف قسم کی تنظیموں کا ایک وسیع اور بنیادی یونٹ ہے۔ اجودھیا تحریک بتاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب ماڈل ہے اور اس کا ڈھانچہ بہت منظم ہے۔ سنگھ پر یوار نے یہاں تک پہنچنے کے لیے ایک طویل عرصہ لگایا ہے۔ اور پروپیگنڈہ کے ذرائع میں اپنی اچھی جگہ بنائی ہے۔ پر یوار کے اندر نقلی اعتدال پسند عناصر بھی ہیں۔ ان نقلی عناصر کی کوششیں اندازے کے مطابق کم اہمیت کی حامل ہیں۔ لہذا آرائس ایس، وشو ہندو پریشد، شیو سینا، بی جے پی اور آرائس ایس کے اعلیٰ لیڈران انہدام کے لیے پوری طرح قصور وار ہیں۔

سنگھ پر یوار میں ایک طرف اٹل بہاری واجپئی، مرلی منوہر جوشی اور ایل کے اڈوانی جیسے لیڈران ہیں جو قطعی طور پر عوامی چہرے ہیں وہ بی جے پی کے بھی لیڈر

ہیں اور سنگھ پر یوار کے بھی۔ انہوں نے چھ دسمبر کے تعلق سے خود کو بے قصور بتایا ہے اور اس واقعہ کی مذمت کی ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے ایل کے اڈوانی نے متنازع عمارت کے انہدام پر اپنے غصے کا اظہار کیا اور اسے افسوسناک قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنی رتھ یا ترا کے دوران بھی انہوں نے کبھی اشتعال انگیز تقریر نہیں کی۔ دوسری طرف یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ خود بخود نہیں ہوا۔ یہ کمیشن اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ مذکورہ لیڈران بے قصور تھے یا ان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان نقلی اعتدال پسندوں نے سنگھ پر یوار کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ یہ لوگ بھی آ ر ایس ایس کے ہاتھوں میں اسی طرح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے جس طرح دیگر تنظیمیں۔ اور ان لیڈروں کو آ ر ایس ایس کے ذریعے حاصل سیاسی کامیابی کو ایک وراثت کی شکل میں حاصل کرنا تھا، آ ر ایس ایس کو مہرہ چاہئے تھا اور واچسپی ایک مکھوٹے کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ بہر حال ان لیڈروں کو شبہ کا فائدہ نہیں دیا جاسکتا اور انہیں بے قصور بھی نہیں بتایا جاسکتا۔ ان لیڈروں نے لوگوں کا اعتماد توڑا اور اپنے ووٹروں کے کہنے پر نہیں بلکہ ان تھوڑے سے لوگوں کے کہنے پر کام کیا جنہوں نے انہیں اس کام کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی بھی جمہوریت میں اس سے بڑا دھوکہ اور وشواس گھات یا جرم نہیں ہو سکتا اور اس کمیشن کو بھی دھوکہ دینے کے ان کے پاپ کے لیے ان نقلی اعتدال پسندوں کی مذمت کرنے میں کمیشن کو کوئی جھجک نہیں ہے۔

حکومت، وزیر اعلیٰ اور یو پی کا بینہ کارول:

اتر پردیش کی حکومت نے کلیان سنگھ کی سربراہی میں اقتدار سنبھالتے ہی 6 دسمبر 92 کے واقعات کو بڑھ چڑھ کر انجام دینا شروع کر دیا تھا۔

کلیان حکومت نے منظم انداز میں ان افسروں کو ہٹا دیا تھا جو اس کی راہ میں

رکاوٹ بن رہے تھے۔ اس نے سپریم کورٹ میں جھوٹ بولا اور رائے دہندگان کے اعتماد کے ساتھ دھوکہ کیا۔

دسمبر 92 کے سنگین بحران کے وقت بھی کلیان سنگھ خاموش رہے، انہوں نے اجودھیا مہم کو روکنے اور صحافیوں کو کارسیوں کے حملوں سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

وزیر اعلیٰ اور ان کی کابینہ نے سیکورٹی فورسز کو بے اسلحہ کر دیا تھا۔ متنازع مقام کے چاروں طرف لگائی گئی باڑھ کو ہٹوا دیا اور دنگائیوں و بلوائیوں کے خلاف طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔

عمارت کے انہدام کے آغاز، انہدام کے دوران اور اس کے بعد بھی کلیان سنگھ اور ان کے گرگروں نے فخر سے اس کا کریڈٹ لیا اور اسے اپنی عظیم کامیابی قرار دیا۔ انہدام کے بعد بھی انہوں نے اس کا سہرا اپنے سر باندھا، کلیان نے ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی ہر کوشش کی مخالفت کی اور زمینی حقائق کو نظر انداز کیا۔ یہاں تک کہ جب انہیں بتایا گیا کہ اجودھیا کی مسلم آبادی پر حملے ہو رہے ہیں اور عمارت گرا دی گئی ہے، تب بھی انہوں نے ان لوگوں کو، جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے، تحفظ فراہم کرنے کے لیے گولی چلانے یا طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔ انسانی زندگی کے خلاف وحشت و بربریت جاری رہی۔ یہاں تک کہ بعد میں بھی انہوں نے مرکزی مسلح دستوں کو تعینات نہیں کیا۔ جبکہ کر سکتے تھے۔

اگر کلیان سنگھ وزیر اعلیٰ نہ ہوتے تو اجودھیا میں یہ سب نہ ہوتا۔ پہلے بھی اسی قسم کی صورتحال کو ایک سابق وزیر اعلیٰ کے ذریعے قابو میں کیا گیا تھا۔ انہوں نے شرارتی عناصر کو وہ نہیں کرنے دیا تھا جو بعد میں 1992 میں ہوا۔ کلیان سنگھ کی حکومت آریس ایس کے مقاصد کی تکمیل میں ایک اہم حلیف تھی اور اس طرح کلیان سنگھ پر یوار کی امیدوں پر کھرے اترے۔

مسلم قیادت کی ناکامی

مخصوص مسلم قائدین اپنے سیاسی اثر و رسوخ میں اضافے کے لیے اور اپنے پیروؤں کی تعداد بڑھانے کے لیے اس دوران خاموش تماشائی بنے رہے۔ ان کا رویہ بہت مایوس کن تھا۔ انہوں نے سنگھ پر یوار کے پروگراموں کو نظر انداز کیا۔ ان کے پاس کوئی بڑا لیڈر تھا ہی نہیں۔ مسلم قائدین 6 دسمبر 92 تک بابر مسجد کے حق میں شہوتوں کے ساتھ اپنا دعوا پیش کرنے میں ناکام رہے۔ 1983 کے بعد تاریخ کا نامکمل نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بی ایم سی یا بعد میں اے آئی بی ایم سی (آل انڈیا بابر مسجد ایکشن کمیٹی) نے کسی بھی وقت مذاکرات کے دوران متنازع عمارت پر کوئی دعوا پیش نہیں کیا۔ ان کا دعوا سنگھ کے دعوے کو جھٹلانے والا ہی رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی بھی آتی گئی اور کچھ نیا جوڑا جاتا رہا۔ مسلم قیادت نے آ ر ایس ایس کے پیدا کردہ خوف کا سامنا کرنے کے لیے کچھ خاص نہیں کیا۔ اس کے برعکس آ ر ایس ایس کو حاوی ہونے کا موقع دیا۔ بد قسمتی سے بہت سے ہندوستانی اب بھی یہ مانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ایک محروم طبقے کی مانند سلوک کیا جانا چاہئے۔ حالانکہ ہندوستان پر صدیوں تک مغلوں/مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔

مسلم قائدین نے ایک خاص نظریہ کے حامل چند ہندوؤں کو عام شہریوں میں خوف پیدا کرنے کا موقع مہیا کیا۔ سیاسی مسلمان اوسط مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں یا نہیں، یہ ایک مشکوک معاملہ ہے۔ اعلیٰ مسلم قائدین کا طبقہ اپنے آپ میں ایک الگ طبقہ ہے وہ نہ تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرتا ہے اور نہ ہی اسے اس کی فکر ہی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس فرقے نے کچھ ہی عرصہ قبل

صدیوں تک موثر انداز میں اس ملک پر حکومت کی، اسے خصوصی اختیارات کی حصولیابی کے لیے مذہبی اختلافات پر منحصر ہوئے بغیر دوسرے شہریوں کی مانند زندگی کے تمام شعبوں میں اور کوشش اور مقابلے کے میدان میں آنے کے لیے کامیابی کیوں نہیں ملنی چاہئے۔

کسی حریف کے بغیر جنگ لڑنا ممکن نہیں۔ دشمن کی موجودگی ضروری ہے۔ مسلم لیڈروں نے جان بوجھ کر آریس ایس اور وشو ہندو پریشد کے بانیان کی یہ ضرورت پوری کر دی۔ مسلم لیڈروں نے اپنے فرقے اور ووٹروں کو بھی ناکام بنایا۔ وہ نہ صرف یہ کہ عدالت کے اندر ایک مدلل اور پختہ ثبوتوں کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنے میں ناکام رہے بلکہ بعد میں ہونے والے فسادات میں پھنسے بے قصوروں کے جان و مال کے تحفظ میں بھی ناکام رہے۔ مسلم لیڈران قومی مباحثوں سے واضح طور پر غیر حاضر رہے اور واقعات کے انتہا تک پہنچنے کے خلاف آواز اٹھانے میں بھی ناکام رہے۔ آریس ایس کے ذریعے تاریخ کو مسخ کرنے کی جو کوشش کامیاب طور پر کی گئی، مسلم لیڈروں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مسلم قیادت نے نصف صدی قبل غیر قانونی اور من مانے انداز میں متنازع عمارت میں مورتیوں کے نصب کرنے پر روشنی ڈالنے یا بعد میں تالا کھلوانے کے خلاف بھی کچھ نہیں کیا۔ تاہم مسلم قیادت کی ناکامی ہی دسمبر 92 کے واقعات کے لیے ذمے دار نہیں ہو سکتی۔ بہر حال مسلم لیڈروں کی غلطیوں نے قطعی طور سے سنگھ پر یوار کا کام کافی آسان بنا دیا۔ کمیشن ایسے لوگوں کو تیسرے درجے میں قصور وار مانتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے حلیفوں اور غیر جانبدار لوگوں کے مفادات کے تحفظ میں ناکام رہے۔

پریس پر حملے:

چھ دسمبر کے واقعات کو بڑھانے میں میڈیا نے اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ بھی اس

دن کے واقعات کے شکار ہوئے اور صحافیوں پر بھی حملے کئے گئے۔ حالانکہ سنگھ پر یوار نے اپنی مہم میں میڈیا کا موثر استعمال کیا۔ میڈیا کا ایک حصہ اپنی مرضی سے اجودھیا مہم میں مصروف رہا۔ اس وقت کی میڈیا رپورٹوں اور بعض صحافیوں کے بعد کے سیاسی کیریئر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پریس میں آنے سے قبل ایک خاص فرقہ سے تعصب رکھتے تھے، میڈیا پھوٹ ڈال رہا تھا اور آریس ایس کا معاون لگ رہا تھا اور ان دنوں وہ پر یوار کے مفادات کے حق میں مانا جاتا تھا۔ پر یوار کے میڈیا منیجر اس حقیقت سے واقف تھے۔ ان کے کاموں کو میڈیا کے ایک طبقے کے ذریعے مثبت انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔

6 دسمبر کو پر یوار نے بظاہر میڈیا والوں کو متنازعہ عمارت تک پہنچنے کے انتظامات کئے تھے۔ کمیشن کے پاس موجود ثبوتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تمام صحافیوں کو پاس جاری کئے گئے تھے۔ جو کارسیو کوں سے مل رہے تھے۔ ریاستی حکومت کے بجائے سنگھ پر یوار کے ذریعہ پاس جاری کرنے سے صحافیوں کی آمد و رفت اور ان کی موجودگی سے بھی آریس ایس قیادت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کارسیو کوں نے عمارت کو توڑنے کے ساتھ ہی صحافیوں پر بھی حملے شروع کر دیے۔ حالانکہ میڈیا کے ذریعے کسی کو بھی نہیں بھڑکایا گیا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے کہ وہ ان حملوں کی وجہ تھے۔ کچھ اسباب ضرور تھے جیسے کہ خاص طور پر جرمنی کے ایک ٹی وی اہلکار نے پہلے ہی کچھ قابل اعتراض مناظر دکھا کر کارسیو کوں کو بے عزت کیا تھا۔ ان الزامات میں کچھ صداقت ہے لیکن کچھ ایسا بھی نہیں ہے کہ 6 دسمبر کے حملوں کو جائز ٹھہرانے کے لیے اسے بنیاد بنایا جائے۔ بی بی سی کے مارک ٹلی کی مانند ایک سینئر صحافی نے کے ایس سدرشن کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی کہ صحافیوں کی پٹائی کی جارہی ہے۔ لیکن سدرشن نے بھی جرمن ٹی وی کے سلسلے میں خیالی باتیں کہی ہیں۔

ثبوتوں کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ ان صحافیوں کو نشانہ بنایا گیا جو ریکارڈنگ کے آلات سے لیس تھے۔ کیمرہ، ویڈیو ریکارڈر اور آڈیو ریکارڈر توڑ دیے گئے اور فلمیں تباہ کر دی گئیں۔ ان حملوں کے لیے تمام کارسیوکوں کو مورد الزام ٹھہرانا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ حملہ منظم سازش کا حصہ تھا۔ آرائس ایس کارکنوں کے ایک خاص گروپ کو اس کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور موقع پر موجود قیادت نے اس کارروائی کو کمانڈ کیا تھا۔

سنگھ پر یوار کی یکساں مشترکہ مہم

سیاستداں ایسے ایشوز کی تلاش میں رہتے ہیں جن کا استعمال کر کے لوگوں کے جذبات بھڑکائے جائیں اور اپنی مقبولیت بڑھائی جائے۔ جب کسی ایشو پر لوگوں کے جذبات بھڑک جاتے ہیں تو وہ صورتحال پورے ملک میں پھیل جاتی ہے اور نراج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیڈروں کے ذاتی عزائم سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

آزادی کے بعد صرف ہندو تو کے ایشو پر منتخب حکومت کی وجہ سے ایک چھوٹے سے طبقے میں عدم اطمینان پھیل گیا اور اس بے اطمینانی کی اس طرح پرورش کی گئی کہ وہ غصے اور تشدد کی شکل اختیار کر گئی۔ جس کا استعمال سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے کیا گیا۔ چھ دسمبر کے واقعات اچانک نہیں ہوئے اور نہ ہی ایسے تھے کہ ان کو روکنا ناممکن تھا۔ جو کچھ ہوا وہ منظم سازش کا نتیجہ تھا۔

کمیشن کے سامنے گواہیوں کے دوران بہت سے لوگوں کے نام چھپائے گئے اور پہلے سے رٹی رٹائی کہانیاں بار بار دوہرائی گئیں اور بھول جانے یا لاعلمی کا بہانہ کر کے سوالوں سے بچا جاتا رہا۔ گواہوں نے اڈوانی اور جوشی وغیرہ کو بچانے کی بار بار کوشش کی۔ 6 دسمبر کو اجودھیا میں بی جے پی، وی ایچ پی اور آرائس ایس کے جو لیڈران تھے ان کا دفاع کیا جاتا رہا۔ اس دن وہاں صرف اٹل بہاری واجپئی نہیں تھے

وہ اس دن لکھنؤ میں تھے اور اسی روز دہلی جا رہے تھے۔ وہ ایک منظم پلاننگ کے تحت اجودھیا نہیں پہنچے۔ بڑے لیڈروں کو آپریشن کے دائرے سے باہر رکھا گیا تاکہ ان کا تحفظ کیا جاسکے اور بعد میں اس کا سیاسی استعمال کر کے انہیں سیکولر قرار دیا جاسکے۔

سازش کے درمیان

سیاسی پارٹیوں کے لیے اجودھیا ایک ایسا ایشو تھا جس سے فائدہ اٹھانے کو وہ نظر انداز نہیں کر پارہے تھے۔ دہائیوں قبل متنازعہ عمارت میں پراسرار طریقے سے مورتیاں نصب کی گئیں اور ایک ایسے موقع کی تلاش کی جاتی رہی جس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ کاشی اور متھرا کے مندروں پر قبضے کے لیے عوامی طور پر مطالبہ کیا جاتا رہا۔ داؤد دیال کھنہ پروفیسر راجندر سنگھ اور گلزاری لال نندا جیسی ہستیوں نے 1953 میں متنازعہ عمارت پر قبضہ دلانے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کو بالا صاحب دیورس اور رجو بھیا وغیرہ کا آشیرداد حاصل تھا۔ بعد میں آ ر ایس ایس نے اس مطالبہ کی کھل کر حمایت شروع کر دی۔ متنازع عمارت کو قومی زندگی پر کلنک مانا گیا۔ جسے منہدم کرنا ضروری تھا۔ مسلمانوں پر کٹر پنتھی اور فرقہ پرست ہونے کا الزام لگایا گیا اور دعوایا گیا کہ تاریخ داں گمراہ کر رہے ہیں۔

وہ نے کئی بار نے اپنی گواہی میں کہا کہ متنازع عمارت ایسا معاملہ تھا جو تہذیب و ثقافت کو متاثر کر رہا تھا اور وہ ہندو دھرم کا ایسا اپمان تھا جسے ہندوستانی کبھی نہیں بھول سکتے۔ گواہی کے دوران مسلمانوں کے تئیں ان کی نفرت اس وقت سامنے آئی جب انہوں نے مسلمانوں کو جھاڑو بردار کہا اور آگے غلیظ زبان استعمال کرتے ہوئے طنزاً کہا کہ (ہم یہاں اس جملے کا استعمال انتہائی ہتک آمیز سمجھتے ہیں اس لیے اس سے دامن بچا رہے ہیں) (مرتب) وہ نے کئی بار نے کہا کہ ربو کی گولی یا پانی کی بوچھاڑ سے نظم و ضبط ختم ہو جائے گا اور میں بھی کسی قسم کی پابندی سے آزاد ہو جاؤں گا۔ پرم

ہنس رام چندر داس کہا کرتے تھے کہ میں فیصلے سے بندھا ہوا نہیں ہوں اگرچہ یوپی حکومت اس سے بندھی ہو۔ ہم لوگ وہ زمین لیں گے جسے بابر نے لیا تھا چاہے وہ متنازعہ ہو یا نہ ہو۔ جس طرح مسلم بادشاہ بابر نے رام مندر گرا کر اس کی جگہ پر مسجد بنانے کے لیے کوئی تاریخ طے نہیں کی تھی اسی طرح ہم لوگ بھی عمارت کے انہدام کی کوئی تاریخ طے نہیں کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ 6 دسمبر کو وہ لوگ بھجن کیرتن کے آگے بھی کچھ کریں گے۔ کارسیوا صرف کیرتن تک محدود نہیں رہے گی۔

مندر بنانے کا جنون

مسٹر اے کے شرن نے کہا کہ تحریک کے لیڈروں نے یہ اعلان کبھی نہیں کیا کہ ان کی منشا صرف علامتی کارسیوا کی ہے۔ ان لوگوں پر متنازع عمارت گرا کر وہاں ایک عارضی مندر بنانے کا جنون سوار تھا۔ چھ دسمبر کے لئے لیڈروں کے اہداف، مقصد اور موضوع میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

ایل کے اڈوانی نے کہا کہ حقیقی کارسیوا کی جائے گی۔ اور اس راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی جائے گی کارسیوا کا مطلب صرف بھجن کیرتن نہیں ہے ہم لوگ 2.77 ایکڑ زمین پر بیلچوں اور اینٹوں سے کام کریں گے۔ بعد میں انہوں نے پارلیمنٹ میں اس بیان کی تردید کی۔ انہوں نے یہ کہا کہ حقیقی کارسیوا کی بہت دنوں سے تیاری کی جا رہی تھی۔ اجودھیا میں تعمیراتی کاموں سے وابستہ ایک شخص چمپت رائے نے 24 نومبر 92 کو کہا تھا کہ گوریلا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا اور کارسیوا کی جائے گی۔

آر ایس ایس اجودھیا تحریک کا سرپرست تھا۔ اس کا مقصد ہندو تو یا ہندو راشٹر کے تعلق سے بحث شروع کرنا اور ہندوؤں کو سیاسی طور پر متحد کرنا تھا، اڈوانی نے بھی رتھ یاترا کا یہی مقصد بتایا تھا۔

بی جے پی آرایس ایس کے ایک لازمی عضو کی حیثیت رکھتی ہے اور براہ راست اس کے دائرہ اثر میں ایک کام کرتی ہے۔ اگرچہ رسمی طور پر وہ آزاد ہے۔ بی جے پی، آرایس ایس، بجرنگ دل اور وی ایچ پی کے اعلیٰ کارکن ایک دوسری تنظیموں میں آ جاسکتے ہیں۔ آرایس ایس نے ایک پرچارک وئے کٹیار کورام مندر تعمیر کے لیے اجودھیا بھیجا۔ بعد میں انہیں بجرنگ دل کا صدر بنا دیا گیا۔ شروع میں پریشد کی جانب سے پرم ہنس رام چندر داس نے مطالبات رکھے تھے۔ بعد میں بی جے پی نے کھل کر اس مہم کا ساتھ دیا۔ اور اس سے سیاسی فائدہ اٹھایا۔ وئے کٹیار نے حلف لیکر بھی بارہا جھوٹ بولا اور بے بنیاد باتیں کیں۔

مہنت اوید ناتھ نے کہا کہ قانون توڑے بغیر کوئی قانون کامیاب نہیں ہو سکتا جبکہ پرمود مہاجن نے کہا کہ جو بھی رام کے سامنے آتا ہے راون کی موت مر جاتا ہے۔ اوما بھارتی نے کہا کہ چھ دسمبر کو انہوں نے کارسیو کوں سے عمارت سے اترنے کو کہا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

ایس بی چوان نے (اس وقت کے وزیر داخلہ) کہا کہ انہدام کے بعد کلیان سنگھ کا استقبال ایک ہیرو کے طور پر کیا گیا۔ انہوں نے کلیان کے اس بیان کا حوالہ دیا کہ سپریم کورٹ کے حکم کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے لیکن رام کی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت کے داخلہ سکریٹری گوڈ بولے نے کہا کہ متنازع عمارت کا انہدام اڈوانی، جوشی اوما بھارتی، سدرشن، وام دیو، گری راج کشور، اشوک سنگھل، وئے کٹیار، پرم ہنس، آچاریہ دھرمیندر، رتھمبرا، چمیا مانند، توگڑیا، مہاجن اور وی شیشادری کی کوششوں کا انجام تھا۔

اتر پردیش میں صدر راج؟

کمیشن کو مرکزی حکومت کے رول کے وضاحت کا معاملہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے اجودھیا معاملے میں اس کا رول کمیشن کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ تاہم چونکہ کمیشن کو واقعات حقائق اور یوپی کے وزیر اعلیٰ اور وزرا اور افسران کے رول کا پتہ لگانے اور سیکورٹی وغیرہ میں خامیوں کا ذکر کرنے کو کہا گیا تھا لہذا مرکزی حکومت کے رول پر بھی کچھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت نے اپنی ناکارکردگی سے انہدام میں تعاون دیا۔ چونکہ وہ ریاست میں صدر راج لگانے یا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے میں ناکام رہی اس لیے متنازع عمارت کا انہدام ہوا۔ مرکزی حکومت کو متنازع عمارت کے عدم تحفظ اور نیم مسلح دستوں کی عدم تعیناتی کے لیے مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ مرکزی حکومت کے ذریعے یوپی میں صدر راج نافذ نہ کرنے اور نیم مسلح دستوں کو تعینات نہ کرنے پر اجمال کے ساتھ غور کیا جائے۔ ان معاملات کے تعلق سے مختلف ثبوتوں کو دیکھا گیا، گواہوں سے جرح کی گئی اور متعلقہ کتابوں اور مضامین کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں بے پناہ اختیارات دیے گئے ہیں اور ان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ آئین کے مطابق مرکزی کابینہ یا آئین کے ذریعے دیے گئے مشورے کے تحت کام کریں۔ گورنر کو ریاست کی حیثیت سے کار گزار اختیارات دیے گئے ہیں۔ بلاشبہ صدر کے اختیارات کے تحت گورنر کو ریاستی کابینہ کے مشورے یا آئین کے ذریعے دیے گئے اختیارات کے تحت کام کرنا ہوتا ہے۔

صدر کو امن وامان اور لائینڈ آرڈر قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ملک کے اتحاد و یک جہتی کو قائم رکھنے کے لیے آئین میں غیر معمولی طاقتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ طاقتیں ہندوستان کے صدر کو ہنگامی حالات کے دوران استعمال کرنے کے لیے دی گئی ہیں تاہم آئین میں ہنگامی حالات کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جن حالات میں صدر کے ذریعہ ایمر جنسی طاقتوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے ان کا ذکر آئین کے باب xviii میں کیا گیا ہے۔

آئین کی دفعہ 352 میں کہا گیا ہے کہ صدر کے ذریعہ سنگین ہنگامی حالات پیدا ہونے کے کا یقین ہونے، جس کے ذریعے سلامتی کو خطرہ لاحق ہو، ان کے ذریعہ ایمر جنسی کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔

یہ اعلان واقعہ کے ہونے یا لاحق خطرات کے پیش نظر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ملک پر بیرونی حملہ یا مسلح بغاوت کی صورت میں مرکز کے اختیارات کا ذکر دفعہ 352 میں کیا گیا ہے۔ داخلی بد امنی یا ریاست کو آئین کے مطابق نہ چلانے کی صورت میں صدر گورنر سے رپورٹ کے حاصل ہونے اور اس بات سے مطمئن ہونے پر کہ ریاستی حکومت آئین کے مطابق نہیں چل رہی ہے، صدر کے ذریعے اس سلسلے میں ایک اعلان کیا جائے گا۔ صدر ریاستی کاموں اور گورنر یا دیگر کسی افسر کے ذریعے استعمال میں لائی جانے والی طاقتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ اس اعلان کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کر کے منظوری لینے کی ضرورت دو ماہ کے بعد وہ کالعدم ہو جائے گا۔ ایمر جنسی کے اعلان میں توسیع کی جاسکتی ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے تین سال کی مدت کے لیے جاری کیا جاسکتا ہے۔

مرکزی حکومت نے کمیشن کے سامنے یہ موقف رکھا کہ دفعہ 356 میں اعلان جاری کر کے ریاست میں صدر راج نافذ کرنے کا انتظام نہیں ہے۔ پی وی نرسمہا راؤ

نے کہا کہ درحقیقت مرکز کے پاس ایسا کوئی مواد نہیں تھا جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ بیرونی حملہ یا داخلی بد امنی ہے یا ریاستی حکومت آئین کے مطابق کام نہیں کر رہی ہے۔ یہ ذکر کیا گیا کہ اس پہلے قدم کے فقدان میں صدر کے ذریعے آئین کے مطابق حکومت چلانے کی ریاستی حکومت کی ناکامی کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے مرکزی کابینہ کے ذریعہ ایسا کوئی مشورہ دیا جاسکتا ہے۔

بیرونی حملہ یا داخلی بد امنی کے خلاف ریاست کے تحفظ کے مرکز کے فریضہ کے حوالے سے یہ متعین کرنے کے لیے کہ ریاستی حکومت آئین کے مطابق کام کرے، مرکز ریاست میں اس کی مرضی سے ہی مرکزی دستے تعینات کر سکتا ہے۔ ریاست کے ذریعہ مرکزی دستے تعینات کرنے کی اجازت نہ دینے اور نہ ہی مسلح افواج سے مدد مانگنے کی صورت میں مرکزی حکومت صرف دفعہ 357 کے تحت ہی رسمی ہدایات جاری کر سکتی ہے۔ جب عوام میں بد انتظامی کافی بڑھ جائے اور ایسی تعیناتی ضروری ہو جائے تو صورتحال کا جائزہ لینے اور کسی ریاست میں مسلح افواج کو تعینات کرنے کا اختیار مرکز یا ریاست کی حقیقی صورتحال کے تعین پر منحصر کرتا ہے۔ صدر راج کا اعلان کرنے کے اختیار کا استعمال صدر کے ذریعہ حاصل گورنر کی رپورٹ یا کسی اور صورتحال کے پیدا ہونے، جہاں حکومت کو ریاست میں آئین کے تحت چلایا جاسکتا ہو، اس سے مطمئن ہونے پر ہی کیا جاسکتا ہے۔

نرسمہا راؤ کے دلائل:

نرسمہا راؤ نے کہا کہ سرکار یہ کمیشن نے پنجاب میں 1951 اور 1973 میں آندھرا پردیش میں صدر راج نافذ کرنے کا حوالہ دینے کے بعد کہا تھا کہ پارٹیوں کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے اس آئینی انتظام کا استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ سرکار یہ کمیشن نے صدر راج لگانے کے لیے رہنما ہدایات کا

مشورہ دیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اس غیر معمولی اختیار کے کسی غیر مناسب استعمال یا غلط استعمال سے آئین کا تانا بانا تباہ ہو جائے گا۔

انہوں نے اجودھیا میں 1992 کی صورتحال اور واقعات کا ذکر کرنے کے بعد گواہی دیتے ہوئے کہا کہ بی جے پی کی حکومت نے یہ دعوا کیا تھا کہ اس کے پاس رام مندر تعمیر کرنے کا مینڈیٹ ہے اور اسے پوری امید تھی کہ کارسیوا سپریم کورٹ کی متعینہ شرائط کے تحت ہی کی جائے گی۔ اس کے علاوہ گورنر نے مرکز کو صدر راج نافذ کرنے کے خلاف وارننگ دی تھی۔ گورنر کے ذریعہ ایک خط ارسال کیا گیا تھا جس میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ذکر کیا گیا تھا کہ ایسی اطلاع ملی ہے کہ اجودھیا میں بڑی تعداد میں کارسیوک پہنچ رہے ہیں اور وہ پرامن ہیں۔ ریاستی حکومت نے سپریم کورٹ کو یہ واضح یقین دہانی کرائی تھی کہ متنازعہ عمارت کے تحفظ کا وافر انتظام کیا گیا ہے۔

نرسمہاراؤ نے کہا کہ مرکز کو اس کی نجی ایجنسیوں سے حاصل معلومات اور میڈیا اور عوام سے لیے گئے جائزوں کے مطابق عام آدمی اور قومی یک جہتی کونسل اور دیگر لوگوں کی رائے اور دلائل اور حقیقی صورتحال پر تفصیلی غور و فکر کے بعد یہ عام رائے بنی تھی کہ صدر راج نافذ کرنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جمہوریت میں ایسا طاقتور قدم اٹھانے کے لیے صرف افواہوں، تخیلات، تعلیمات یا سنی سنائی باتیں کافی نہیں ہیں۔ حکومتیں ایک دوسرے کی بداعتمادی پر نہیں چلتیں۔ بھلے ہی یو پی میں بی جے پی کی حکومت تھی۔

نرسمہاراؤ نے کہا کہ مرکزی حکومت پر عدالت کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مندر تعمیر کرنے یا اسکی اجازت دینے یا عمارت کے تحفظ میں ناکام رہنے جیسے الزامات نہیں تھے۔ چونکہ کارسیوا علامتی اور پرامن ہونی تھی لہذا صدر راج لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک عدالتی حکم کی خلاف ورزی کا سوال ہے، تو اس کا حل تو بین عدالت کی کارروائی کی شروع کرنا تھا نہ کہ صدر راج نافذ کرنا۔ انہوں نے اس

موقف کا اظہار کیا کہ حکومت کو برطرف کرنے، یا ریاستی اسمبلی کو تحلیل کرنے یا ریاست میں صدر راج نافذ کرنے کے لیے وقت صحیح نہیں تھا۔ راؤ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ ایسی صورتحال میں صدر راج لگائے جانے پر اس کے دور رس اثرات پڑتے اور اس سے ملک کے دیگر حصوں میں بھی بڑے پیمانے پر تشدد پھیل جاتا۔ ایسے میں متنازع عمارت کو نقصان پہنچانے کے امکان سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لیے ان کی رائے میں اس معاملے میں بے حد احتیاط برتنے اور متعدد امکانات پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں نہ تو ذاتی طور پر یہ نتیجہ نکلا اور نہ ہی اجتماعی طور پر کہ ریاستی حکومت آئین ہند کے تحت کام نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف گورنر کی رپورٹ اور صدر راج لگائے جانے کے خلاف ان کی وارننگ کے پیش نظر صدر راج نافذ نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ صدر راج کے نفاذ کی آئینی تشریح کے بارے میں سپریم کورٹ کے نقطہ نظر میں تبدیلی بھی تھی۔

راؤ نے مستعد مرکزی دستوں اور ان کی تعیناتی کے مابین فرق کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے کہا ”ہم انہیں مستعد کر سکتے ہیں لیکن ان کی تعیناتی جیسی ہو سکتی ہے جب وزیر اعلیٰ ایسا چاہے“ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ عام رائے دہندگان میں یہ پیغام جائے گا کہ بی جے پی عمارت کو تباہ کرنا چاہتی ہے اور اسی مقام پر مندر تعمیر کرنا چاہتی ہے تو انہوں نے کہا کہ ”میں کہوں گا کہ عام طور پر رائے دہندگان مندر کی تعمیر چاہیں گے۔ مندر کیسے بنایا جائے گا، مندر کی تعمیر کے لیے کیا کیا جائے گا عام ووٹر اس میں نہیں پڑنا چاہے گا۔ کچھ ووٹر ایسے ہوں گے جو اس سے انہدام کا مطلب نکال سکتے ہیں لیکن سبھی نہیں۔“

نرسمہا راؤ نے کہا کہ انہوں نے اجودھیا ایٹھو پر دو بنیادی مسائل کی شناخت کی، یعنی لوک سبھا انتخابات میں بی جے پی اور کانگریس نے اجودھیا کے تعلق سے مختلف دعوے کئے جو ایک دوسرے کے برعکس تھے۔ اس کا حل بات چیت کے ذریعے اور

مذہبی شخصیات سے مشورہ کر کے ہی نکالا جاسکتا تھا۔ اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ متنازع رام جنم مندر/بابری مسجد عمارت بی جے پی حکومت کے ہاتھوں یرغمال بن گئی تھی۔ مرکزی حکومت کی یو پی میں ذرا سی بھی پہنچ نہیں تھی۔ ایسے حالات میں دلائل نے اس کارروائی کے لمبے وقفے تک چلنے سے انکار کر دیا تھا اور صدر راج لگانے کے خلاف گورنر کے انتباہ کے بعد مرکزی حکومت کے پاس ریاستی حکومت سے ریاست میں مستعد مسلح دستوں کا استعمال کرنے کے لیے بار بار گزارش کرنے کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں تھا۔ ریاست نے واضح انکار کئے بغیر کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔

یہ بتایا گیا کہ 6 دسمبر 92 سے محض 22 روز قبل اجودھیا میں ایک بھی شخص نہیں گیا تھا اور ایسی صورتحال میں آئینی نظام کے منتشر ہونے کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ یہ معاملہ واضح طور پر بدینتی کا ہے۔ اس مقصد کے لیے داخلہ سکرٹری کے مشورے کی روشنی میں نصف شب میں بغیر کسی ایجنڈے کے ہوئی میٹنگ کی خبر انتہائی رازداری برتنے کے باوجود دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچنے میں دس منٹ کا بھی وقت نہیں لگتا اور اگلے روز میڈیا میں قیاس آرائیاں شروع ہو جاتیں اور افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ داخلہ سکرٹری کے مشورے کے مطابق نصف شب میں میٹنگ کرنے کے تعلق سے دوسرے وزرا بھی مطمئن نہیں تھے۔ یہاں تک کہ دوسرے سینئر وزرا بھی داخلہ سکرٹری کے خیال سے مطمئن نہیں تھے۔ اندرجیت گپتا نے یہ کہتے ہوئے عدم اتفاق کا اظہار کیا کہ ان کی پارٹی صدر راج لگائے جانے کے خلاف ہے۔

مرکزی حکومت کا مفلوج ہو جانا:

نرسمہا راؤ نے اپنے نتائج میں کہا کہ سپریم کورٹ نے 28 نومبر 92 کے اپنے حکم میں حکومت ہند کو اس کی رسیور شپ کی درخواست کو پینڈنگ میں رکھتے ہوئے ایک مشاہد مقرر کرنے کی غرض سے موثر قدم اٹھانے کو کہا تھا۔ راؤ نے واضح طور پر کہا

کہ تدار کی اقدام کے طور پر دفعہ 355 نافذ نہیں کی جاسکتی تھی اسے صرف اصلاحی قدم کے طور پر ہی لاگو کیا جاسکتا تھا۔ یہی صورتحال دفعہ 356 کے ساتھ بھی تھی۔ اس دفعہ کو صورتحال پیدا ہونے کے بعد ہی نافذ کیا جاسکتا تھا نہ کہ اس وقت جب صورتحال پیدا ہونی ہو۔ اسے صورتحال کی پیشگی قیاس آرائی کے طور پر لاگو نہیں کیا جاسکتا تھا، انہوں نے کہا کہ سرکاری کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بھی 356 کو آئینی ڈھانچہ کے ناکام ہونے کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا۔

انہوں نے کہا کہ دراصل وہ چاہتے تھے کہ چار یا چھ دسمبر 92 کو یا اس سے پہلے فوج کے ٹھکانے سے اس مقام تک پہنچانے کے راستے کو محفوظ رکھا جائے جہاں سے بابر مسجد عمارت کو بچانا یا محفوظ رکھنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے دو طریقے تھے۔ پہلا ریاستی حکومت سے تعاون مانگا جائے جو دیا نہیں گیا اور واضح طور پر منع بھی نہیں کیا گیا۔ دوسرا قانوناً مداخلت کرنا تھا جو ریسورسپ کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا جس کے لیے عدالت نے انکار کر دیا تھا۔ نتیجتاً فورسز اس امید کے ساتھ کھڑی رہیں کہ وہ وزیر اعلیٰ کے لیے فراہم رہیں گی۔ وہ وزیر اعلیٰ کے حکم کی منتظر تھیں، جنہیں ان کے حکم پر تعینات کیا جانا تھا، جب کبھی وہ ایسا فیصلہ کرتے۔

نرسمہا راؤ نے اپنے نتیجے میں کہا کہ مرکز ریاستی حکومت کو صرف مناسب ہدایات ہی جاری کر سکتا ہے اور ان پر عمل آوری کے لیے وقت دے سکتا ہے۔ اس وقت کو گھنٹوں میں آنکا نہیں جاسکتا۔ اس کے لیے مناسب وقت ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ان حالات سے نمٹنے کے لیے آئین میں 356 ہی واحد عملی دفعہ ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ متنازع عمارت پر شلانیاس کی اجازت دینا بھاری غلطی تھی، انہوں نے مزید کہا کہ سپریم کورٹ کے سامنے مندر تعمیر کا سوال نہیں لایا گیا۔ اور معاملہ صرف کارسیوا تک ہی محدود تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ گورنر ریاست میں صدر کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ مرکز

کا پیغامبر ہوتا ہے۔ اور اسے ریاست سے مرکز کو مسلسل اطلاعات فراہم کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر گورنر پر مداخلت کرنے کی ضرورت کے بارے میں صدر کو مشورہ دینے کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔

اس طرح دستور ہند کا پورا لائحہ عمل گورنر پر منحصر کرتا ہے کہ وہ سیاسی، سماجی اور عوامی حالات کا اظہار کرنے والی یا کوئی اور اطلاع ہم آہنگ کر کے صدر کے پاس بھیجے۔ کوئی گورنر جو اپنے دفتر کی ذمہ داری کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے یا اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر سکتا، تو وہ وفاقی نظام میں انتشار کی پہلی علامت ہوتی ہے اور بالآخر وہ اس پورے نظام کے انہدام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

مداخلت کے لیے مرکز کے پاس جواز نہیں تھا:

اتر پردیش میں مرکزی حکومت اس وقت تک براہ راست مداخلت نہیں کر سکتی تھی جب تک کہ اس کے پاس وافر وجوہات نہ ہوں یا کام کرنے سے متعلق کوئی اطلاع نہ ہو۔ ایسی اطلاع یا وجہ گورنر کے ذریعے فراہم کی جاسکتی تھی اور ایسا اس معاملے میں اتفاق سے نہیں کیا گیا تھا۔ حقیقی صورتحال کی اطلاع دینے میں ناکام رہنے پر گورنر نے اپنی ذمہ داریوں کے تئیں بیداری کے فقدان اور اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ناکام رہنے اور ریاستی حکومت کے ساتھ چاہے انچاہے میں یا جان بوجھ کر یا لاعلمی میں ملی بھگت کا ثبوت دیا ہے۔

نرسمہا راؤ نے اس سوال کے جواب میں کہ 6 دسمبر 92 سے قبل اتر پردیش میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا ان کا فیصلہ ایک سیاسی فیصلہ تھا یا قانونی فیصلہ تھا، کہا کہ میرا فیصلہ قانونی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ جو آئین کی دفعہ 356 کے تحت آتا ہے۔ یہ میری حکومت کا اندازہ تھا کہ دسمبر 92 میں ریاستی حکومت اور وزیر اعلیٰ کے ذریعے مرکزی حکومت، قومی یک جہتی کونسل اور سپریم کورٹ سے کی گئی اس واضح یقین دہانی

کے پیش نظر کہ ریاستی حکومت متنازع عمارت کے تحفظ کے عہد کی پابند ہے اور اس بات کو یقینی بنائے گی کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے، دفعہ 356 کے تحت کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری حکومت اس پر ثابت قدم رہی۔ ہم کارروائی کر کے اس صورتحال سے کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے ایسا کرتے تو غلط ہوتا۔ میں دفعہ 356 کا استعمال کر کے مرکز کی بھاری ذمے داری کے تئیں پوری طرح تیار تھا مگر یہ پایا گیا کہ مرکزی حکومت یقین دہانیوں کے تئیں مشکوک تھی، لیکن اگر اس نے دفعہ 356 کے تحت کوئی کارروائی کر کے دسمبر 92 سے قبل یوپی حکومت کو برطرف کر دیا ہوتا تو عدالت اس کارروائی کو غلط بتا سکتی تھی۔ اس موقع پر عدالت کا کہنا ہوتا کہ شکوک و شبہات کی کوئی بنیاد نہیں تھی کیونکہ وزیر اعلیٰ بار بار عمارت کے تحفظ کا وعدہ کر چکے ہیں، صرف شبہات کی بنیاد پر کوئی کارروائی کرنا جائز نہیں تھا۔

یہ پورا معاملہ سیاسی پارٹیوں، لیڈروں اور نظام میں عدم اعتماد پر مبنی تھا۔ یوپی حکومت، بی جے پی، ہندو پریشد، بجرنگ دل، شیوسینا اور سنگھ پر یوار کے بھی کام انہدام کے واقعہ سے پیدا صورتحال، لیڈروں کی تقریروں وغیرہ کا مقصد نیم مسلح دستوں کی تعیناتی کو روکنا یا صدر راج سے بچنا تھا۔ تمام کام اور تقریریں اس طرح مرتب کئے گئے تھے کہ مرکز کے پاس 355 یا 356 کے لاگو کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔

نرسمہا راؤ نے صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا:

یہ افسوسناک تھا کہ پانسہ ریاستی حکومت کے پالے میں تھا، اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ مرکز میں ایک اقلیتی حکومت کی قیادت کر رہے تھے، انہوں نے صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مرکز کے ذریعہ نہ تو مسلح دستوں کو تعینات کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی افواہوں اور میڈیا رپورٹوں کی بنیاد پر صدر راج لگایا جاسکتا تھا۔ ایسا قدم اٹھانے سے مستقبل کے لیے ایک غلط مثال قائم ہوتی جس سے آئین کا وفاقی ڈھانچہ تباہ

ہو جاتا اور اسے ریاستی حکومت میں مداخلت سے تعبیر کیا جاتا۔ شاید گورنر حکومت کو حقیقی صورتحال سے باخبر کرنے کا اہم رول ادا کر سکتا تھا۔ اور ریاستی حکومت کی مرضی کے بغیر بھی مرکزی مداخلت کے لیے بنیاد فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن یہ پایا گیا کہ گورنر کے ذریعہ صورتحال کا اندازہ یا تو پوری طرح خامیوں سے بھرا ہوا تھا یا پوری طرح امید افزا تھا اور اس طرح یہ مرکزی حکومت کے لیے ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ ریاستی حکومت اور گورنر کے ذریعے یکساں مثبت اطلاع دینے اور اصل بات کو چھپانے اور حکومت کو گمراہ کن رپورٹ دینے سے مرکز کو انہیں ماننے کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا۔

مرکزی حکومت کے ذریعہ ریاستی حکومت سے مرکزی فورسز کو تعینات کرنے کی بار بار اپیل کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مرکزی حکومت اس تباہی کو روکنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف ریاستی حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مرکز لاچار اور خاموش تماشائی بن گیا۔ دسمبر 92 اور اس کے بعد کے واقعات کے نتائج کے مطابق ریاست میں یقیناً صدر راج نافذ کیا جانا چاہئے تھا۔ تاہم ریاستی حکومت نے چالاکی کے ساتھ مرکز کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

ملک کے کسی بھی حصے میں فسادات کرنا یا بد امنی پھیلانا، خاص طور پر جب وہ ریاستی حکومت کے ذریعے کیا جا رہا ہو، ایسی صورتحال میں مرکزی حکومت کو مداخلت کرنا ضروری ہو جاتا ہے، چاہے وہ مداخلت صدر راج لگائے جانے کی صورت میں ہو یا کسی ایجنسی کے استعمال کی ہو، منظم اور مرکزی کارروائی کا حکم دینا ضروری ہوتا ہے۔

1992 میں مرکزی حکومت اپنے ایجنٹ کے ذریعے کارروائی نہ کرنے کی وجہ سے اور سپریم کورٹ کے ذریعے سنگھ پر یوار کے کاغذی اعلانات پر زبردست بھروسہ کرنے کی وجہ سے مفلوج ہو گئی تھی۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ایسا المیہ مستقبل میں کبھی بھی نہ پیش آئے۔

سفارشات

مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا آئینی انتظام حکمرانی کے معاملات کو مذہب کی مداخلت سے بچانے کے مقصد سے ہی تھا۔ مذہب ذات برادری اور علاقائیت کا استعمال ایک خطرناک ذہنیت پیدا کر سکتا ہے اور لوگوں میں ناراضگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔

6 دسمبر کا واقعہ اور بعد کے بھی کچھ واقعات ملک کے لیے خطرناک ثابت ہوئے ہیں اور مذہب اور سیاست کی تباہ کن آمیزش دیکھنے میں آئی ہے۔ اس لیے لوگوں کے لیے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے موجودہ آئینی قانونی اور ادارہ جاتی معلومات حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ موثر ثابت ہو سکیں۔

وقت آ گیا ہے کہ قومی یک جہتی کونسل جیسے اداروں کو آئینی اختیارات دیے جائیں، ایسے اداروں میں ملک کے معروف مذہبی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں کی شرکت ہو جو بالخصوص کسی بھی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہ ہوں۔ تاکہ آئین میں جس سیکولرزم کا خواب دیکھا گیا ہے اسکی عملی تعبیر ڈھونڈی جاسکے۔ مدعو ممبران یا ایسے اداروں میں شامل لوگوں پر بعد میں کسی بھی آئینی عہدے یا سرکاری ملازمت یا کسی سیاسی سرگرمی میں شرکت کی پابندی لگائی جائے۔

سیاسی عہدوں میں جرائم کاری کے ذریعے یا سیاسی اور مذہبی معاملوں کی باہم آمیزش سے اقتدار حاصل کرنے کے معاملات میں بیرونی مداخلت آج عام بات ہو گئی ہے۔ سیاسی فائدہ حاصل کرنے یا سیاسی اور دوسری طاقت غیر قانونی طور پر حاصل کرنے کے لیے مذہب اور ذات برادری کے غلط استعمال پر خصوصی سزاؤں کا

انتظام کرنے کے لیے قانون بنایا جائے۔ اور ایسے قوانین پر عمل درآمد کے لیے ملک گیر سطح پر علاقائی ٹریبونل بنائے جائیں۔

ایک تعزیری انصاف کمیشن کے قیام کی ضرورت کا جائزہ لیا جانا چاہئے جو قانون نافذ کرنے والی سبھی ایجنسیوں کے کام کاج کی نگرانی کرے اور جہاں بھی ضروری ہو اصلاحی اقدامات کرے۔

فرقہ وارانہ تشدد کے خطرے سے سختی سے نمٹا جانا چاہئے۔ حکومتوں کو فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق الزامات واپس نہیں لینے چاہئیں، الیکشن کمیشن کو بھی یہ یقینی بنانا چاہئے کہ کسی بھی شہری کے ذریعے مذہب کے ناجائز استعمال کے خلاف سخت کارروائی کی جائے اور ایسے شخص کو نااہل کر دیا جائے۔ اس مسئلے پر پارلیمنٹ اور مذہبی رہنماؤں اور سیاستدانوں کو بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جمہوریت کو مذہب یا ذات برادری کے بندھن میں باندھے رکھنا فطری طور پر غلط، غیر آئینی اور قانونی طور پر مشکوک ہے۔ اسٹیٹ اور مذہب کی تقسیم پر بحث ہوتی رہتی ہے اور تقریباً ہر منظم و مہذب سماج اس کے حق میں ہے۔ ہندوستان کا آئین تقسیم کے اس اصول کا حامی ہے اور واضح انداز میں کہتا ہے کہ انڈین یونین نہ تو مذہب کو خیر باد کہتا ہے اور نہ ہی غیر مذہبی صورتحال کا اعلان کرتا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر بنی حکومت، جس کے سیاسی ایجنڈے میں مذہبی ایشوز ہوں، کو روک دیا جائے، ایسی حکومت جو ایک خاص مذہب کو اپنی حمایت دیتی ہو یا اپنے سیاسی ایجنڈے میں مذہبی ایشوز رکھتی ہو، آئین کے تحت واضح طور پر اس کا بائیکاٹ کیا جائے۔ انتخابی منشور میں مذہبی ایشوز شامل کرنے کو انتخابی جرم قرار دیا جائے اور ایسے لوگوں اور پارٹیوں کو الیکشن کے نااہل قرار دیا جائے۔

وقت آ گیا ہے کہ آئین کی تخلیق کے وقت سے لے کر اب تک جو خامیاں نظر آئی ہیں ان پر غور کرنے اور تجویز پیش کرنے کے لیے پارلیمنٹ ایک اجلاس

طلب کرے۔

سول سرویزر

سماج میں لائینڈ آرڈر کے قیام کی ذمہ داری جوابدہ اور ایماندار پولیس فورس اور نوکر شاہی پر عائد ہوتی ہے۔ موجودہ وقت میں نوکر شاہی اور پولیس پر لوگوں کے اعتماد میں کمی آئی ہے۔ اس سلسلے میں متعدد رپورٹوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورتحال خراب ہو گئی ہے۔ پولیس اور سیاستدانوں یا نوکر شاہوں اور سیاستدانوں کے مابین ملی بھگت، نیچے سے اوپر تک بڑے پیمانے پر کرپشن کی موجودگی، مسلح دستوں کے غیر حساس یا ناکارہ ہونے، تربیت کی خراب صورتحال اور سائنٹفک جانچ تکنیکوں کے بجائے طاقت کے غلط استعمال پر انحصار کی بات ان رپورٹوں میں کہی گئی ہے۔ قانون کمیشن نے بھی بنیادی ڈھانچے میں موجود مختلف خامیوں کی جانچ کی ہے۔ اس کے علاوہ اصلاحات کی خاطر جو مختلف کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں ان کی رپورٹیں مسئلہ کے حل کا ایک وسیع نقطہ نظر پیش کرتی ہیں جن سے ایک بار پھر تجاویز کی تلخیص نکالی جاسکتی ہے۔ بد قسمتی سے یہ رپورٹیں مردہ ہو کر رہ گئی ہیں اور سفارشات لاگو نہیں کی گئی ہیں۔ پولیس اصلاحات کے سلسلے میں کچھ کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن پولیس محکمہ کی جانب سے بھی اسکی مخالفت کی جاتی رہی ہے اور مجرمانہ لوگوں کی جانب سے بھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ریاستیں ریاست اور مرکز کے باہمی تعلقات کے نتائج کے بارے میں بھی فکر مند ہیں۔

6 دسمبر 92 کے واقعات، حقائق اور حالات کی روشنی میں پولیس فورس اور نوکر شاہی کے رول کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ ایک دم واضح ہے کہ 21 ویں صدی میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اور نظام ناکام ثابت ہوا ہے اور انہوں نے انار کی پیدا کرنے میں تعاون دیا ہے۔ پولیس اور سیاست کے بیچ ملی بھگت کو ختم

کرنے کی ضرورت ہے۔ پولیس انتظامیہ میں عام آدمی کا اعتماد بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ ماہرین نے اس سلسلے میں کافی کچھ لکھا ہے اور خصوصی مشورے دیے ہیں یہ یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ ان اصلاحات کو فوری طور پر نافذ کیا جائے، سول سروسز اور پولیس فورس میں سیاسی اور مذہبی جانبداری انتہائی افسوسناک ہے، جو سول سروسز یا پولیس افسر سیاسی یا مذہبی رہنماؤں کے ساتھ کھلم کھلا رہتا ہے، ان سے قربت رکھتا ہے اور جو اس طرح اپنی ڈیوٹی انجام دیتا ہے، وہ اچھی انتظامیہ اور حکمرانی کے لیے ایک عذاب ہے۔

اس مسئلے کی جڑ ان لوگوں کی بھرتی کے طریقہ کار میں پنہاں ہے۔ سول سروسز کو سیاستدانوں یا مذہبی شخصیات کی سرپرستی لینا اور دینا خطرناک اور غیر اطمینان بخش ہے۔ ہر الیکشن کے بعد سول سروسز کا ان کی پریشانی کا بین ثبوت ہے جو ہمارے نظام کو متاثر کرتا ہے۔

اس لیے میری سفارش ہے کہ سول سروسز اور پولیس میں بھرتی کو واضح طور پر مضبوط کیا جانا چاہیے اور قابلیت، تجربہ اور تعلیم وغیرہ کی بنیاد پر ان کی بھرتی ہو، میں یہ سفارش بھی کرتا ہوں کہ سیاستدانوں، مذہبی رہنماؤں، نوکر شاہوں اور پولیس افسران کے مابین ملی بھگت اور ساز باز کو ختم کیا جانا چاہئے۔ سول سروسز کو سبکدوشی کے بعد ملنے والی مراعات سے محروم کیا جانا چاہئے، پولیس اور انتظامیہ کے کام کاج میں مداخلت کے غیر قانونی کام کو روکنے کے لیے ایک پالیسی شروع کی جانی چاہئے۔

فساد کنٹرول: فورس کی ضرورت

ہندوستان میں پولیس سروسز خاص طور پر ریاست کا موضوع ہے۔ وہی پولیس والے جو تھانوں میں تعینات رہتے ہیں اور جرائم کی تحقیقات کرتے ہیں اکثر وہی

بھیڑ کو قابو میں کرنے اور فسادات کو کنٹرول کرنے کے لیے ڈیوٹی پر تعینات کر دیے جاتے ہیں۔

ان فورسز کو دی گئی ٹریننگ اور ان کے ہتھیار نا کافی ہیں۔ بانس کے ڈنڈے اور پتلی سنڈیاں ان فورسز کو نیم تحفظ فراہم کرتی ہیں اور شرارتی عناصر کو بہت کم ڈرا پاتی ہیں، نقصان دہ طاقت کا استعمال صحیح مگر کم خطرناک طریقہ ہے جو موجودہ وقت میں خاص طور پر بڑی گولیاں یا آنسو گیس شامل کرنے کے حق میں ہیں، پولیس والوں کی ٹریننگ نا کافی ہے۔

ایک وقت میں سب کا رویہ ایک جیسا ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ فساد کنٹرول کرنے والے افسر کو سب کے درمیان سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کرنا چاہئے۔ فساد پولیس کو قابل اعتراض طریقوں کا سہارا لیے بغیر فسادات کو کنٹرول کرنے، ہتھیار ڈالوانے اور بھڑکے کو منتشر کرنے کے لیے اعلیٰ تربیت یافتہ ہونا چاہئے۔

یہ بات تکلیف دہ ہے کہ امن کے محافظ خطرے کا حصہ بن گئے اور شرارتی عناصر کے ساتھ ان کی ہمدردی تھی جس کی وجہ سے وہ حل تلاش کرنے کے بجائے مسئلے کا جزو بن گئے۔ پولیس میں اصلاحات ایک طویل عرصے سے عمل کی منتظر ہیں۔ تقریباً نصف صدی قبل سامراجی پولیس سروس کی جگہ پرائیوٹ پولیس سروس شروع ہوئی تھی، مگر نقطہ نظر اور طریقہ کار میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ میں ایک مرکزی فساد کنٹرول فورس کے قیام کی سفارش کرتا ہوں جو مرکز کے کنٹرول میں ہو اور بھڑکے پر قابو پانے کے لیے جدید ہتھیاروں سے لیس ہو۔ اس فورس کی تعیناتی مرکزی حکومت کے ذریعے اپنی دیکھ ریکھ میں کی جانی چاہئے۔ بھڑکے پر قابو پانے میں یا امن کے قیام میں جب ریاستی حکومت معذور ثابت ہو، تو ایک خاص علاقہ کا کنٹرول مرکز کے ذریعہ سنبھالنے، بھڑکے پر قابو پانے اور امن کے قیام کے لیے ایک

قانون وضع کیا جانا چاہئے، اس قانون میں اس کا ذکر ہو کہ مرکز کا فلاں خطے پر کنٹرول کتنی مدت کے لیے ہوگا اور پارلیمنٹ کے ذریعہ گہرے غور و خوض کے بعد یہ قانون بنایا جائے، اگر ایسا کوئی قانون ہو تو وہ صدر راج کے نفاذ یا اسمبلی کو تحلیل کئے جانے سے کم سخت ہوگا۔

(کمیشن نے مرکز ریاست تعلقات، مذہبی مقامات اور پولیس سے متعلق بھی کچھ تجاویز پیش کی ہیں۔)



لبراہن کمیشن نے بابرہی مسجد انہدام کے لیے جن افراد کو
قصور وار ٹھہرایا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے

وشوہندو پریشد اور آرائس ایس:

- 1- آچاریہ دھرمیندر دیو- دھرم سند
- 2- چاریہ گری راج کشور- وی ایچ پی
- 3- اشوک سنگھل- وی ایچ پی
- 4- بدری پرساد تو شنیوال- وی ایچ پی
- 5- بیکنٹھ لعل شرما- وی ایچ پی
- 6- بی پی سنگھل- وی ایچ پی
- 7- چمپت رائے- لوکل کنسٹرکشن منیجر
- 8- دیوراہا بابا- سنت سماج
- 9- مہنت نرتیہ گوپال داس- رام جنم بھومی نیاس
- 10- مہنت پرمنہس رام چندر داس- وی ایچ پی
- 11- اونکار بھاوے- وی ایچ پی
- 12- پروین تو گڑیا- وی ایچ پی
- 13- پُرشوتم نارائن سنگھ- وی ایچ پی
- 14- رام شکر گنی ہوتری- وی ایچ پی
- 15- رام ولاس ویدانتی- سنت سماج

- 16- سادھوی رتمبھرا-سنت سماج
- 17- سوامی چتمیانند-سنت سماج
- 18- سوامی ستمیت رام جی-سنت سماج
- 19- سوامی ستیانند جی-سنت سماج
- 20- سوامی دام دیو جی-سنت سماج
- 21- اوما بھارتی-وی اتچ پی
- 22- وشنوہری ڈالمیا-وی اتچ پی
- 23- ونے کٹیار-آ رالیں ایس
- 24- گرجن سنگھ-وی اتچ پی، آ رالیں ایس
- 25- ایس-گووند اچار یہ-آ رالیں ایس
- 26- اتچ-وی-شیشادری-آ رالیں ایس
- 27- کے-ایس-سدرشن-آ رالیں ایس
- 28- کوشا بھاؤ ٹھا کرے-آ رالیں ایس
- 29- راجندر سنگھ عرف رجو بھیا-آ رالیں ایس

سیاستداں:

- 30- اٹل بھاری واچپی-بی جے پی
- 31- بالا صاحب ٹھا کرے-شیو سینا
- 32- برہم دت دویدی-بی جے پی (ریونیونسٹر)
- 33- جی-ایم لودھا-بی جے پی
- 34- جے بھگوان گویل-شیو سینا
- 35- جے بھان سنگھ پوریا-بجرنگ دل

36- کلراج مشرا-بی جے پی

37- کلیان سنگھ-بی جے پی (چیف منسٹر، اتر پردیش)

38- لالہ جی ٹنڈن-بی جے پی (انرجی منسٹر، اتر پردیش)

39- لالو سنگھ چوہان-بی جے پی

40- ایل کے اڈوانی-بی جے پی

41- مہنت اویدیہ ناتھ-ہندو مہاسبھا

42- موریشور دینا ناتھ ساوے-شیو سینا

43- موروپنت پنگلے-شیو سینا

44- مرلی منوہر جوشی-بی جے پی

45- اوم پرتاپ سنگھ

46- پرمود مہاجن-بی جے پی

47- راجندر گپتا (منسٹر اتر پردیش)

48- شکر سنگھ واگھیلا-بی جے پی

49- ستیش پردھان-شیو سینا

50- شریش چندر دیکشت-بی جے پی

51- سیتارام اگر وال

52- سندر سنگھ بھنڈاری-بی جے پی

53- سوربہ پرتاب سنگھ (منسٹر اتر پردیش)

54- سوامی سچداند ساکشی (ساکشی جی مہاراج) بی جے پی

55- وجے را جے سندھیا-بی جے پی

56- یودھ ناتھ پانڈے-شیو سینا

57۔ داؤد یال کھنہ-بی جے پی

58۔ آر۔ کے۔ گپتا-بی جے پی، (فائننس منسٹر، اتر پردیش)

سرکاری افسران

59۔ اے۔ کے شرن (آئی جی سیکورٹی، اتر پردیش)

60۔ اکھلیش مہروترا (ایڈیشنل ایس، پی، فیض آباد)

61۔ اشوک سنہا (سیکورٹی، ٹورزم، اتر پردیش)

62۔ ڈی۔ بی۔ رائے (سینئر ایس، پی، فیض آباد)

63۔ پر بھات کمار (پرنسپل سیکورٹی، ہوم، اتر پردیش)

64۔ آر۔ این۔ شریواستو (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، فیض آباد)

64۔ ایس۔ پی۔ گور (کمشنر، اتر پردیش)

66۔ ایس۔ وی۔ ایم۔ ترپاٹھی (ڈائریکٹر جنرل آف پولیس یو، پی)

66۔ یو۔ پی۔ باجپئی (ڈپٹی انسپکٹر جنرل، فیض آباد)

67۔ وی۔ کے۔ سکسینہ (چیف سیکورٹی (یو، پی)



باب دوم

لبراهن کمیشن رپورٹ کا جائزہ

لبر اہن کمیشن رپورٹ نے سیاسی نظام کو بے نقاب کر دیا

کلدیپ نیر

جب بابر مسجد کے انہدام کے دوسرے دن میں نے اٹل بھاری واجپئی سے ان کا رد عمل جاننا چاہا تو انہوں نے یہ رائے زنی کی ”مندرو کو بنے دیں“ مجھے ان کے اس تبصرے پر حیرت ہوئی، کیوں کہ میں انھیں بھارتیہ جنتا پارٹی میں ایک اعتدال پسند طاقت تصور کرتا تھا۔

تاہم میں نے ان کے تبصرے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اب جب کہ منموہن سنگھ لبر اہن کی سربراہی میں مسجد کے انہدام سے متعلق ایک نفری کمیشن نے واجپئی کا نام مسجد منہدم کرنے والوں کے شریک کار کے طور پر لیا ہے، ان کے تبصرے کی حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ آخر ان کا رد عمل مختلف کیوں ہوتا، جب وہ مسجد کی مساماری کے ماہرانہ منصوبے میں ایک فریق تھے۔

یہ تو 6 دسمبر 1992 کو ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ایل کے اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی اس سازش میں شریک ہیں، اگر مجھے حیرت ہے تو واجپئی کے نام پر۔ اگر ان کی تقریر کا اخباری تراشہ میری نظر سے نہ گزرتا تو میں اس سے بے خبر ہی رہتا۔ ایک ٹیلی ویژن نیٹ ورک نے اسے، افشا شدہ رپورٹ کے دہلی کے ایک اخبار میں اشاعت کے دوسرے دن دکھایا تھا۔ مسجد کے انہدام کے ایک روز پہلے یعنی 5 دسمبر کو لکھنؤ میں واجپئی نے کہا تھا کہ زمین ہموار کر کے وہاں یکیہ کیا جائے گا۔

کمیشن نے کہا ہے کہ ”مسجد کی تباہی کو روکا جاسکتا تھا۔ اور یہ کام اڈوانی

کر سکتے تھے۔“ کمیشن کے الفاظ میں یہ سب بناوٹی اعتدال پسند، جو کچھ ہو رہا تھا اس سے بخوبی واقف تھے اور اس بد عملی سے بری الذمہ نہیں تھے۔

اس فرد جرم نے ہمارے سیاسی نظام کو بے نقاب کر دیا ہے، کیوں کہ یہ تینوں افراد ملک کے اعلیٰ منصبوں پر فائز رہے ہیں۔ واجپئی وزیراعظم، اڈوانی وزیر داخلہ اور جوشی ترقی انسانی وسائل کے وزیر رہے ہیں، اگر یہ تینوں بابرئ مسجد کے انہدام میں معاون رہے ہیں تو عہدے کا حلف لینے میں انہوں نے بددیانتی برتی، جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حلف لینے والا ملک کے اتحاد و سالمیت کے لیے کام کرے گا اور آئین کا پابند رہے گا، جس کی تمہید ہی سیکولرزم سے عبارت ہے۔ لہذا ہن کمیشن نے یہ کہا ہے کہ یہ تینوں ان 68 افراد میں شامل ہیں، جنہوں نے عداً ملک کو فرقہ وارانہ منافرت کی لگاری پر پہنچایا۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ ان تینوں نے سپریم کورٹ کے سابقہ حیثیت میں خلل نہ ڈالنے کے حکم نامے کے خلاف بھی اقدام کیا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے ملک کی عدلیہ اور آئین کا مذاق اڑایا، جس سے وفاداری کا عہد انہوں نے منصب سنبھالنے سے پہلے کیا تھا۔

سوال صرف قانونی نہیں، بلکہ اخلاقی اور سیاسی بھی ہے۔ مسجد کے منصوبہ بند انہدام اور واجپئی، اڈوانی اور جوشی کی منصب پر برقراری کا تال میل کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ایسا معاملہ ہے جس پر کم از کم مستقبل کی خاطر کوئی جواب تلاش کرنے کے لیے ملک کے عوام کو بحث کرنی چاہیے، جن کے ہاتھ پر جرم کے داغ لگے ہوئے ہیں، انہیں پارلیمنٹ کے تقدس کو آلودہ کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو حقائق کے سامنے آنے پر انہیں کیا سزا دی جائے؟ یہ سچ ہے کہ بی جے پی لوک سبھا انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آئی تھی۔ اگر کمیشن اپنی رپورٹ 1999 سے پہلے پیش کر دیتا، جب بی جے پی مخلوط حکومت کی قیادت کر

رہی تھی تو کیا اس پارٹی کو اتنی نشستیں مل پاتیں؟

یہ سوچا نہیں جاسکتا کہ کمیشن یہ کہے کہ گورنر کے حکم کے بغیر مرکز اتر پردیش کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک عذر لنگ ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ گورنر نئی دہلی میں زمام حکومت سنبھالنے والی کسی بھی پارٹی کی سہولت کے پیش نظر اپنے اختیارات میں رد و بدل کرتا ہے۔ گورنر وزیراعظم نرسمہا راؤ کی خواہش کے مطابق جنہیں وہ ہم وطن کے رشتے سے ذاتی طور پر جانتے تھے، انہیں رپورٹ کرنے کے پابند تھے۔

بصورت دیگر بھی مرکز آئین کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ راؤ مسجد گرائے جانے سے پہلے باسانی کارروائی کر سکتے تھے۔ صدر راج نافذ کرنے کا حکم دو ہفتے پہلے سے تیار تھا، کابینہ کی منظوری کا انتظار تھا۔ وزیراعظم نے اس سلسلے میں میٹنگ ہی نہیں بلائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کا انہدام ان کے ایما پر ہوا، اگرچہ راؤ نے اپنی کتاب میں اپنی پارٹی کے لوگوں کے دباؤ اور بروقت کارروائی نہ کرنے دینے کا ذکر کیا ہے۔ انہدام شروع ہوا تو وزیراعظم کے دفتر میں بے تحاشہ ٹیلی فون کالیں آنے لگیں تو کہا گیا کہ وہ پوجا میں مصروف ہیں اور انہدام کے اختتام تک ان کی مصروفیت جاری رہی، اس سے کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے؟

اگر کانگریس راؤ پر لگائے گئے الزامات کی تردید بھی کرنا چاہے تو پارٹی کو اس کی وجہ بتانی چاہیے کہ چند گھنٹے پہلے جہاں بابری مسجد تھی، وہاں دن کے اجالے میں مندر کیسے تعمیر ہو گیا۔ اس وقت مرکز کا پورا اختیار تھا، کیوں کہ صوبائی حکومت کی برطرفی کے بعد یوپی کو صدر راج کے تحت دے دیا گیا تھا۔ بہر حال بابری مسجد۔ راجم جنم بھومی تنازع ریاستی سرحدوں سے آگے نکل گیا تھا اور مرکز اس کے بعد کی تبدیلیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ راؤ کے رویے پر کمیشن کی خاموشی کا مقصد ان کی اور کانگریس پارٹی کی ملی بھگت پر پردہ ڈالنا ہے۔

ایک بات جس کی وضاحت لبراہن نے اپنی رپورٹ میں نہیں کی ہے، یہ ہے کہ ان کی تقرری اور تحقیق کے نتائج کی پیش کش کے درمیان 17 سال کا عرصہ کیسے لگا۔ اگرچہ انہوں نے تاخیر کے لیے کمیشن کے مشیر قانون کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، پھر بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تحقیقات میں اتنا لمبا عرصہ لگا ہوگا۔ اس کمیشن پر 8 کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں اور لوگوں کی رائے یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کام کو طول دیا ہے۔ مجھے توقع تھی کہ حکومت کی 'ایکشن ٹیکن رپورٹ' جامع اور بامعنی ہوگی، لیکن یہ بہت عام اور مبہم ہے اور یہ حیرت کی بات ہے کہ حکومت یہ کہے کہ کسی بھی شخص کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ قصورواروں میں سے بعض افراد کھلے عام یہ کہتے گھوم رہے ہیں کہ انہیں اپنے عمل پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ مسجد مسمار کرنے والے آزاد گھومتے رہے تو یہ المیہ ہوگا۔ وہ مسجد کی مسماری کے بعد 2000 افراد کے قتل کے بھی تو ذمہ دار ہیں۔

ملک کو کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ منافرت کا سامنا ہے۔ اس پر لبراہن کمیشن نے بجا طور پر روشنی ڈالی ہے۔ تکثیری معاشرے کے خواہش مند اور ہندو تو وادی ذہنوں کے فرق کو واضح کر دیا گیا ہے۔ بی جے پی اور اس سے بڑھ کر اس کے سرپرست آرائس ایس کا نظریہ کھل کر سامنے آ گیا ہے، لیکن بابر مسجد پر سیاست کھیلنے والے اس ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔

وزارت داخلہ میں چند ماہ پہلے رکھی گئی یہ رپورٹ کریدے جانے کی منتظر تھی۔ اس کا اختیار صحافیوں کو ہے۔ اس پر گفتگو کرنے کی بجائے کہ مسجد منہدم کرنے والوں کو سزا کیسے دی جائے، سیاسی پارٹیاں اس کی اشاعت کو مسئلہ کیوں بنا رہی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جب رپورٹ کے افشا ہونے کا معاملہ اٹھایا گیا تو تمام سیاسی جماعتیں بی جے پی کے دفاع میں نکل آئیں۔ اسے وقار کا مسئلہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ اصل مسئلے سے چشم پوشی کا ایک طریقہ ہے۔

نیم صداقت پر مبنی ایک سرکاری دستاویز

سید شہاب الدین
(سابق ممبر پارلیمنٹ)

1992 کے تشویشناک دنوں کی قومی لیڈر شپ پر مورخ یقیناً حقارت ہی کی نظر ڈالے گا، ایک وزیر اعظم جو یا تو بالکل ہی معصوم تھا یا پھر بالکل نا اہل و ناکارہ، اپنے دستوری و قانونی فرائض کی انجام دہی میں بہت ہی کم دلچسپی رکھنے والا۔ ایک اپوزیشن لیڈر جسے کم سے کم منافق ضرور کہا جاسکتا ہے۔ جس نے اپنی رتھ یا تراکے ذریعے ایک خاص تصور لوگوں کے ذہن نشین کیا اور انہیں ابھارا۔ ان میں تعصب بھڑکایا اور پھر 6 دسمبر کو اپنی زندگی کا بدترین دن قرار دیا۔ اس کا ایک سینئر ساتھی، جو نہ صرف مبہم اور گول مول انداز میں بات کرنے والا ہے بلکہ ذو معنی بات کرنے میں بھی ماہر ہے۔ ایک وزیر اعلیٰ جس نے جھوٹے حلف نامے رقم کیے۔ ایک سیاسی پارٹی جس نے قانون کی حکمرانی اور آئین و دستور کا درجہ گھٹانے کے لیے ایک تحریک منظم کر کے اپنی قسمت بنانے کی منصوبہ بندی کی۔ ایک حکومت جس کے وزراء بہ استثناء ایک قابل احترام وزیر کے بے ہمت و بے حوصلہ درباری بنے رہے۔ سیاسی پارٹیاں جو خود کو سیکولر کہتی ہیں، لیکن جو ڈرامہ کے پردہ اٹھنے کے وقت خاموش تماشائی بنی رہیں۔

شریعت کے مطابق کوئی غصب کی ہوئی یا ناجائز طور پر قبضہ کی ہوئی زمین پر مسجد تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ جب ایک بار مقدس قرار دی گئی کسی بھی طرح فروخت

کر کے، ٹھیکہ پردے کر یا تحفہ میں دے کر اپنے اس مقام سے محروم نہیں کی جاسکتی، حتیٰ کہ انہدام کے بعد بھی بابر مسجد، مسجد ہی ہے۔ کیونکہ مسجد اس جگہ کا نام ہوتا ہے جو زمین عبادت کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ مسجد پتھروں اور اینٹوں یا ڈھانچہ کا نام نہیں ہے اور جگہ کو تباہ نہیں کیا جاسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ملکیت کا سوال سپریم کورٹ کے آرڈر کے تحت الہ آباد ہائی کورٹ کی اپیل برائچ میں زیر غور ہے۔ فیصلہ کے بعد سپریم کورٹ کا پیش کردہ نقشہ عمل میں آئے گا۔ اس کے تحت ایک عبادت گاہ کو متنازعہ مقام پر وہ فریق تعمیر کرے گا جس کو ملکیت حاصل ہوگی۔ لیکن دوسرا فریق بھی پاس ہی ایکوا ر شدہ علاقہ میں ایک عبادت گاہ تعمیر کر سکتا ہے۔

جہاں مسلم طبقہ بار بار اپنے اس عہد کا اظہار کر چکا ہے کہ قطعی عدالتی فیصلہ کچھ بھی ہو وہ اس کو قبول کر لے گا وہیں سنگھ پر یوار اور اس کے ساتھیوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ فیصلہ کو اس صورت میں تسلیم کریں گے جب وہ ان کے حق میں ہوگا۔ اس موقف کو بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے تمام چوٹی کے لیڈر عملاً بار بار دہرا چکے ہیں۔ بد قسمتی سے مرکزی حکومت نے ابھی تک کوئی واضح موقف اختیار نہیں کیا ہے کہ دستور کے تحت اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں ہے سوائے اس کے جوڈیشیل فیصلہ کو تسلیم کر لے اور نقشہ پر عمل کرے۔

مسجد کے انہدام پر لبرالین رپورٹ نے مختصر الفاظ میں واضح طور پر سنگھ پر یوار کو مجرم قرار دے کر اسے مستوجب تعزیر گردانا ہے۔ اگرچہ وہ سنگھ پر یوار کے منظم کردہ اپیل انہدامی اسکوڈ کے ممبروں اور لیڈروں کی شناخت میں ناکام رہی ہے۔ جن کا تعلق آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور راجستھان سے ہے۔ رپورٹ نے رام جنم بھومی تحریک یا سنگھ پر یوار کے کچھ لیڈروں کو ذمہ دار قرار دیا ہے جو اجدھیا میں موجود تھے اور ان بیورو کریٹ افسروں کو جو فیض آباد اور اجدھیا میں تعینات تھے

اور اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں ناکام رہے۔

7 دسمبر 1992ء کو لکھی گئی دو رپورٹوں پر معمولی پیش رفت ہوئی ہے، جسکی وجہ حکومتوں کی تبدیلی ہے۔ ان دو کیسوں سے کسی نتیجہ کے برآمد ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے جو اسپیشل کورٹس میں لکھنؤ اور رائے بریلی میں زیر التوا ہیں۔ خواہ اب حکومت ان کو سماعت کی رفتار تیز کرانے اور دوسروں کے خلاف ممکنہ کیس کی تفتیش کے لیے راضی بھی کیوں نہ ہو جائے۔

رپورٹ انہدام کے سب سے بڑے ویلن، اس وقت کے وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ کو پوری طرح اور واضح طور پر بری الذمہ قرار دیتی ہے۔ اس فرد گزشتہ کا تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ رپورٹ میں ان کی تصویر صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی غلطیوں کا دفاع کیا گیا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم ان کے جرم پر بحث کریں کچھ باتیں کانگریس کے رول کے بارے میں بھی ضروری ہیں۔ اگرچہ اس نے نہ نرسمہا راؤ سے لا تعلقی کا اظہار کیا اور نہ ہی انہیں عہدہ سے ہٹایا جب کہ ایسا کیا جانا چاہیے تھا۔ اس نے انہیں 1996ء کے اگلے عام الیکشن میں پارٹی کا ٹکٹ دینے اور ان کو لیڈر شپ کا اعزاز دینے سے انکار کر دیا لیکن کانگریس کا رول 1994ء سے 1992ء تک مضحکہ خیز ہی رہا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ریاست میں کانگریس کا وزیراعلیٰ اور مرکز میں اس کا وزیراعظم رہتے ہوئے مسجد کی دسمبر 1949ء میں بے حرمتی کی گئی اور چوری چھپے اور خلاف قانون طریقہ سے اس میں بت رکھ دیے گئے۔ مرکزی حکومت کی ہدایتیں نظر انداز کر دی گئیں۔ مسجد کو مسلمانوں کی رسائی سے باہر کر دیا گیا اور بتوں کی سیوا کے لیے ایک پجاری کا تقرر کر دیا گیا۔ اس طرح موقف بدل کر ”قدیم مسجد“ کو ”عارضی مندر“ میں بدل دیا گیا۔ کریمنل کیسز 30 سال تک چیونٹی کی چال چلتے رہے، یہاں تک کہ 1986ء میں مسجد کے دروازے پبلک درشن کے لیے کھول

دیے گئے۔ اس طرح ”عارضی مندر“ کو عدلیہ سے تسلیم شدہ مندر میں بدل دیا گیا۔ یہ سب کچھ یکم فروری 1986 کو سیاسی طور پر ساز باز کر کے اور حکومت کی پشت پناہی سے ضلع جج کے آرڈر کے ذریعہ کرایا گیا، ساتھ ہی وشو ہندو پریشد کو اپنے مشن کے پروپیگنڈہ کی کھلی آزادی حاصل تھی۔ 1989ء میں ہائی کورٹ کے آرڈر کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے متنازعہ علاقہ میں مجوزہ مندر کا شیلانیاس کرایا گیا۔ مجوزہ مندر کے لیے تعمیراتی سامان تیار کرنے پتھروں کے ستون وغیرہ تراشنے کی غرض سے ایک ورکشاپ قائم کرنے کی بھی اجازت دی گئی جو کہ کھلی خلاف قانون حرکت تھی۔ اس سے بالواسطہ وابستگی سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی غرض سے اس وقت کے وزیراعظم راجیو گاندھی نے انتخابی مہم اجودھیا سے شروع کی۔ اس تاریخی پس منظر میں سارا الزام نرسمہا راؤ کے سر تھوپنا مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے صرف اپنی پارٹی کی روایات اور شاید اصل منشا پر عمل کرنے کی ہی کوشش کی تھی۔ لیکن 1992ء میں وہ وزیراعظم تھے اور انہوں نے مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کو بار بار یقین دلایا تھا کہ مسجد کو منہدم ہونے سے بچائیں گے اور پوری ذمہ داری نبھائیں گے۔

مسلمانوں کی درخواست کے باوجود انہوں نے بابر کی مسجد کو تاریخی اہمیت کی حامل قومی یادگار قرار نہیں دیا اور اس طرح اس کے تحفظ کی پوری ذمہ داری نہیں لی۔ نرسمہا راؤ نے اعلیٰ جنس بیورو کی روزانہ کی بریفنگ کو بھی نظر انداز کر دیا اور کسی دوسرے ذریعہ ڈیفنس اعلیٰ جنس وغیرہ سے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ انہوں نے دوسری پارٹیوں کی دی ہوئی وارننگ کو بھی نظر انداز کر دیا حالانکہ انہیں (بی جے پی کے علاوہ) تمام سیاسی پارٹیوں کی طرف سے بابر کی مسجد کو بچانے کے لیے نومبر 1992ء میں قومی یکجہتی کونسل میں کلی اختیارات دیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ آرٹیکل 356 سے کام لینے کا بھی اختیار دے دیا گیا تھا تاہم انہوں نے کوئی موثر اقدام نہیں کیا۔

نرسمہاراؤ نے داخلہ سکریٹری کے تیار کردہ کابینی نوٹ کو جس میں صدر راج نافذ کرنے کے لیے کہا گیا تھا، اطمینان کے ساتھ ایک طرف کو کھسکا دیا اور تشویشناک حالات میں بھی افریقہ کے دورہ پر چلے گئے۔

6 دسمبر 1992ء کو بھی بی جے پی اور وشو ہندو پیرشد کے لیڈروں کی موجودگی میں حملہ شروع ہو جانے کے بعد بھی جب وزیر اعلیٰ اور بی جے پی کے چوٹی کے لیڈروں کی طرف سے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کو کرائی گئی یقین دہانی لغو قرار پائی، انھوں نے وزیر اعلیٰ کو برخاست نہیں کیا۔ پہلے گنبد کے گرنے کے بعد بھی نہیں۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ کا استعفیٰ بھی منظور نہیں کیا جو ایک بجے دے دیا گیا تھا۔ انھوں نے تمام گنبدوں کے گر جانے کے بعد جب مسجد ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دی گئی تھی کابینہ کی میٹنگ بلائی اور تب صدر راج نافذ کیا۔

صدر راج نافذ کرنے کے بعد بھی انھوں نے سنٹرل پیرا ملٹری فورسز کو کارسیوکوں کو طاقت کے بل پر منتشر کرنے کا آرڈر دینے سے انکار کر دیا جو ملبہ کو ہموار کرنے اور ایک عارضی مندر تعمیر کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے بجائے یہ سب کچھ 36 گھنٹے تک کرنے دیا یہاں تک کہ وہ مکمل ہو گیا اور جو مورتیاں باہری مسجد سے ہٹائی گئی تھیں پھر سے نصب کر دی گئیں۔ اس طرح ایک نئی حقیقت کو جنم دے دیا گیا۔ نرسمہاراؤ نے عارضی مندر کے قانونی جواز کے سلسلے میں کبھی کوئی واضح موقف اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ جوڈیشیل آرڈر کی کھلی خلاف ورزی تھی۔

انجام کار راؤ مسجد کی از سر نو تعمیر کے اپنے وعدہ سے بھی مکر گئے، انھوں نے پارلیمنٹ کو یہ یقین دہانی کرانے سے بھی انکار کر دیا کہ ان کی حکومت فائنل جوڈیشیل آرڈر پر عمل کرے گی اور 1994ء کے روڈ میپ کو نافذ کر دے گی۔ انہدام سے قبل اس کے بعد اور خود انہدامی کارروائی کے دوران راؤ کا جو رویہ رہا، اس سے صرف یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وجہ کچھ بھی ہو وہ اس سازش کا حصہ تھے۔

مسجد کو منہدم کرنے والوں کے ساتھ ان کی ساز باز تھی۔ آریس ایس کے سربراہ دیورس اور بی جے پی کے لیڈ راڈوانی سے ان کا برابر رابطہ تھا اور ان سے ملی بھگت کر کے کام کر رہے تھے۔

تاریخ ایک دن اس بات کو ضرور ظاہر کر دے گی کہ نرسمہا راؤ اور سنگھ پر یوار کے درمیان کیا معاملہ تھا۔ آج بھی وشو ہندو پریشد کے لیڈ راشوک سنگھل کا بیان ہمارے سامنے ہے کہ راؤ ان کے مشن سے ہمدردی رکھتے تھے۔

لبراہن رپورٹ سماعتوں کی تکمیل کے بعد تیار ہو گئی تھی لیکن اس کا ڈرافٹ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں کے مشوروں سے زیر غور رہا تھا۔ یہ حقیقت اس امر سے ظاہر ہے کہ این ڈی اے اور یو پی اے دونوں حکومتوں نے اس کو 48 بار توسیع دی اور جسٹس لبراہن نے اپنی رپورٹ پیش کرنے میں ۱۷ سال لگائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے واجپئی کا نام راڈوانی کو پوری ذمہ داری سے بچانے کے لیے لیا۔ راؤ کو بچانے کے لیے انھوں نے صرف وہی بات دہرائی ہے جو اول الذکر اجودھیا سے متعلق اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے حالات و کوائف پر مبنی تمام شواہد کو نظر انداز کر دیا۔ جو صرف اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسباب کچھ بھی رہے ہوں نرسمہا راؤ یہی چاہتے تھے کہ مسجد منہدم ہو جائے۔ شاید انھوں نے سوچا ہو کہ مسجد منہدم ہو جائے گی تو مسلمان اس کو بھول جائیں گے اور وہ ہندو ووٹ حاصل کر سکیں گے۔

جسٹس لبراہن نے واجپئی، چندر شیکھر اور راؤ کے ساتھ فوتیدار جیسے کلیدی شاہدوں کو طلب نہیں کیا۔ انھوں نے کسی مسلم لیڈر کو بھی نہیں بلایا۔ حالانکہ بابر مسجد رابطہ کمیٹی اور آل انڈیا بابر مسجد ایکشن کمیٹی دونوں نے اپنے ایف ڈیوٹ جمع کیے تھے۔ بابر مسجد رابطہ کمیٹی کے کنوینر (سید شہاب الدین) رضا کارانہ طور پر کمیشن کے سامنے پیش ہوئے اور ان سے جرح بھی کی گئی لیکن اس کا کچھ بھی اظہار کیے بغیر

لبراہن نے پوری مسلم لیڈر شپ پر تنقید کی ہے اور اس کے خلاف الزام تراشی کی ہے۔ شاید ایسا سنگھ پر یوار کے خلاف برسنے کی وجہ سے مسلمانوں کی ”منہ بھرائی“ کے الزام سے بچنے کی غرض سے کیا ہو۔ انھوں نے مسلم لیڈر شپ کو توازن قائم کرنے کی غرض سے بدنام کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بابرہی مسجد تحریک نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کوئی فوج تیار کرے گی، نہ ہی اس نے مسلمانوں سے کارسیو کوں کے حملہ کا دفاع کرنے کے لیے کہا۔ نہ ان کے اجودھیا کی طرف کوچ کے وقت کوئی رکاوٹ پیدا کی اور نہ ہی اڈوانی کی رتھ یا ترا کو روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی مسلمانوں نے کسی مزاحمت کی کوشش کی۔

مسلم لیڈر شپ نے آئین پر اعتماد کا اظہار کیا اور پوری طرح اس وقت کی حکومت پر انحصار کیا جس کی مسجد کو بچانے کی پوری اور ناقابل انکار و تردید ذمہ داری تھی۔ اس پر ان عناصر کو جمع ہونے سے روکنے کی بھی ذمہ داری تھی جن کے دماغوں اور دلوں میں اور زبانوں پر ان کے جرائم طاری تھے۔

عوامی سطح پر مسلم لیڈر شپ نے کوئی بھی نامناسب زبان استعمال کرنے سے احتراز کیا۔ انھوں نے جب بھی رام کا نام لیا، عزت اور احترام کے ساتھ لیا، لیکن انھوں نے خاص مسجد کی ایک مربع انچ زمین بھی حوالے کرنے سے مستقل طور پر انکار کیا۔ ان سب کے باوجود یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آخر جسٹس لبراہن مسلمانوں سے کیا کرانا چاہتے تھے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ مسلمان قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے اور گلیوں میں اور سڑکوں پر آ کر لڑتے۔ لائینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کرتے اور یہ سب کچھ انھوں نے نہیں کیا۔ جسٹس لبراہن نے اپنی اس ریسرچ کے حق میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا کہ ”مسلمانوں کے عمل نے ہندوؤں کے دماغوں میں اندیشے پیدا کر دیے۔“

اندیشے کس بات کے؟

حکومت کی پیش کردہ ایکشن ٹیکن رپورٹ بھی ایک نکتہ کے علاوہ تمام پہلوؤں پر بے معنی ہے۔ صرف کچھ لوگوں کے خلاف جاری قانونی کارروائی میں توسیع کا امکان اور دوسروں کے خلاف کیسوں کی تفتیش۔ حالانکہ یہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ حیرت انگیز طور پر رپورٹ میں سپریم کورٹ کے اکتوبر 1994ء کے آرڈر یا روڈ میپ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے، نہ ہی سنگھ پر یوار اور مسلمانوں کے درمیان مزید گفتگو کے لیے کوئی متبادل فارمولا ہی پیش کیا ہے۔ بات چیت 1986 اور 1992ء کے درمیان بھی ہوتی رہی ہے اور اس کے بعد بھی۔ کچھ صحافی قیاس آرائی کر رہے ہیں کہ رپورٹ بی جے پی کو آرائس ایس کے مکمل کنٹرول سے آزاد ہونے میں مدد کرے گی اور بی جے پی کی غیر آرائس ایس لیڈر شپ کو واپس سامنے لاسکتی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ اڈوانی کو پھر سے سپریم کورٹ لیڈر کے طور پر ابھر کر آنے میں مدد کرے گی کیونکہ اگر حکومت نے آرائس ایس کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کر لیا تو صرف وہی دفاع کے لیے وقار اور تجربہ کے حامل ہیں۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں مگر آرائس ایس یا بی جے پی اب اجودھیا کے سوال کو پھر سے زندہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بھارت کا نقشہ 1992ء کے بعد سے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اور اب وہ دھارمک مقصد کے لیے عوامی حمایت حاصل کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں تصورات بدل چکے ہیں۔ جذبات و احساسات بدل چکے ہیں اور نئی جنریشن اور نڈل کلاس اگرچہ پہلے سے زیادہ فرقہ وارانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، دھرم کو اس طرح نہیں لیتے کہ سیاسیات پر غالب آجائیں یا ایک اور اجودھیا کا ڈرامہ رچ کر پوری قوم کو بدنام کر ڈالیں۔ مزید یہ کہ وہی سیاسی کارڈ پھر سے نہیں کھیلا جاسکتا۔ کانگریس مضبوط ہو کر سامنے آئی ہے اور ضرورت پڑنے پر ہندو ووٹوں کو اپنی

طرف مائل کرنے کے لیے وہ بھگوا سیاسیات کی راہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہے۔ بیورو کریسی اور دانشور طبقہ سنگھ پر یوار سے اس وقت دور ہو جائے گا، جب کانگریس بین الاقوامی ڈپلومیسی اور عالمی اقتصادیات کی اونچی میز پر سیٹ حاصل کر کے بھارت کے قومی جذبات کو اپنے حق میں کر لے گی۔ 17 سال بعد، گھٹیا، بے ربط اور بے ڈھنگے پن سے تیار کردہ رپورٹ کی آج کے حالات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور اس کا کوئی اعتبار بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ ہماری جمہوریت کو دھارمک حکومت بننے سے اب بھی بچا سکتی ہے۔ اگر حکومت کے پاس سیاسی قوت ارادی ہو اور جو لوگ مزید اجودھیا کھڑی کرنے کی تیاری کر رہے ہیں ان کے گھناؤنے منصوبوں سے ملک کو بچانے کے لیے مؤثر قدم اٹھانے کے لیے تیار رہو۔ بہر حال رپورٹ کی روشنی میں حکومت کو حسب ذیل اقدامات لازمی طور پر کرنے چاہئیں:

(1) آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل پر پابندی لگائے جو ملزم قرار دی جا چکی ہیں۔

(2) تمام انتہا پسند تنظیموں پر پابندی لگائے جو رضا کاروں کو ہتھیار استعمال کرنے اور قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی ہیں اور عملی طور پر ٹریننگ دیتی ہیں۔

(3) تمام جنگجو گروہوں، سیناؤں، دلوں اور واہنی وغیرہ پر پابندی لگائے۔

(4) الیکشن سے متعلق قانون میں ترمیم کرے، تاکہ ایسی سیاسی پارٹی کو منظور کرنے سے انکار کر دیا جائے جو آئین کے بنیادی تقاضوں کو چیلنج کرے یا سیکولر اسٹیٹ کو کسی خاص دھرم کی بالادستی پر مبنی تھیو کریٹک اسٹیٹ سے بدلنے یا ایک ہی دھارمک طبقے کے غلبے کی کوشش کرے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکومت کے پاس وہ قوت ارادی اور اہلیت و صلاحیت ہے؟

نرسمہاراؤ کا دفاع

لبراہن رپورٹ کا سب سے کمزور پہلو

پی سی الیگزینڈر

(سابق گورنر نرسمہاراؤ، مہاراشٹر)

میں سابق سول سروینٹ ہوں اور سیاستدانوں کے ساتھ کام کرنے کا میرے پاس خاصا تجربہ ہے۔ اس حیثیت سے میں بابرہ مسجد انہدام کی جانچ کرنے والی جسٹس ایم ایس لبراہن کمیشن کی رپورٹ کے سب سے ناقص اور کمزور پہلو کا جائزہ لینا چاہوں گا۔

میڈیا میں مرکزی حکومت کے طرف سے جو کچھ آیا ہے، وہ یہ ہے کہ اجودھیا میں کیا کچھ ہونے والا ہے، یہ اس وقت کی حکومت جانتی تھی جس وقت بابرہ مسجد کا انہدام ہوا تھا، مرکزی حکومت کو صدر راج نافذ کرنا چاہئے تھا لیکن وہ لاچار و بے بس رہی اور کوئی فیصلہ نہیں لے سکی۔

ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہئے کہ جسٹس لبراہن نے اپنے سامنے موجود شواہد و ثبوت کے ساتھ انصاف کیا ہے یا نہیں اور اگر کیا ہے تو کتنا۔ جسٹس لبراہن اس نتیجے پر کیوں پہنچے کہ مرکزی حکومت کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ ریاستی حکومت پر دباؤ ڈالے کہ وہ ان مرکزی فورسز کو استعمال کرے جو اسے فراہم کی گئی ہیں۔ اس نے اس کے بجائے اپنے اختیارات کا استعمال کیوں نہیں کیا۔ 6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا کی جو صورتحال تھی، ان میں اور دوسری ہنگامی صورتحال

میں مرکزی حکومت کو جو اختیارات حاصل ہیں ان کو اس نے استعمال کیوں نہیں کیا؟
اس کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

آئیے! ریاست میں صدر راج کے نفاذ کے سلسلے میں قانونی اور آئینی پوزیشن کا پہلے جائزہ لے لیتے ہیں، اگرچہ لائینڈ آرڈر کے قیام کی ذمہ داری ریاستی حکومت کی ہوتی ہے، تاہم آئین سازوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ایسی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے کہ ریاستی حکومت اپنی آئینی ذمہ داری ادا کرنے کی اہل نہ رہے یا اس پوزیشن ہی میں نہ رہے۔ ایسے ہنگامی حالات میں آئین نے مداخلت کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو وافر اختیارات دیے ہیں تاکہ وہ خود کو لاچار و بے بس محسوس نہ کرے۔

آئین نے تین قسم کے ہنگامی حالات کا ذکر کیا ہے۔

(1) جب جنگ کے ذریعے ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو یا بیرونی یورش ہو یا بغاوت ہو جائے۔ (دفعہ 352)

(2) جب ملک کے اقتصادی استحکام کو خطرہ لاحق ہو۔ (دفعہ 360)

(3) جب ریاست میں آئینی مشینری ناکام ہو جائے۔ (دفعہ 356)

اس بارے میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ بیرونی جارحیت یا اندرونی بغاوت سے ملک کی سلامتی کے تحفظ کی ذمہ داری مرکزی حکومت کی ہوتی ہے۔

دفعہ 356 صدر کو (بہ الفاظ دیگر مرکزی حکومت کو) یہ اختیار دیتی ہے کہ جب وہ یہ محسوس کرے کہ ریاستی حکومت آئینی ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام ہے، تو وہ مداخلت کر سکتا ہے۔ اس صورتحال میں صدر تمام وہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے جو ریاستی گورنر کو دیئے گئے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مرکزی حکومت نے سو سے زیادہ مواقع پر اس دفعہ کے تحت کارروائی کی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا 6 دسمبر 1992 کی صورتحال دفعہ 365 نافذ

کرنے کی متقاضی تھی۔ جی ہاں مرکزی حکومت کو مداخلت کرنی چاہئے تھی۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ مرکز کے فیصلہ سازوں نے براہ راست مداخلت کرنے کے اختیار کو استعمال نہیں کیا اور جھجک کا مظاہرہ کیا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اس معاملہ پر مرکزی کابینہ دو خیموں میں بٹی ہوئی تھی۔

اجودھیا میں انہدام سے چند ہفتے قبل ریاستی حکومت نے جو انتظامی اقدامات کئے تھے ان کی روشنی میں مرکز کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے تھا کہ اگر وہ دفعہ 356 کا استعمال نہیں کرے گی تو اس کی ہدایات محض مشورے ہی ہوں گے اور کچھ نہیں۔

یہاں تک کہ ریاستی حکومت کے ذریعے اضافی فورس بھیجنے کی درخواست کا انتظار کئے بغیر مرکزی حکومت نے بڑی تعداد میں نیم مسلح فورس بھیجی تھی اور اسے امید تھی کہ ان کو اجودھیا میں تعینات کیا جائے گا۔ تاہم اس وقت بھی مرکزی حکومت خود کو لاچار محسوس کرتی رہی، جب ریاستی حکومت نے ان کو اجودھیا میں تعینات کرنے کے بجائے دوسرے مقامات پر تعینات کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے اجودھیا اور قریبی مقامات پر اپنے بھروسے کے افسروں کو تعینات کیا۔ اور انہیکے اوپر امن و قانون کی برقراری کی ذمہ داری تھی۔

اس وقت مرکزی وزارت داخلہ میں ایک انتہائی قابل سکرٹری موجود تھے۔ آئی اے ایس آفیسر مادھو گوڈ بولے نے ریاست میں ہنگامی حالات کے پیش نظر ایک ایمر جنسی پلان اٹھار کیا تھا جسے کابینہ کی منظوری کے چند منٹ کے اندر نافذ کیا جاسکتا تھا اور ریاست میں صدر راج لگایا جاسکتا تھا۔ وہ وزیراعظم اور دیگر سینئر وزراء کے ساتھ میٹنگ کر کے ان کو یہ بتاتے رہے کہ اگر ریاست میں صدر راج نافذ کرنے میں تاخیر کی گئی تو اس کے بہت سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن مرکزی حکومت نے اپنے داخلہ سکرٹری کے مشورے پر کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اس وقت تک

خاموش رہی جب تک کہ اجودھیا میں سب کچھ ہو نہیں گیا۔
 اب میں ریاستی گورنر کے ان خطوط پر رائے زنی کرنا چاہتا ہوں جو صدر راج نافذ کرنے کے خلاف تھے۔ کسی بھی ریاست میں صدر راج نافذ کرنے کا معاملہ ایسا ہے کہ اس بارے میں آئین نے مرکزی حکومت کو مکمل اختیارات دیے ہیں۔ ایسے اقدامات کے لیے گورنر کی سفارشات کی کوئی ناگزیریت نہیں ہوتی۔ آئین نے بہت واضح انداز میں کہا ہے کہ مرکزی حکومت ریاستی گورنر کی سفارش کے بغیر بھی صدر راج نافذ کر سکتی ہے۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یوپی کے گورنر کو ریاست کی صورتحال کا علم مرکزی حکومت یا کابینہ سے کہیں بہتر انداز میں رہا ہوگا۔ اور گورنر نے اس صورتحال سے مرکز کو آگاہ کیا ہوگا۔ تاہم لبر اہن کمیشن نے اس خط کو دفعہ 356 نافذ نہ کرنے کا ایک بہانہ بنا کر اپنا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ مرکزی حکومت نے بھی اس خط کی آڑ میں اس وقت تک کوئی کارروائی نہیں کی جب تک کہ کلیان حکومت نے استعفی نہیں دے دیا۔

در اصل مرکزی حکومت کی نام نہاد بے بسی اور لا چاری اس وجہ سے تھی کہ وہ یوپی کی صورتحال کے تناظر میں اپنی اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کو تیار نہیں تھی۔ جسٹس ایم ایس لبر اہن نے مرکزی حکومت کے اس قدم کی توثیق کی ہے لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ لبر اہن رپورٹ کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے۔



نرسمہاراؤ کو بچانے کے لیے جسٹس لبراہن کا عذر لنگ

محفوظ الرحمن

لبراہن کمیشن نے اپنی ضخیم رپورٹ میں دوسری چیزوں کے علاوہ کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت کے وزیراعظم نرسمہاراؤ کے چہرے سے بابرئ مسجد کے انہدام کی کالکھ بھی صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش کے گورنر ستیہ نرائن ریڈی نے ریاست میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا مشورہ دے کر نرسمہاراؤ کے ہاتھ عملاً باندھ دیئے تھے۔ علاوہ ازیں کلیان سنگھ نے قومی یکجہتی کونسل اور سپریم کورٹ کو بابرئ مسجد کی بہر قیمت تحفظ کی جو یقین دہانی کرائی تھی وہ بھی صدر راج کے حوالہ سے کوئی فیصلہ کرنے میں مانع بن رہی تھی۔

وزیراعظم نرسمہاراؤ نے بھی مارچ 1995 میں جمشید پور میں ایک انتخابی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے بابرئ مسجد کے انہدام سے قبل صدر راج نافذ نہ کرنے کی مجبوری کا تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے گورنر ستیہ نرائن ریڈی کے اس خط کا حوالہ دیا تھا، جس میں ریاست میں صدر راج نافذ نہ کرنے کی پرزور وکالت کی گئی تھی۔ ریڈی نے اپنے خط میں لکھا تھا ”میری رائے میں حکومت اتر پردیش کی برخاستگی جیسا سخت قدم اٹھانے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو اس کے بہت دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ریاست اتر پردیش، بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بڑے پیمانے پر تشدد کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ جلد بازی

میں کوئی قدم اٹھانے سے بچا جانا چاہئے۔“ لبراہن کمیشن نے نرسمہاراؤ کو اس ”مجبوری“ کی بنیاد پر بابری مسجد کے انہدام کے الزام سے بڑی حد تک بری قرار دے دیا ہے۔ انھوں نے غالباً اس مسئلے پر اس پہلو سے غور نہیں کیا کہ اگر گورنر کے رول، اس کے رویہ اس کی سفارش اور اس کے مشورہ کو ہی فیصلہ کن قرار دے دیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کسی ریاست میں صدر راج کے نفاذ کا فیصلہ مرکزی حکومت کی بجائے اس ریاست کا گورنر ہی کرتا ہے۔ نرسمہاراؤ کا یہ کہنا کہ اتر پردیش میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا مشورہ دے کر گورنر نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے تھے عملاً اس بات ہی کی طرف اشارہ کرتا نظر آتا ہے کہ گورنر نہ چاہے تو کسی ریاست میں صدر راج نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جسٹس لبراہن نے آنکھ بند کر کے اس عذر لنگ پر جواز کی مہر ثبت کر دی۔ انھوں نے اس بات کی شمع برابر بھی پروا نہیں کی کہ آئین اس طرح کی کسی دلیل کو، کسی عذر کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔

آئین کی دفعہ 356 کی رو سے صدر راج کے نفاذ کا فیصلہ صدر جمہوریہ مرکزی حکومت کے مشورہ سے کرتا ہے اور اس اقدام کے لئے جو بنیادی شرط بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ صدر جمہوریہ کو نجی طور پر اس بات کا اطمینان ہونا چاہئے کہ وہ جو قدم اٹھانے جا رہا ہے اس کا جواز ہے اور اس کے بغیر آئین کی عمل داری ممکن نہیں ہے۔ گورنر کی رپورٹ تو اس اطمینان کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ صدر جمہوریہ یا دوسرے لفظوں میں مرکزی حکومت گورنر کے مشورہ یا اس کی سفارش پر عمل کرنے کی پابند نہیں ہے، وہ اپنے مجوزہ اقدام کے لئے نجی اطمینان دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اسے غایت درجہ کی سادہ لوحی، آئین و قانون سے عدم واقفیت یا آئین کی من مانی تشریح و تعبیر نہیں تو اور کیا کہا جائے گا کہ جسٹس لبراہن نے دفعہ 356 کو گورنر کی سفارش یا اس کے مشورہ تک محدود کر کے رکھ دیا۔ جسٹس لبراہن نے نرسمہاراؤ کے چہرے کی کالکھ دھونے

کے لئے دفعہ 356 کو جو معنی پہنائے ہیں، اس کی توقع کسی ایسے شخص سے بہر حال نہیں کی جاسکتی جو ہائی کورٹ کا جج رہ چکا ہو اور جسے بابرئ مسجد کے سانحہ کی چھان بین کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔

سوال یہ ہے کہ جب پوری فضا نو بہ نو اندیشوں سے بری طرح بوجھل تھی، سنگھ پر یوار کے سوا دوسری تمام پارٹیوں کے لیڈر ہی نہیں، بلکہ بہت سے ممتاز صحافی، دانشور، سماجی کارکن اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے بہت سے لوگ بھی اتر پردیش میں صدر راج کے نفاذ کا پرزور مطالبہ کر رہے تھے تو راؤ صاحب نے ستیہ نرائن ریڈی کے ایک مجہول سے خط پر بھروسہ کیوں کر لیا؟ اسی سے جڑا یہ سوال بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ ریڈی سے باضابطہ طور پر رپورٹ کیوں نہیں طلب کی گئی؟ وزیراعظم نے جس خط کا تذکرہ کیا ہے اور کمیشن نے بھی جس کی اہمیت تسلیم کی ہے وہ کسی بھی صورت میں باضابطہ رپورٹ کا بدل نہیں بن سکتا تھا کیوں کہ اس میں ریاست کی صورت حال کے ٹھوس تجزیہ کی بجائے پورا زور یہ باور کرانے پر صرف کیا گیا تھا کہ کلیان سنگھ حکومت کو برطرف کرنے پر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی فتنہ و فساد کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ ستیہ نرائن ریڈی کا یہ اندیشہ کتنا بے بنیاد تھا اس کا اندازہ ایک نہیں بی جے پی کی تین تین ریاستوں ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش اور راجستھان کی حکومتوں کو بہ یک وقت برطرف کر دینے کے بعد جو کچھ ہوا اس سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں بابرئ مسجد کا انہدام نہ تو کوئی اچانک رونما ہونے والا اتفاقی حادثہ تھا نہ کوئی ایسا سانحہ جس سے خاص کر وہ لوگ جو مسند اقتدار پر قابض تھے لاعلم رہے ہوں گے۔ اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس کی آہٹ وہ سب لوگ سن رہے تھے جنہوں نے اپنے کان بند نہیں کر رکھے تھے۔ وزیراعظم نرسمہا راؤ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جو وعدہ شکن گروہ سپریم کورٹ تک کے احکامات کو نظر

انداز کر کے متنازع زمین پر انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ چبوترہ بنا سکتا تھا وہ تمام تر یقین دہانیوں کو پس پشت ڈال کر بابرؒی مسجد کو منہدم بھی کر سکتا تھا۔ اس بھیانک واقعہ کے منصوبہ بند ہونے کی بات لبرائن کمیشن نے بھی مانی ہے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ یہ منصوبہ تمام تر جزئیات کو سامنے رکھ کر پوری تندہی کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ 6 دسمبر کو بابرؒی مسجد مسمار کر دی جائے گی اس کا اندیشہ ان کی کابینہ کے بہت سے ارکان کو بھی تھا اور ان میں سے کچھ نے برملا اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ مثال کے طور پر ارجن سنگھ نے بابرؒی مسجد کے انہدام سے دو دن قبل 4 دسمبر ہی کو داخلہ سکریٹری گوڈبولے سے کہہ دیا تھا کہ مسجد منہدم کر دی جائے گی اور بہتر ہوگا کہ اس موقع پر حکومت کی طرف سے جاری کئے جانے والے بیان کا مسودہ وہ پہلے ہی تیار کر لیں۔ ارجن سنگھ کے اس اندیشہ کی تائید اس وقت کے ایک اور سنیر مرکزی وزیر ایم ایل فوٹیدار نے بھی کی تھی۔ فوٹیدار نے اپنے ایک تحریری بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے وزیراعظم نرسمہا راؤ کو 3 دسمبر کو ہی دو ٹوک لفظوں میں بتا دیا تھا کہ بابرؒی مسجد کے لئے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ معروف سیاسی شخصیت اور صحافی پروفیسر بھیم سنگھ نے بھی 3 دسمبر کو وزیراعظم سے ملاقات کر کے انہیں بتا دیا تھا کہ ان کی اطلاع کے مطابق بالا صاحب دیورس، اڈوانی، کلیان سنگھ وغیرہ نے بابرؒی مسجد کو مسمار کرنے کے منصوبہ کو آخری شکل دے دی ہے۔ حکومت کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ مسلم مجلس اتر پردیش کے ایک وفد نے وزیراعظم سے ملاقات کر کے انہیں ایک میمورنڈم پیش کیا تھا، جس میں دوسری چیزوں کے علاوہ یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ حکومت بابرؒی مسجد کو بچانے کے لئے ضروری اقدامات کرے۔ سنگھ پر یوار کے لیڈروں کی یقین دہانیوں پر بھروسہ کرنا انتہائی خطرناک نتائج کا حامل بن سکتا ہے۔

ان انتباہات اور خدشات کی تصدیق متواتر شائع ہونے والی چشم دید اخباری رپورٹوں سے بھی ہو رہی تھی۔ مرکزی خفیہ ادارے بھی تشدد اور غنڈہ گردی کے روز

افزوں بھیانک واقعات اور بی جے پی کے لیڈروں کے انتہائی جارحانہ بیانات سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ بھی نرسمہاراؤ کو اپنی رپورٹیں بھیج رہے تھے، لیکن نرسمہاراؤ نے کچھ نہ سننے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ یہ مان کر چل رہے تھے کہ اتر پردیش کے گورنر ستیہ نرائن ریڈی نے جو کچھ کہا ہے وہی سچ ہے۔ انہوں نے دوسروں کے مقابلے میں جن میں ان کی کابینہ کے سنیر وزراء بھی شامل تھے ستیہ نرائن ریڈی کو صرف اس لئے ترجیح دی کہ وہ جو مشورہ دے رہے تھے عملاً وزیراعظم اور وزیر داخلہ کی سوچ کا محور بھی وہی تھا۔ یہ لوگ بھی کلیان سنگھ حکومت کو بہر صورت بنائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ بابرئ مسجد کے انہدام کے منصوبہ کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔

ستیہ نرائن ریڈی فی الواقع نرسمہاراؤ کے کھیل کو ہی آگے بڑھا رہے تھے۔ انہوں نے وزیراعظم کو جو خط لکھا تھا اس کی ایک ایک سطر اس بات کی غماز ہے کہ وہ بوجہ حکومت اتر پردیش کے عزائم پر پردہ ڈالنا اور عام لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے اور انہیں ان کی اس خدمت جلیلہ کا صلہ نرسمہاراؤ کے ہاتھوں ایک اور ٹرم کی صورت میں ملا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بابرئ مسجد کے انہدام کے منصوبے پر عمل درآمد اور بعد ازاں صدر راج کے نفاذ کے دوران مسجد کے بلے پر عارضی مندر کی تعمیر کے خواب کی تعبیر ریڈی کے تعاون سے ہی تلاش کی جاسکتی تھی۔ یہ خواب سنگھ پر یوار کا بھی تھا اور نرسمہاراؤ اور ریڈی کا بھی۔ چنانچہ ستیہ نرائن ریڈی کا نرسمہاراؤ کو خط لکھ کر اتر پردیش میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا مشورہ دینا اور نرسمہاراؤ کا اس مشورہ کو پتھر کی لکیر بنالینا تو سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن جسٹس لبراہن نے بہت دور جا کر اس خط میں نرسمہاراؤ کی مجبوری تلاش کرنے کی کوشش، یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ ان کے اس عمل کی توجیہ آئین و قانون کے حوالے سے تو بہر حال نہیں کی جاسکتی ہے۔

6 دسمبر 1992

ہندستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن

موہن چراغی (سابق مدی قومی آواز دہلی)

1992 میں ۶ دسمبر کا دن ملک کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ اس روز بھارت ماتا کی جئے کانعرہ بلند کرنے والوں نے اجودھیا میں ایسا ہیجانی رقص پیش کیا کہ ۱۷ برس گزر جانے کے بعد بھی اس سے لگے شدید زخموں کے بند کھلے ہوئے ہیں۔ ۱۷ برس قبل سنگھ پر یوار نے پارلیمنٹ، سپریم کورٹ اور قومی یکجہتی کونسل کو وشواس دلایا تھا کہ بھگوان رام کا مندر تعمیر کرنے کے لیے وہ بابری مسجد کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ حالانکہ سابق وزیراعظم مہاشے اٹل بہاری واجپئی، رتھ بان ایل کے آڈوانی، سادھوی اوما بھارتی، پروفیسر مرلی منوہر جوشی، آرایس ایس کے سورما اور دیگر سنگھی ذہنیت کے ہندو دہشت گرد خاموشی کے ساتھ بابری مسجد کو توڑنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

میں جب 1980 میں کشمیر چھوڑ کر دہلی آیا تھا تو رام جنم بھومی بابری مسجد کے تنازعے سے عام کشمیری بے خبر تھا۔ کشمیر میں کئی مندر اور مساجد صدیوں سے ایک ساتھ کھڑی تھیں۔ مسجد میں اذان ہوتی تھی تو مندر میں شنکھ بجاتا تھا۔ نہ مؤذن کو شنکھ سے کوئی اذیت پہنچتی تھی، نہ مندر کے پجاری اذان کی آواز پر بھڑکتے تھے۔ دونوں عبادت گاہوں میں ہندو اور مسلمان عورتیں دعا مانگتیں رہتی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت دھچکہ لگا جب بابری مسجد رام مندر کے تنازعے پر سنگھی ہندوؤں اور شدت پسند مسلمانوں کی جنگجو یا نہ صف بندی دیکھی۔ ایل کے آڈوانی رتھ یا ترا کے دوران ایسا

تاثر دیتے تھے جیسے کہ بھگوان رام کے جنم لینے کے وقت وہ اجودھیا میں موجود تھے۔ اسی دوران ہندستان میں فرقہ وارانہ رجحانات تیزی کے ساتھ سیاسی اور سماجی زندگی پر چھا رہے تھے۔ سنگھی ذہنیت کے اقلیت مخالف ہندو شدت پسند اور شدت پسند چند نام نہاد مسلم لیڈران، جنہیں نہ تو رام مندر تعمیر کرنے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی بابری مسجد کا تحفظ کرنے سے، ہندوؤں اور مسلمان شدت پسندوں کے سیاسی وکاندار تھے اور اجودھیا میں رام مندر اور بابری مسجد کے نام پر منافع بخش کاروبار کر رہے تھے۔ لبرالین کمیشن کی اس طرف توجہ تو رہی ہے البتہ اس نے گہرائی میں اس بات کا جائزہ نہیں لیا کہ رام جنم بھومی تحریک کا، جس کو ایل کے اڈوانی اور سنگھ پر یوار نے اقلیتوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی تحریک میں بدل دیا تھا، توڑ کرنے کے لیے سیکولر پارٹیوں پر فالج کیوں گر گیا تھا۔ سوشلسٹ لیڈر ملائم سنگھ یادو جو بار بار مسلمانوں کو یقین دلاتے رہتے تھے کہ سماج وادی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کی لاشوں کو روند کر ہی سنگھ پر یوار مسجد کو نقصان پہنچا سکتا ہے کمیونسٹ پارٹیاں بھی خاموش تھیں کیونکہ مارکس اور لینن نے اپنے فلسفہ میں بابری مسجد اور رام مندر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وزیراعظم نرسمہا راؤ ہندوستانی سیاست کے چانکیہ کی دانشمندی پر بھروسہ کرتے ہوئے کانگریسیوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جبکہ نرسمہا راؤ اس وقت تک کلیان سنگھ اور سنگھ پر یوار کی یقین دہانیوں کا ڈھول بجاتے رہے جب تک کہ بابری مسجد کو زمین بوس کرنے کا جنگجو یا نہ عمل جاری رہا۔

تھوڑا اور پیچھے چلتے ہیں۔ ملک میں رتھ یاترا اور بابری مسجد کے عاشقوں کے درمیان جاری ٹکراؤ کے نتیجے میں فرقہ وارانہ رجحانات تیزی کے ساتھ سیاسی اور سماجی زندگی پر چھا رہے تھے۔ عام انتخابات ہونے والے تھے کہ راجیو گاندھی نے اپنی رہائش گاہ پر اردو ایڈیٹروں کے ساتھ فرقہ وارانہ صورت حال پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے ان کی ایک میٹنگ بلائی۔ انہوں نے میٹنگ میں اردو ایڈیٹروں کے ساتھ فرقہ وارانہ

صورت حال اور اس کا توڑ کرنے کے لیے اردو ایڈیٹروں کو کھل کر اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی۔ اس میٹنگ میں صرف میں ہی ایک غیر مسلم ایڈیٹر تھا۔ اردو ایڈیٹروں نے، جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ ملت کی آواز ہیں، زوردار الفاظ میں شکایت کی کہ مسلمانوں کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے زمین کے الاٹمنٹ کرنے کی درخواست اور اس پر حکومت کی سردمہری کی شکایت کی تو راجیو گاندھی کو مایوسی ہوئی۔ وہ فرقہ وارانہ ٹکراؤ کا توڑ کرنے کے لیے صلاح و مشورہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان ایڈیٹروں نے نجی کاروبار کا مسئلہ چھیڑ کر بحث و مباحثہ کے بنیادی موضوع سے توجہ ہٹا دی۔ اس پر راجیو گاندھی کو مجبور ہو کر اس بے معنی بحث کو بند کرنے کے لیے ہائی ٹی کی میز کی طرف مایوسی کی توجہ مبذول کرنی پڑی۔

راجیو گاندھی کے قتل کے بعد وزیراعظم نرسمہا راؤ نے بھی اپنی رہائش گاہ پر اردو ایڈیٹروں کی ایک میٹنگ اسی مقصد کے لئے بلائی۔ اس میں بھی میں واحد غیر مسلم ایڈیٹر تھا۔ اس میٹنگ میں بھی صورت حال پر سنجیدہ غور کرنے کے بجائے جذباتی بحث شروع ہو گئی۔ نرسمہا راؤ نے مجھ سے پوچھا آپ خاموش کیوں ہیں؟ میں نے کہا کہ جن اخباروں نے بابری مسجد کو مسلمانوں کے تشخص کی علامت قرار دے کر مسجد کے لیے شدید نفرت پیدا کی ان کے ساتھ ہی آپ مشورہ کر رہے ہیں، اس لیے میں خاموش ہوں۔ شور شرابہ ہونے لگا اور نرسمہا راؤ نے اردو اخبارات کے گرتے معیار کا شکوہ کرتے ہوئے ایڈیٹروں کو ڈائمنگ ٹیبل کی طرف رخ کرنے کی دعوت دی اور اس طرح شور شرابہ ختم ہوا۔ ایک طرف سنگھی ذہنیت کے ہندو عناصر مورچہ سنبھال رہے تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کے نام پر تھوک اور پرچون کی دکانیں کھل رہی تھیں۔ ایک بار لیش نو جوان نے بابری مسجد کے نام پر زبردست پروپیگنڈا جنگ شروع کی تھی۔ اس بار لیش نو جوان کی کسی نہ کسی اردو اخبار کے دفتر میں شام گزرتی تھی اور بدست ہو کر وہ اخبار کے دفتر میں ہی سو جاتا تھا۔ جس روز بابری

مسجد کوزمین بوس کیا گیا میں ڈیسک پر کام کر رہا تھا کہ پریس ریلیزوں کی بارش شروع ہو گئی۔ 'بابری مسجد بچاؤ' دکان کا پریس نوٹ لے کر سیلز مین آیا اور پریس نوٹ میز پر رکھا۔ مجھے اس وقت زبردست شاک لگ گیا جب یہ دیکھا کہ بابری مسجد بچاؤ کا سائن بورڈ ٹوٹ چکا ہے اور اس کے بجائے بابری مسجد تعمیر نو کی دکان کھل گئی ہے۔ پریس نوٹ سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس دکان کے مالک کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ بابری مسجد کوزمین بوس کیا جائے گا اس لیے اس نے پہلے ہی بابری مسجد تعمیر نو کمیٹی کا لیٹر پیڈ شائع کر لیا تھا۔ دکانیں اور بھی تھیں جنہوں نے اجودھیا میں بابری مسجد کو مسلمانوں کے تشخص کی علامت قرار دے کر مہابھارت شروع کی تھی۔

دوسری طرف ایل کے ڈوانی ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر رام مندر تحریک کو عوامی کردار دینے کے لیے سڑکوں پر رتھ یا ترا کے ذریعہ ماحول گرم کر رہے تھے۔ جس روز بابری مسجد کوزمین بوس کیا گیا سب سیکولر مہارتھی اجودھیا تو دور کی بات ہے لکھنؤ میں بھی موجود نہیں تھے۔ بابری مسجد کو گرانے کے فوراً بعد مرکزی سرکار نے اس سانحہ کی گہرائی میں تحقیقات کرنے کے لیے لبراہن کمیشن مقرر کیا جس نے اس سال کروڑوں روپے خرچ کر کے ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ مرکزی سرکار کو پیش کی ہے۔

لبراہن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کوئی ایسا چونکا دینے والا انکشاف نہیں کیا ہے جس سے ہندوستانی عوام واقف نہیں تھے۔ وزیراعظم سمیت ہر ایک کو معلوم تھا کہ سنگھی دہشت گردوں نے بابری مسجد کو توڑنے، جس کو وہ غلامی کی علامت قرار دیتے تھے، اور زمین بوس کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ لیکن وہ ووٹ بنک سیاست اور مصلحت کوشی کی وجہ سے سنگھی دہشت گردوں پر مکمل بھروسہ کیے ہوئے تھے۔ لبراہن کمیشن نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ سنگھ پر یوار نے ملک کے سیکولر

معاشرے کو تہس نہس کرنے کے لیے بابرؒ مسجد کو توڑنے کی سازش کی اور اس سازش میں یوپی سرکار کے اعلیٰ افسران بھی ملوث تھے۔ گولبراہن کمیشن نے ۶۸ سنگھی دہشت گردوں کو نامزد کیا ہے لیکن ان کے خلاف کسی طرح کی سخت کارروائی کی جائے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ لبراہن کمیشن نے یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کے مشکوک رول کا بھی نوٹس نہیں لیا ہے جبکہ ملائم سنگھ یادو نے بابرؒ مسجد کو زمین بوس کرنے کے کئی برس بعد اسی کلیان سنگھ کے ساتھ متحدہ محاذ بنایا جس نے بحیثیت وزیر اعلیٰ بابرؒ مسجد کو زمین بوس کرنے کے لیے لشکر تیار کیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹیاں بھی ۷۱ برس خاموش رہیں کیونکہ بقول ان کے وہ فروغی معاملات پر جن کا تعلق ورکنگ کلاس سے نہیں ہے، وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ لبراہن کمیشن نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جو رپورٹ پیش کی ہے وہ صرف زخموں کے منہ چوڑے کر سکتی ہے زخموں کو بھر نہیں سکتی۔

میں 7 دسمبر 1992 سے 31 دسمبر 1992 تک انصاف پسند عوام کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے کے لئے قومی آواز کے صفحہ اول پر مضامین لکھتا رہا۔ ان مضامین کے بعض اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے

کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

اجودھیا میں رام مندر تعمیر ہو گا یا نہیں یہ فیصلہ وقت ہی کرے گا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کا ہر قدم ہندوستان کی دھرتی پر ایسے کاری زخم لگا رہا ہے جن سے برسوں تک خون اور پیپ رستار ہے گا اور مرہم لگانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ یہ زخم کیوں لگ رہے ہیں اس پر یہاں کے مسلمانوں کو سوچنا نہیں ہے۔ یہ کام یہاں کی ہندو اکثریت کا ہے جس کو یہ غور کرنا ہو گا کہ رام مندر کی

تعمیر سے اگر رام کو پوجنے والوں کا سر نیچا ہوگا تو کیا وہ رام کو پوجنے کے مستحق ہوں گے۔ رام ہندوستان کی تہذیب ہے اور جب تہذیب ہی مٹ جائے تو رام کی عظمت ہی مٹ جائے گی اور اس عظمت کا تحفظ کرنا مسلمانوں کا نہیں ہندوؤں کا کام ہے اور ہندو فرقہ ہے کہ بے حس ہے۔ بے رام جی کا نعرہ بلند کر کے اگر کوئی ہندو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے حساس ہونے کا ثبوت دیا ہے تو وہ اپنے آپ سے، اپنے مذہب سے اور اپنے ملک سے غداری کر رہا ہے۔ مارگ در شک منڈل کے 110 ممبروں نے فیصلہ کیا کہ کارسیوا شروع ہوگی اور رام مندر تعمیر ہوگا۔ کیا مارگ در شک منڈل کے 10 ممبر ہندو فرقہ کے واحد نمائندے ہیں یا پھر یہ 110 ممبر کسی ایسی طاقت کے زرخیز نمائندے ہیں جو ہندوستان کو کمزور کرنے کی 1947ء کے بعد ہی سے سازشیں کرتی رہی ہے۔ کارسیوا سے کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے ہندو فرقہ کو یا ہندو فرقہ کو بدنام کر کے ان پر فسطائیت کا کلنگ لگانے والوں کو۔ بزورِ شمشیر اور نفرت کے ابلتے لاوے کی حرارت سے رام مندر کی تعمیر کرنے سے کس کو ذہنی سکون ملے گا؟ ہندو فرقہ کو یا ان عناصر کو جو ہندوستان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔

مذہب کی افیون کھلا کر ان لاکھوں ہندوستانیوں کو، جنہیں کارسیوا کے نام پر اجودھیا میں اکٹھا کیا گیا ہے، بے حس کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی سنگھل، کوئی اڈوانی، کوئی ڈالسیا، کوئی جوشی اور کوئی واجپائی دہلی دربار پر تسلط قائم کر لے۔ آج ہندو فرقہ کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا رام مندر کی تعمیر اہم ہے یا ہندوستان کی سالمیت، یکجہتی اور اس کی خود مختاری کا تحفظ اہم ہے، ہندو فرقہ کو آج اس بات پر غور کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا کہ کیا وہ چند افراد کی انا کی تسکین کے لیے اپنی شہ رگ اپنے ہی ہاتھوں کاٹ دیں گے۔ آج آئین، قانون اور عدلیہ کی عظمت کو پاؤں تلے روندتے ہوئے سنگھل اور اڈوانی اعلانیہ دعویٰ کریں گے ”ہم نے جنگ کا بگل بجا دیا ہے کسی

میں ہمت ہو تو سامنے آئے، تو کیا اس وقت یہاں کے کروڑوں ہندوؤں کا سر شرم اور ندامت سے جھکے گا یا پھر چاروں طرف تباہی اور بربادی دیکھ کر اونچا ہو جائے گا۔ میں ہندو اور مسلمان کو دو الگ الگ دائروں میں تقسیم کر کے یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ہم سب ایک ہی قوم ہیں، ہندوستانی قوم لیکن میں صرف ہندو فرقہ سے اس لیے مخاطب ہوں کیونکہ ہم ہی اس ملک کی تہذیب، اس کی پرستش، اس کے اہتمام اور اس کی یکجہتی پر وار کر رہے ہیں۔ میں صرف ہندو فرقہ سے اس لیے مخاطب ہوں کیونکہ میں بھی ہندو ہوں اور بھگوان رام کا بھگت ہوں اور ہنومان کا پجاری بھی ہوں۔ لیکن میں گھر کا بھیدی نہیں ہوں کہ لڑکا کو ڈھادوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہندوستان زندہ رہے اور اس کی عظمت پر آنچ نہ آئے۔ میں آج مسلمانوں کی بات اس لیے نہیں کرتا کہ مسلمان آج مدتوں کے بعد ہندوؤں اور سرکار کے درمیان اس جھگڑے میں سرگرم فریق نہیں ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آج کی یہ جنگ ہندو دھرم کے خلاف انتہا پسند ہندوؤں اور حکومت کے درمیان ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی اخلاقی ہمدردی ان کروڑوں ہندوؤں کو حاصل ہے جو آج رام کو ایک کوڑے میں بند کرنے کے لیے پوری قوم کو مٹانے والوں کے خلاف سرگرم ہیں۔ آج ضرورت ہے تو ایک ہی بات کی کہ اس جنگ کا فیصلہ آج ہو جانا چاہیے۔ حکومت کیا کرتی ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں، ہندو کیا کرتا ہے اس سے مجھے غرض ہے۔ آج اگر ہندوؤں نے جرأت سے کام لے کر بھارت ماتا کی رکھشا کے لیے آواز بلند کی تو پھر کبھی کوئی ڈالمیا، کوئی اڈوانی اور کوئی جوشی ہمیں یرغمال بنانے کی جرأت نہیں کرے گا۔

وشواس گھات

میں آج لکھوں تو کیا لکھوں؟ — کیا یہ لکھوں کہ میرے ہم مذہبوں نے

بھگوان رام کے نام پر وہی گھناؤنا کھیل کھیلا جو راکشس راون نے سیتا کو ہرن کر کے کھیلا تھا۔ یا یہ لکھوں کہ میری برسوں کی ریاضت پر چند منٹوں میں پانی پھیر دیا گیا؟۔ یا یہ لکھوں کہ میں نے زندگی بھر جس آدرش کو سینے سے لگایا تھا وہی جنون کی آگ میں بھسم ہو گیا؟ لکھنا چاہوں گا بھی تو لکھ نہیں پاؤں گا۔ کیونکہ لکھتے لکھتے جذبات بے قابو ہو رہے ہیں۔ سوچتے سوچتے سوچ پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور صدیوں پرانی تاریخ نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ آنسو بھی نہیں بہہ رہے ہیں خشک ہو گئے ہیں۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، نہ کسی کو خوش کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں نہ کسی کی مذمت کرنے کے لیے۔ خوش کس کو کرنا ہے، خوشیاں تو چھین لی گئی ہیں۔ مذمت کس کی کروں، میں تو خود قابل مذمت ہوں۔ کیونکہ میں بھی اسی فرقہ کا ایک شخص ہوں جس کے جنونیوں نے خدا کا گھر توڑ دیا۔ ایسے ہزاروں خدا کے گھروں میں میرا سر سجدے میں گرا ہے اور مجھے کسی نے روکا بھی نہیں۔ کیونکہ میں اس ملک کے اُس حصے کا رہنے والا ہوں، جہاں مسلمان کا خدا اور ہندو کا بھگوان ہزاروں برسوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔

اسی ماحول میں بچپن گزرا، جوانی آئی اور اب جب عمر ڈھل رہی ہے تو میرے چہرے پر سرِ راہ کا لکھل دی گئی۔ رام کا مندر بنانا تھا، کس کو اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے بھی کہا بناؤ۔ مسلمانوں نے بھی کہا کہ شوق سے تعمیر کرو۔ سرکار نے بھی کہا عالیشان مندر بناؤ۔ اپوزیشن نے بھی کہا کہ رام مندر بننا چاہیے۔ لیکن میری اور دوسروں کی ایک ہی التجا تھی کہ بھگوان کا مندر بنانے کے لیے خدا کا گھر برباد مت کرو۔ مجھے وشواس دلایا گیا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خدا کے گھر کو توڑنے کا اور میں کل صبح تک ہر ایک کو یہی وشواس دلا رہا تھا کہ خدا کا گھر محفوظ رہے گا۔ اڈوانی نے وشواس دلایا ہے۔ کلیان سنگھ نے سپریم کورٹ میں وعدہ کیا ہے۔ جوشی نے پارلیمنٹ کو یقین دلایا ہے۔ لیکن وشواس گھات ہوا۔ ۱۱ بجتے ہی میرا وجود ہل گیا اور میں

دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ اڈوانی ہوں یا جوشی، کلیان سنگھ ہوں یا سنگھل — وہ یہ محسوس نہیں کریں گے کہ انہوں نے کس کس کو قتل کیا ہے۔ کس کس کی گردن پر چھری پھیری ہے۔ کس کس کو ذہنی عذاب میں مبتلا کیا ہے۔ بھلا آج تک کسی قاتل نے سوچا ہے قتل کے انجام کو؟

سوال ایک مسجد کے توڑنے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ صدیوں کی روایات، صدیوں کا بھائی چارہ اور صدیوں کی مذہبی رواداری کیا پھر کروٹ لے گی؟ کیا میرا ہم وطن مسلمان مجھ پر بھروسہ کرے گا؟ کیا میں کسی مسلمان کے ساتھ آنکھیں ملا سکوں گا؟ کیا میں اسے یقین دلا پاؤں گا کہ آئندہ پھر ایسا نہیں ہوگا۔ ایک اڈوانی کیا ہزاروں اڈوانی سیاست سے ریٹائر ہو جائیں۔ ایک واجپائی کیا ہزاروں واجپائی ہزار بارامعانی مانگ لیں۔ ایک نرسمہاراؤ کیا ہزاروں نرسمہاراؤ پیچھے کی طرف مڑ کر نہ دیکھنے کا وعدہ کریں، مگر کیا اعتماد بحال ہو سکتا ہے؟ کیا ٹوٹے رشتے جڑ سکتے ہیں؟ بار بار میں نے اپنی تسکین کے لیے صاف ذہنیت کے لوگوں کے قدموں پر سر رکھ کر التجا کی، بھائی بھگوان رام کو ہماری بیساکھیوں کی ضرورت نہیں، بھگوان رام کو ایک عالی شان مندر کی ضرورت نہیں، بند کرو اس جھگڑے کو۔ خدا کے گھر کو بھی بساؤ اور بھگوان رام کو بھی شانتی سے اپنے بھگتوں کی بھکتی قبول کرنے دو۔ میں نے کتنی بار اپیل لی کہ بھئی خدا کا گھر ٹوٹ جائے گا تو قبر برپا ہوگا۔ میں پاگل نہیں تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ انسانوں کے دل جب ٹوٹتے ہیں، بھروسہ جب اٹھ جاتا ہے، اعتماد جب ختم ہو جاتا ہے تو قیامت آ جاتی ہے۔ لیکن جنون اور نفرت کے اندھیرے میں کس کو فرصت تھی مجھ جیسے پاگل کی بات سننے کی۔ ہر ایک دوڑ رہا تھا اجودھیا کی طرف۔ ہر ایک نعرہ بلند کر رہا تھا۔ بے رام جی کی — اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ یلغار ہوئی خدا کے گھر پر اور توڑ دیا ایمان والوں کا اعتماد —

خدا کے گھر کو توڑ کر اڈوانی جی تم نے صرف ہندو کا ہی سر نہیں جھکایا ہے، تم نے

بھگوان رام کو بھی بدنام کیا ہے۔ تم نے ہندوستان کی قد آور شخصیت پر کالکھل دی ہے۔ تم نے تو ہندو دھرم پر وار کیا ہے۔ بھارت ماتا کی رکھشا کرنے والو تم نے جو تیر مارا ہے وہ دشمن پر نہیں بھارت ماتا کے سینے پر لگا ہے۔

اب بھی وقت ہے سنبھلنے کا۔ ابھی آگ کے شعلے پوری طرح بھڑکے نہیں ہیں۔ اب بھی وقت ہے ہندوستان کو بچانے کا۔ سیاست کا کھیل بند کر دو۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا گھناؤنا کھیل روک دو۔ سیکولرزم کا ہارمونیم بجانا بند کر دو۔ یہ اب بے سُر ہو گیا ہے۔ اب کوئی تمہارے سیکولرزم پر وشواس نہیں کرے گا۔ مجھ پر بھی اب کوئی بھروسہ نہیں کرے گا۔ حالانکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میرے اندر کا آدمی مجھ سے کہلوا رہا ہے اور ہاں اگر اب بھی نہیں سمجھو گے تو بابر مسجد کے بلے پر نئی دکانیں کھل جائیں گی۔ سیکولرزم کی چتا سے ایسے بھوت پیدا ہو جائیں گے کہ وہ تمہیں تو نگل جائیں گے ہی، ساتھ ہی مجھے بھی نگل جائیں گے اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مجھے آج بھی ہندوستان کا ضمیر زندہ دکھائی دیتا ہے اور یہ میرے لیے زندگی کی علامت ہے۔



بابری مسجد تحریک اور مسلم قیادت

ایک سماجیاتی مطالعہ

فرحت احساس

لبر اہن کمیشن کی رپورٹ میں بابری مسجد کے انہدام پر منجھ ہونے والے عمل اور رد عمل اور لفظ و عمل کے تضادات پر مشتمل ڈرامائی منظر نامے میں مسلم قیادت کے کردار پر رائے زنی کی گئی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ مسلم قیادت اس پورے معاملے میں قدم قدم پر پیش آنے والے چیلنجوں کا موثر اور مطلوبہ جواب نہیں دے سکی اور اس وجہ سے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں پیچھے رہ گئی۔ اس تبصرے نے مسلم قیادت، اس کے معیار اور کردار، ذہنی صلاحیتوں، فہم و فراست، لب و لہجہ اور مقاصد کے بارے میں برسوں سے چلی آرہی بحث کو پھر سرگرم کر دیا ہے۔

آزادی کے بعد سے، مسلم قیادت کی سرگرمیوں، اظہارات اور اقدامات کے بارے میں مختلف آراء موجود رہی ہیں۔ مسلمانوں کا ایک بڑا اور سرگرم حلقہ، جو مسلم مسائل اور معاملات سے جذباتی وابستگی رکھتا ہے، اس قیادت کی موجودگی اور سرگرم مداخلتوں کو ضروری بلکہ ناگزیر قرار دیتا ہے جب کہ مسلمانوں کا دانشور طبقہ، بطور خاص اس کا وہ حصہ جو مسلم معاملات میں غیر عملی دلچسپی رکھتا ہے، مسلم قیادت سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا رہا ہے، خاص طور پر علمی مطالعات اور مباحث کے دوران۔

مسلم قیادت کی جانب سے بے اطمینانی، ناخوشی بلکہ بیزاری کا رویہ رکھنے والوں میں راقم حروف بھی شامل رہا ہے۔ مگر اس سلسلے میں محض بے اطمینانی یا ناخوشی

و بیزاری سے بات نہیں بنتی۔ کیوں کہ یہ تو محض اس بات کا اظہار ہے کہ مسلم قیادت کے نام پر جو کچھ بھی دست یاب ہے، اس سے بہتر بھی کچھ ہو سکتا تھا یا ہو سکتا ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا، کہ مسلم قیادت جیسی ہے ویسی کیوں ہے اور ایسا ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ ایک گہرا، جزری اور تفصیلی اور معروضی سماجیاتی مطالعہ درکار ہے۔ کیوں کہ کسی بھی معاشرے میں، کسی بھی نقطہ زمان و مکاں پر اور کسی خاص صورت حال میں جو بھی سماجی مظاہر سامنے آتے ہیں ان کے پیچھے اس معاشرے میں ظاہر اور غیر ظاہر طور پر سرگرم بہت سی سماجی طاقتوں کے باہم متصادم عمل، رد عمل، تصادموں اور دباوؤں کا ایک پیچیدہ سلسلہ موجود ہوتا ہے۔

لبرائن کمیشن نے ایک مخصوص پس منظر میں مسلم قیادت پر جو رائے زنی کی ہے اس سے کچھ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ مسلم قیادت سرکاری افسروں یا دیگر حکومتی اہل کاروں کی طرح کوئی ایسی جماعت ہے جسے کسی مقتدرہ کی جانب سے کسی کار خاص پر معمور اور مقرر کیا گیا اور ایک مقررہ ضابطے کے تحت اس کی کارکردگی کا احتساب کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ قیادت ایک سماجی مظہر ہے جو اپنے اظہار اور عمل میں پوری طرح آزاد اور خود مختار ہے۔ لفظ قیادت کا استعمال کسی ملک کے اقتدار نظام سے وابستہ اور نمائندہ افراد کے لئے بھی ہوتا ہے، مثلاً ملک کا وزیراعظم اور اس کی کابینہ کے وزیر اس ملک کی قیادت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک خاص حکومتی سرکاری معاملہ ہے۔ لیکن کسی بھی معاشرے میں قیادت کا حکومتی، سرکاری یا رسمی دائرہ اس دائرے کے مقابلے میں حد درجہ محدود ہوتا ہے جس میں قیادت کے عام و آزاد سماجیاتی عوامل سرگرم ہوتے ہیں اور اپنا اظہار کرتے ہیں۔

بابری مسجد۔ رام جنم بھومی مسئلے کے خصوصی حوالے سے بات کی جائے تو بابری مسجد تحریک سے وابستہ قیادت یکم فروری 1986 کو بابری مسجد کا تالا کھولے جانے کے فوری و فطری رد عمل میں وجود میں آئی تھی۔ 37 برسوں سے اجودھیا کی اس

متنازعہ مسجد کے دروازوں پر چڑھے ہوئے قفل کا کھولا جانا ہندوستانی تاریخ کے پرانے صندوق میں بند قدیم منافرتوں کے آسیبوں کی زنجیریں کھولے جانے کے مترادف تھا۔ اس کی خبر آتے ہی جہاں ہندوؤں کے ایک مخصوص حلقے میں کامیابی کے احساس اور خوشی کی ایک شدید لہر دوڑی وہیں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ شدید ہیجان، برہمی اور خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا۔ فیض آباد اور اجودھیا میں رد عمل کے طور پر کالے جھنڈوں کے ساتھ مظاہرے کئے گئے اور 6 فروری 1986 کو لکھنؤ میں اتر پردیش بابری مسجد ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے چیئرمین مولانا مظفر حسین کچھوچھوی اور کنوینر جناب ظفریاب جیلانی تھے۔ ایک خاص اصطلاح میں بات کی جائے تو یہ کمیٹی مولوی اور مسٹر کا ایک عجیب و غریب آمیزہ تھی جس میں مولوی کچھوچھوی حد درجہ جذباتی اور گفتار بے قید اور مسٹر جیلانی خاصے متوازن الذہن اور منطقی تھے۔

اس وقت کے سارے ہندوستان پر نگاہ ڈالی جائے تو مسلمانوں کے مسائل پر سوچنے، بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے ہزاروں لوگ موجود تھے۔ ان میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور دیگر بے شمار مدارس کے علما بھی تھے اور مسلم یونیورسٹی علیگزہ اور جامعہ ملیہ جیسے جدید تعلیم کے اداروں کے اساتذہ بھی، انگریزی پڑھنے اور لکھنے والے اور عام مسلمانوں سے لا تعلق بلکہ انھیں نگاہ حقارت سے دیکھنے والے مگر ساتھ ہی اپنے مسلم نام کے فائدے اٹھانے والے دانش ور بھی تھے۔ مسلم لیڈر ہونے یا اپنی صحافت کے زور پر اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہونے کے آرزو مند اردو اخباروں کے مدیر اور صحافی بھی تھے اور اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں شہر شہر، قصبے قصبے میں خود رو پودوں کی طرح اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے مسلم نیتا بھی، جو ہر نئے مسئلے پر شراٹگریزی اور فتنہ سازی کی تاک میں رہتے ہیں۔ ساتھ ہی جمعیۃ علمائے ہند، جماعت اسلامی ہند، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم لیگ اور مسلم

مجلس جیسی مسلم تنظیمیں بھی تھیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں موجود مسلم وزیر اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے مسلم نمائندے اور سب سے بڑھ کر آگے چل کر سرسید ثانی کہے جانے کے منتظر سید حامد تھے جے جو مسلم یونیورسٹی کو خراب اور خستہ تر چھوڑ کر اب کسی نئے منصب کے حصول کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایسے میں قرہ فال صرف ایک مولوی اور ایک مسٹر کے نام کیوں نکلا۔ اس کے کئی اسباب تلاش کئے جاسکتے ہیں مگر بظاہر بالکل سامنے کا سبب یہی کہا جاسکتا ہے کہ بابر کی مسجد کی قفل شکنی سے پیدا شدہ صورت حال سے بننے والے ذہنی، نفسیاتی، جذباتی اور سیاسی دباؤ کے بھنور کی آنکھ انہی دو افراد پر کھلی۔

لیکن اور گہرائی سے دیکھیں تو یو پی بابر کی مسجد ایکشن کمیٹی کی تشکیل، صاف ظاہر ہے، ان افراد نے نہیں اس وقت کی مخصوص صورت حال کے جبر نے کی تھی اور یہ دو افراد محض اس جبر کا آلہ کار تھے۔ اس کے بعد اس بھنور کی آنکھ اپنے اندر موج زن طوفانوں کے ساتھ کھلتی ہی چلی گئی اور ہم نے وہ سب دیکھا جو نہ دیکھنا تھا۔

یو پی بابر کی مسجد ایکشن کمیٹی کی تشکیل نے مسلم قیادت کو ہتھیانے کی شدید ہجانی آرزو مندی کی ایک برقی رو پیدا کر دی اور جلد ہی، جو فطری تھا، تحریک کا مرکز دہلی منتقل ہو گیا جہاں جامع مسجد دہلی کے امام سید عبداللہ بخاری پہلے سے ہی مسلم قیادت کے ایک طاقت ور مرکز کی حیثیت سے موجود تھے۔ لیکن ان سے کہیں بڑھ کر ایک اور صاحب تھے جن کے دل و دماغ میں مسلمانوں کا بلا شرکت غیرے قائد بننے کے عزائم یا بدعزمی زور مار رہی تھی۔ یہ صاحب تھے سید شہاب الدین۔ محمد علی جناح کی سخت منطقی آئین پسندی اور محمد علی جوہر کی شدید جذباتیت کے خطرناک آمیزے سے متحرک سید شہاب الدین نے تحریک کو، جواب تک کا لے جھنڈوں کے ساتھ مظاہروں اور میمورنڈم پیش کئے جانے تک محدود رکھی، مسلم عوام کی دہکتی ہوئی جذباتی بھٹی کا ایندھن بنانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ 14 فروری کو کل ہند یوم سیاہ اور بند کا

اعلان کیا گیا۔ یوم سیاہ اور بند کا وہی نتیجہ نکلا جو مطلوب تھا یعنی دہلی اور دیگر علاقوں میں کئی مسلمانوں کی ہلاکت اور بڑے پیمانے پر پھیلنے والی منافرت کی آگ۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر تھا سید شہاب الدین کا ایک مسلم قائد کی حیثیت سے قائم ہونا، کم از کم سیاسی پارٹیوں اور انگریزی پریس کی نظر میں۔ مسلم قیادت کے اس نئے مرکز کے قیام کے بعد یہ بھی ہوا، جو ہونا تھا، کہ جامع مسجد دہلی میں پہلے سے موجود قیادت کے مرکز اور اس نئی قیادت کی آرزو مندی کے ساتھ ایک مستقل تصادم کی حالت پیدا ہو گئی، جس کے کئی سنگین نتائج برآمد ہوئے۔

دوسری طرف بابر مسجد تحریک کا مرکز جو جامع مسجد دہلی میں سرگرم تھا اس میں ظفریاب جیلانی کے ساتھ ساتھ جاوید حبیب کی شمولیت نے اس کی جذباتی حدت پر جمہوریت پسندانہ معقولیت کا انکس لگانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ مگر جامع مسجد کا جذباتی آتش فشاں پھر بھی اکثر پھٹ پڑنے کے راستے پیدا کرتا رہا۔ بعد میں جاوید حبیب نے بابر مسجد تحریک کے ترجمان کی حیثیت سے قومی و بین الاقوامی میڈیا سے رابطے کی سرگرمیوں میں اس تحریک کو ایک وسیع تر، قومی، جمہوری اور انسانی مسئلے کے طور پر پیش کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ تحریک سے وابستہ بہت سے گرم لوگوں نے اکثر جاوید حبیب کی اس روش کو تحریک کو ہلکا کرنے، یعنی اس کی اس جذباتی شدت کو کم کرنے کی کوشش سے بھی تعبیر کیا جو انہیں مسلم قائد کے طور پر مستحکم کرنے کے لئے ضروری تھی۔ مگر اس کے باوجود جاوید حبیب اپنی اس جمہوریت پسندانہ اور قابو شدہ جذباتی اظہار کی روش پر جمے رہے۔ سید شہاب الدین کی طرف سے 26 جنوری کے بائیکاٹ کی اپیل پر انہوں نے کھل کر اپنا اختلاف ظاہر کیا کہ ان کے مطابق یہ اپیل مسلمانوں کو ان کے ملک اور اس کی جمہوری علامتوں سے متصادم کرنے والی تھی۔ اس اپیل کے خلاف ان کا یہ بیان خاصا مشہور ہوا تھا کہ اس دن مسلمانوں کی دکانیں بند رہیں گی مگر سید

شہاب الدین کی سیاسی دکان کھلی رہے گی۔
 اس دوران جب کانفرنسوں اور گرفتاریاں پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا،
 تحریک سے مختلف حکمت عملی، قیادتی اقتدار کی آرزو مند یوں اور اناؤں کے ٹکراؤ نے
 اپنا کام جاری رکھا۔ جس کے نتیجے میں 21-21 دسمبر 1986 کو دہلی میں کل ہند
 بابری مسجد کانفرنس کے موقع پر بابری مسجد رابطہ کمیٹی وجود میں آئی اور بعد میں
 26-27 نومبر 1988 کو دہلی ہی میں دوسری بابری مسجد کانفرنس کے دوران کل
 ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ رابطہ کمیٹی کے کنوینر سید شہاب الدین تھے
 جسے جماعت اسلامی کا تعاون حاصل تھا جب کہ کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں
 سلطان صلاح الدین ادیسی، ظفر یاب جیلانی اور جاوید حبیب سمیت بیشتر معروف
 مسلم جماعتوں کے نمائندے شامل تھے۔ قیادت اور اس سے وابستہ مفادات کے
 ٹکراؤ کا کا بدترین اظہار 30 مارچ 1987 کو دہلی میں بوٹ کلب پر ہونے والی
 لاکھوں مسلمانوں کی ریلی میں ہوا جہاں بابری مسجد تحریک کی تمام تر گرج چمک سید
 عبداللہ بخاری پر مرکوز ہو گئی اور سید شہاب الدین ایک طرح سے پس منظر میں
 چلے گئے۔

یہ اختلافات اپنی جگہ برقرار رہے اور اس کے ساتھ ہی تحریک کے دونوں
 مراکز کی جانب سے احتجاجی مظاہروں کے سلسلے بھی جاری رہے یہاں تک کہ
 6 دسمبر 1992 کا دن آپہنچا جب بابر سے منسوب اجودھیا کی قدیم مسجد مسلم
 سلطنت کی طرح تاریخ کے خانہ تارک میں غرق ہو گئی۔

سوال یہ ہے کہ بابری مسجد تحریک سے وابستہ 'مسلم قیادت' نے حاصل کیا
 کیا۔ انجام سے آغاز کی طرف دیکھا جائے تو ما حاصل مسجد کے انہدام کے سوا اور کچھ
 نظر نہیں آتا، ٹھیک اسی طرح جیسے بیسویں صدی کے اوائل میں خلافت تحریک کا
 انجام خلافت کے خاتمے پر ہوا تھا۔ لیکن بابری مسجد تحریک کے معاملے میں یہ انجام

شائد اس کے آغاز میں شامل نہیں تھا۔ راقم حروف اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے کہ تاریخ کے ایک نقطے پر ایسے امکانات یا محض آرزو مندانہ خوش فہمی کے آثار تھوڑی دیر کے لئے چمکے تھے کہ بابرؒ مسجد ترازے کا رخ مسجد کے انہدام کے بجائے کسی تخلیقی اور معمول مخالف تصفیے کی طرف ہو جائے، مثلاً اس تجویز پر عمل کہ مسجد کے قلب کو، جو ہندو قیادت کے مطابق رام مندر کا گر بھ گرہ تھا، کاٹ کر رام مندر میں شامل کر کے مسجد کی عمارت کو برقرار رکھتے ہوئے دوسری طرف سے رام مندر تعمیر کر لیا جائے۔ لیکن یہ سب بعد کی قیاس آرائیاں ہیں، بالکل ویسی ہی جیسے کہ تحریک آزادی کے آخری لمحوں میں کئی بار اس امید نے جھلک دکھائی تھی کہ شائد ملک کی تقسیم کو روکا جاسکتا تھا۔

یہ سوال بھی سر ابھارتا ہے کہ کیا بابرؒ مسجد تحریک کو اس سے بہتر افراد اور ذہنی وسائل میسر آ سکتے تھے۔ مگر یہ سوال بھی قیاسی ہے کیوں کہ تحریک چلانے کے لئے، جسے چلنا ہی تھا، کہ کسی بھی صورت حال کا پیدا شدہ سوال بے جواب نہیں رہ سکتا، جو بھی افراد سامنے آئے، ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں شائد انہی کا اور اتنا ہی انتظام کر سکتی تھیں۔ یقیناً بہتر صلاحیتیں اور وسائل موجود تھے مگر مسلمانوں کا اجتماعی وجود ان کی خدمات سے مستفید ہونے کا اہل نہیں تھا کہ ان صلاحیتوں اور وسائل نے اپنے آپ کو اپنے ذاتی مفادات کے دائرے میں بند کر رکھا تھا۔

مگر سب سے بڑھ کر بابرؒ مسجد تحریک سے وابستہ قائدین وقت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اسکرپٹ کے مطابق ابھرنے والے کردار تھے جنہیں اپنے سے کہیں طاقت ور کرداروں کے سامنے اپنا رول ادا کرنا تھا۔ ان کا نہ اپنے آپ پر کوئی اختیار تھا، نہ حالات پر۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا، اس سے زیادہ یا کم یا الگ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

رپورٹ کی روشنی میں 68 ملزموں کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

مسلم پرسنل لا بورڈ نے بابر مسجد کے انہدام کے لئے سابق وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی کو بھی برابر کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس انہدام میں کانگریس نے جو کردار نبھایا ہے اس کے لئے مسلمان اسے بھی کبھی معاف نہیں کریں گے۔ بورڈ کی 41 رکنی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں جو لکھنؤ میں ہوئی، بورڈ نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ بابر مسجد کے انہدام میں مسٹر واجپئی تکنیکی اعتبار سے ملوث نہ ہوں مگر منطقی اور اخلاقی لحاظ سے اس پارٹی کے لیڈر ہونے کے ناطے، جو کہ اس جرم میں شریک ہے، وہ بھی ذمہ دار ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ترجمان اور اسٹنٹ جنرل سکریٹری عبدالرحیم قریشی نے کہا کہ مسلمان کانگریس اور سابق وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ کیونکہ انہوں نے مسجد کا انہدام روکنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ بورڈ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگرچہ نرسمہا راؤ بھی بابر مسجد کے انہدام کے لئے برابر کے ذمہ دار ہیں لیکن لبرالہن کمیشن نے ان کے بارے میں کوئی رائے زنی نہیں کی ہے جیسے کہ نرسمہا راؤ کا رول کمیشن کے دائرہ کار میں شامل ہی نہیں تھا۔ کمیشن پر لازم تھا کہ وہ واجپئی کو بلاتا اور اس واقعہ میں ان کے رول کے بارے میں ان سے سوالات کرتا۔ ان سے ایسی پارٹی کے لیڈر کے طور پر پوچھ تاچھ کی جاتی جس نے بابر مسجد کا انہدام کرایا۔ ندوۃ العلماء کے احاطہ میں

19 اور 20 دسمبر 2009 کو ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے بعد نامہ نگاروں کو تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے مسٹر قریشی نے دعویٰ کیا کہ بورڈ نے یہ محسوس کیا ہے کہ پارلیمنٹ میں لبرالہن کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ اس رپورٹ پر کئے گئے اقدامات سے متعلق کارروائی رپورٹ میں سیاسی بدنیتی سے کام لیا گیا ہے۔ بورڈ نے مطالبہ کیا ہے کہ بابر میسجدا نہدام سے تعلق رکھنے والے فوج داری مقدمات کی سرعت کے ساتھ سماعت اور لبرالہن رپورٹ میں نامزد کئے گئے دوسرے لوگوں کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے کہا کہ اس تاریخی مسجد کو منہدم کرنے کی سازش اور اس گھناؤنے جرم کے لئے آرائس ایس، وی ایچ پی، بی جے پی، بھنگ دل اور شیو سینا کو ذمہ دار قرار دینے سے متعلق جو نتیجے اس رپورٹ میں اخذ کئے گئے ہیں وہ درست ہیں۔ لیکن بورڈ نے مسلم تنظیموں کے بارے میں لبرالہن کمیشن کے مشاہدات پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ کمیشن کے پاس اس طرح کی رائے زنی کا کوئی سبب نہیں تھا۔ لبرالہن کمیشن رپورٹ پر مرکز نے جو کارروائی رپورٹ پیش کی ہے اس میں سیاسی بدنیتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے بل کو قانون بنانے کے مرکز کے وعدے پر بل لانے کی بھی بورڈ نے مخالفت کی۔ پرسنل لا بورڈ نے محسوس کیا اس بل سے مقصد حل نہیں ہوگا بلکہ اس سے سرکاری افسروں اور پولس کو مسلمانوں اور دیگر کمزور طبقات پر مظالم کے پہاڑ توڑنے کے وسیع تر امکانات مل جائیں گے کیونکہ جب بھی فسادات ہوتے ہیں پولس اور انتظامیہ یا تو بلوائی بن جاتی ہے یا پھر خاموش تماشائی۔ حکومت کو چاہئے کہ ایسا کوئی بل لانے کی بجائے پہلے ملک کے تمام شہریوں کے تمام طبقات سے اس سلسلے میں رائے اور مشورے مانگے۔ مرکزی بی آئی کو یہ ہدایت دے کہ لکھنؤ کی خصوصی عدالت میں جو مقدمات زیر سماعت ہیں ان میں مجرمانہ سازش کے الزامات کا اضافہ کرے کیونکہ لکھنؤ اور بریلی کے درمیان

دو چارج شیٹوں کو بانٹتے وقت مجرمانہ سازش کا الزام ہٹالیا گیا تھا۔
 پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ میں مشورہ بھی دیا گیا کہ ترقی پسند اتحاد حکومت رائے
 بریلی میں یومیہ سماعت کرانے کا حکم عدالت سے حاصل کرے اور لکھنؤ کی عدالت
 میں سماعت شروع کرنے پر لگایا گیا اسٹے آرڈر واپس لے لے۔ اس کا بھی مطالبہ کیا
 گیا ہے کہ کمیشن نے جن 68 افراد کو بابر مسجد کے انہدام کا قصور وار قرار دیا ہے
 ان میں سے جن لوگوں کو زیر سماعت مقدمات میں ملزم نہیں بنایا گیا ہے ان کے
 خلاف کمیشن کے فراہم کردہ مواد پر ایف آئی آر درج کرائی جائے اور سی بی آئی ان
 لوگوں کے خلاف الزامات کی انکوائری تیزی سے مکمل کرائے۔ مرکز پارلیمنٹ میں
 اس کا اعلان کرے کہ بابر مسجد کی ملکیت کے مقدمہ میں عدالت کے آخری فیصلہ کا
 وہ احترام کرے گی، اس فیصلہ پر عمل درآمد کرانے کے لئے ساری ذمہ داری قبول
 کرے گی اور تمام سہولتیں فراہم کرے گی۔ بورڈ نے الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ
 میں مقدمہ کی سماعت تیزی سے مکمل کرانے کے لئے مداخلت کا بھی حکومت سے
 مطالبہ کیا اور کہا کہ اسے التوا میں نہ دینے دیا جائے۔

مسجد انہدام کے ذمہ داروں کے خلاف کارروائی کی جائے

سید معصوم رضا ایڈوکیٹ

(وائس چیئرمین، ایڈوائزری بورڈ، رائل فیملی آف اودھ، لکھنؤ)

اس رپورٹ کے مطابق کمیشن نے بھاجپالیڈروں اٹل بہاری واجپئی، ایل
 کے اڈوانی، مرلی منوہر جوشی کے علاوہ اس وقت اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کو
 مسجد کے انہدام کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اسے منظم سازش کا نتیجہ قرار دیا اور اس
 ایل کے اڈوانی کے لئے 68 لیڈروں کو قصور وار ٹھہرایا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ

طویل مدت کے بعد رپورٹ پیش ہونے سے انصاف بے معنی ہو جاتا ہے۔ تاہم رپورٹ آجانے کے بعد سرکار کو اس رپورٹ کی روشنی میں مسجد انہدام کے ذمہ داروں کے خلاف کارروائی کرنی چاہئے۔ لال کرشن اڈوانی بابرہی مسجد کے انہدام کو اپنی زندگی کا منحوس ترین دن قرار دینے کے بعد اب انہدام کے لئے اپنی رتھ یا ترا کو فخر کی بات بتا رہے ہیں اور ان کے ساتھی و نے کٹیا راس دن کو عالیشان دن قرار دے رہے ہیں۔ لبر اہن کمیشن رپورٹ پر پارلیمنٹ میں بحث کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ حکومت اور اس کے لوگوں نے مسجد کی شہادت کے گناہ گاروں کی نشان دہی کر کے انہیں قانونی دائرے میں لانے والے فیصلے کا اعلان کرنے کے بجائے پرانے قصے بیان کیے۔ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے کہ کمیشن رپورٹ آجانے کے بعد بابرہی مسجد کی شہادت میں اپنی مجرمانہ رول کے لئے شرمندہ ہونے کے بجائے فخر محسوس کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بابرہی مسجد کے ساتھ انصاف ہو اور مسجد کی شہادت کے ذمہ داروں کو سزا ملے۔



لبراہن کمیشن رپورٹ — ایک جائزہ

ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس

جس کمیشن کو تین ماہ میں اپنی رپورٹ دینی تھی اس نے اسے مکمل کر کے داخل دفتر کرنے میں 17 سال لگائے۔ 48 بار توسیع اور ملک کے خزانے کا 8 کروڑ روپیہ خرچ کرنے کے بعد جو رپورٹ جسٹس من موہن سنگھ لبراہن نے پیش کی اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ کھودا پہاڑ نکلی چوہیا۔ جسٹس لبراہن نے جتنی باتیں کہی ہیں ان میں سے کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جو 6 دسمبر 1992 سے ملک اور اہل ملک نہ جانتے ہوں۔ لیکن چونکہ یہ باتیں ایک انکوائری کمیشن کہہ رہا ہے اس لئے اس کی دستاویزی حیثیت ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں کمیشن نے اپنے ٹرس آف ریفرنس سے کس حد تک انصاف کیا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کمیشن کی سفارشات پر حکومت کی ایکشن ٹیکن رپورٹ یہ بتائے گی کہ بابر مسجد انہدام کے مجرمین کو سزا دینے اور ملک ایسے بدترین اور شرمناک حالات سے پھر کبھی دوچار نہ ہو اس کے سلسلے میں کیا اقدامات سرکار کے پیش نظر ہیں۔

6 دسمبر 1992 کو پانچ سو سالہ قدیم بابر مسجد کی شہادت کا المناک اور شرمناک واقعہ پیش آیا۔ 15 دسمبر 1992 کو نرسمہاراؤ کی مرکزی حکومت نے اس کی تحقیقات کے لئے چند گڑھ ہائی کورٹ کے جج جسٹس من موہن سنگھ لبراہن کی قیادت میں ایک رکنی انکوائری کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کو اپنی رپورٹ تین ماہ یعنی 16 مارچ 1993 تک پیش کر دینی تھی۔ لیکن کمیشن نے تقریباً 17 سال بعد

30 جون 2009 کو ایک ہزار صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ سرکار کو پیش کی۔ ان 17 سالوں میں درمیان کے دو سال کو چھوڑ کر مرکز میں کانگریس، کانگریس کے زیر قیادت یا بی جے پی کے زیر قیادت سرکار ہی اقتدار پر فائز رہی۔ لہذا البراہن کمیشن کو 48 بار توسیع دے کر Justice Delayed is Justice Denie (انصاف میں تاخیر دراصل انصاف سے انکار ہے) کا رویہ اپنانے کے جرم میں بی جے پی اور کانگریس برابر کی شریک ہیں۔ چونکہ بابر مسجد کے انہدام میں بھی دونوں کی ساز باز تھی اس لئے ان میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ رپورٹ منظر عام پر آئے اور اگر کسی وجہ سے اس کو پبلک کرنا ہی پڑے تب وہ ایسی ہو جس سے ان سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں کا بال بھی بیکانہ ہو۔ رپورٹ پر اس عمومی تبصرے کے بعد اس کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

16 ابواب (Chapters) اور تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ تیار کرنے کے لئے جسٹس لبراہن نے کمیشن کی 399 سماعتیں کیں، 100 گواہوں سے جرح کی اور اس پوری کارروائی کا 6 سال 6 ماہ اور 15 دن میں مکمل کیا۔ ٹرس آف ریفرنس کے تحت کمیشن کے سامنے درج ذیل سوالات تھے جن کا جواب کمیشن کو فراہم کرنا تھا۔

1۔ حقائق کی روشنی میں اس بات کا پتہ چلانا کہ بابر مسجد کے انہدام کے لئے کیا حالات اور کون افراد ذمہ دار ہیں؟

2۔ 6 دسمبر 1992 اجودھیا میں وقوع پذیر ہونے والے وہ واقعات اپنی ترتیب کے اعتبار سے جنہوں نے بابر مسجد کے انہدام کا راستہ ہموار کیا۔

3۔ بابر مسجد کے انہدام کے تعلق سے ریاست کے وزیر اعلیٰ، ان کے وزراء، ریاستی حکومت کے اہل کاروں، دیگر افراد و تنظیموں اور ایجنسیوں (خفیہ ایجنسیوں) کا کیا رول رہا۔

4۔ بابری مسجد کے تحفظ اور سلامتی کے لئے اٹھائے گئے ریاستی حکومت انتظامیہ کے انتظامات میں ایسی خامیوں اور کوتاہیوں کا پتہ لگانا جن کی بناء پر مسجد کا انہدام ممکن ہوا۔

5۔ میڈیا کے افراد پر ہوئے حملوں کے اسباب و علل کی نشاندہی۔

6۔ اس کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر چیز جس کا تعلق اس واقعہ سے ہو۔

جسٹس لبراہن نے (ظاہر ہے کہ کسی کے دباؤ میں) بے جا طور پر اپنی تحقیقات کے دائرے سے مرکزی حکومت کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ اس کا ٹرس آف ریفرنس صرف ریاستی حکومت، ریاستی انتظامیہ، افراد اور تنظیموں تک محدود ہے، اس کے دائرے میں مرکزی حکومت نہیں آتی۔ حالانکہ کمیشن نے اپنے اختتامیہ میں مرکز کی نرسمہاراؤ حکومت کو بچانے کی پوری کوشش بھی کی۔

کمیشن نے رپورٹ پیش کرنے میں ہوئی تاخیر کے لئے جو جواز فراہم کیا ہے اس کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ کمیشن کے سربراہ نے اپنی خفت مٹانے کی ایک ناکام کوشش کی ہے۔ کمیشن نے جہاں اس کے لئے ریاستی حکومت، حکومتی عملے، خفیہ ایجنسیوں کے عدم تعاون کو ذمہ دار قرار دیا ہے وہیں خواہ مخواہ مسلم لیڈر شپ اور تنظیموں پر بھی تنقید کی ہے کہ انہوں نے کمیشن سے کوئی تعاون نہیں کیا۔ حالانکہ کمیشن نے کسی بھی مسلم تنظیم یا مسلم رہنما (دینی و سیاسی) کو اس مقصد کے لئے کمیشن میں طلب نہیں کیا۔ اس کے باوجود سید شہاب الدین (سابق ایم پی) از خود بطور گواہ پیش ہوئے۔ پہلے ایڈوکیٹ مشتاق احمد صاحب نے مسلمانوں کی جانب سے پیروی کی، بعد ازاں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے ایڈوکیٹ یوسف حاتم مچھالا صاحب پیش ہوئے جنہوں نے سابق وزیراعظم نرسمہاراؤ، بی جے پی رہنما ایل کے اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی اور متعدد گواہان سے کامیاب جرح کی اور بورڈ کی جانب سے تقریباً 400 صفحات پر مشتمل اپنی بحث

تحریری شکل میں کمیشن کو سونپی۔ اس لئے کمیشن کی شکایت نہ صرف بیجا بلکہ غیر ضروری تھی۔

کمیشن نے اپنے ذرائع سے کوئی تحقیق نہیں کی بلکہ جو کچھ دستاویزات، خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹیں، گواہوں کے بیانات، اخباری رپورٹیں اور ویڈیو کیسٹس اس کو دستیاب ہوئیں، اسی کو اپنی رپورٹ کی بنیاد بنایا ہے۔ اس سلسلے میں کمیشن نے خود اس بات کی شکایت کی کہ جو کچھ مواد اسے حاصل ہوا وہ نا کافی تھا۔ تاہم انکوائری کمیشن ایکٹ کے تحت جو اختیارات کمیشن کو حاصل تھے اس کو بروئے کار لا کر کمیشن ضروری معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

یوں تو کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جو لوگ نہ جانتے ہوں۔ یعنی یہ بات کہ انہدام کے لئے بی جے پی اور سنگھ پر یوار کی تمام تنظیمیں اور اس سے وابستہ افراد ذمہ دار ہیں، اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے اپنی ذمہ داریوں سے مجرمانہ غفلت ہی نہیں برتی بلکہ اس جرم میں براہ راست تعاون کیا ہے۔ ریاستی و ضلعی انتظامیہ، پولیس اور سیکورٹی دستوں نے بابر مسجد کے انہدام کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے رویہ اور طرز عمل سے شریک عناصر کی ہمت افزائی ہی کی۔ تاہم اس رپورٹ کی اہم بات یہ ہے کہ کمیشن نے بابر مسجد کے انہدام کو ایک حادثہ ماننے سے انکار کیا اور بہت واضح طور پر یہ کہا ہے یہ ایک منظم اور منصوبہ بند سازش تھی۔ بی جے پی کے رہنما بشمول اس کے مرکزی کردار ایل کے اڈوانی برابر یہ راگ الاپ رہے ہیں یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ سپریم کورٹ اور مرکزی سرکار کے رویے سے کارسیوک مشتعل ہو گئے تھے اور اسی اشتعال میں انہوں نے یہ کارروائی کر دی۔ کمیشن نے اپنے پاس موجود ایجنسیوں کی رپورٹوں، دیگر شہادتوں اور گواہوں کے بیانات کو سامنے رکھ کر بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ ایک منظم سازش تھی۔ انہدام کی کارروائی کو انجام دینے کے لئے کارسیوکوں کے ایک

گروپ کو، باضابطہ ٹریننگ دی گئی تھی اور پوری تیاری اور آلات کے ساتھ وہ وہاں پہنچے تھے۔

اس رپورٹ کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ کمیشن نے سنگھ پر یوار سے وابستہ تمام تنظیموں کو نام بنام اس دہشت گردی کے لئے ذمہ دار قرار دیا ہے۔ کمیشن نے تنظیموں کے علاوہ ان افراد کے نام بھی اپنی رپورٹ میں درج کئے جنہوں نے دانستہ یا بالواسطہ انہدام کی اس مجرمانہ کارروائی میں کوئی کردار ادا کیا۔ البتہ کمیشن نے مرکزی سرکار کے رول پر خاموشی اختیار کی اور یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ یہ اس کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ اسی طرح مرکزی حکومت کا یہ کہہ کر دفاع بھی کیا کہ چونکہ ریاستی گورنر نے ریاست کے حالات کے پیش نظر صدر راج کی سفارش نہیں کی اس لئے مرکزی حکومت کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ یہ بات دستوری طور پر بھی غلط ہے اور روایات کے بھی خلاف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مرکزی حکومت کسی بھی ریاست میں صدر راج نافذ کرنے کے لئے صرف گورنر کی رپورٹ پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ دوسرے ذرائع بھی اختیار کرتی ہے اور اگر اپنی معلومات کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ریاست کے حالات ناگفتہ بہ ہیں، قانون کی بالادستی متاثر اور انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں اور ریاستی حکومت اپنی آئینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ناکام ہو چکی تو ان حالات میں وہ صدر راج نافذ کر سکتی ہے۔ اس وقت کے مرکزی داخلہ سیکریٹری مسٹر مدھو گوڈ بولے کی گواہی کے مطابق، خفیہ ایجنسیوں کی جو رپورٹیں مرکزی حکومت کے پاس موجود تھیں وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھیں کہ ریاست کی لائینڈ آرڈر صورت حال قابو سے باہر ہے اور کسی بھی قسم کے حالات اجودھیا اور فیض آباد میں پیش آسکتے ہیں۔ پھر بابری مسجد کے انہدام کے بعد مرکزی حکومت نے دیگر پانچ ریاستوں کی بی جے پی سرکاروں کو برخاست کیا تھا، حالانکہ اس کے لئے وہاں کے ریاستی گورنروں کی کوئی سفارش پہلے سے موجود نہیں تھی۔ اسی

طرح مرکزی سرکار اپنے پاس موجود اطلاعات کی بنیاد پر ریاستی گورنر سے از خود رپورٹ طلب کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مرکزی سرکار اور اس کے وزیر اعظم کو کلین چٹ دے کر کمیشن نے اپنے کردار کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

جسٹس لبراہن نے اپنی رپورٹ میں بابر می مسجد کے انہدام کے لئے مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کو بالواسطہ مورد الزام ٹھہرایا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے موقف کو اہل ملک کے سامنے پیش کرنے اور سنگھ پر یوار کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کوئی رول ادا نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں اور ان کی تنظیموں پر جسٹس لبراہن کی نکتہ چینی صرف توازن پیدا کرنے کی غرض سے کی گئی۔ انہوں نے مسلمانوں کی کسی تنظیم یا رہنما کو کمیشن میں طلب کر کے ان کا موقف جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

رپورٹ کا سب سے کمزور پہلو اس کی سفارشات ہیں ایک دو سفارشات کو چھوڑ کر تمام سفارشات عمومی نوعیت کی ہیں۔ جن میں سے بعض تو کمیشن کے دائرہ کار سے متجاوز ہیں۔ مثلاً سیاست اور مذہب کو الگ کرنے کے لئے دستوری اہتمام کی سفارش، 6 دسمبر کو اجودھیا میں جو کچھ ہوا وہ دراصل مذہب و سیاست کی آمیزش کا نتیجہ تھا، حکومت کے سیکولر کردار کے لئے اب تک کئے گئے مثبت و ایجابی اقدامات نا کافی ثابت ہوئے، نیشنل انیگریشن کونسل کو آئینی درجہ دیا جائے۔ سیاست داں دستوری و آئینی مناصب پر فائز نہ کئے جائیں، سیاست اور مذہب کی آمیزش کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے ایک علیحدہ قانون بنایا جائے، فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد کے لئے سخت قوانین بنائے جائیں، الیکشن کمیشن آف انڈیا ایسی تمام شکایتوں پر سخت کارروائی کرے جن میں مذہب کو سیاست کے لئے سیڑھی بنایا گیا ہو۔ جمہوریت کو مذہب و ذات پات کے مفادات کے لئے یرغمال بنانا غیر اخلاقی اور غیر قانونی عمل ہے۔ ایسی حکومت جو کسی خاص مذہب یا مذہبی گروہ کی

حمایت یا پشت پناہی کرے، یا جو مذہبی جذبات کو بھڑکا کر وجود میں آئے یا وہ کسی ایسی پارٹی کے ذریعے بنائی جائے جس کے ایجنڈے پر مذہب یا مذہبی ایشوز رہے ہوں، ایسی تمام حکومتیں غیر آئینی اور غیر دستوری شمار کی جائیں۔

اسی طرح کمیشن نے پولیس اور انتظامی عملہ کی اصلاح کے لئے بھی متعدد سفارشات کی ہیں۔ جن میں پولیس اور بیوروکریسی کے سیاست دانوں کے ساتھ مفاد پرستانہ رشتوں کو کرپشن کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں متعدد کمیشنوں کی رپورٹوں کو لاگو کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ایسے تمام جرائم جن کے تار مختلف ریاستوں اور ملکی و بین الاقوامی سرحدوں کو چھوتے ہوں، ان کی تحقیق سی بی آئی کے ایک خصوصی ڈویژن کو دینے کی سفارش کی ہے۔ سرکاری افسران کی تقرری کے لئے خصوصی طریقہ اختیار کرنے کی تجویز دی ہے تاکہ ذمہ دارانہ مناصب پر ایسے افراد کا تقرر کیا جاسکے جو سیکولر کردار کے حامل ہوں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے بھی کمیشن نے متعدد تجاویز پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ خفیہ ایجنسیوں کے طریقہ کار اور طریقہ تفتیش، مرکز اور ریاست کے تعلقات کی نوعیت اور میڈیا کے کردار وغیرہ کے تعلق سے بھی کمیشن نے متعدد سفارشات کی ہیں۔

کمیشن نے جن تنظیموں کو بابرہ مسجد کی شہادت کے لئے نامزد کیا ہے اور اسے ان کی منصوبہ بند سازش قرار دیا ہے، کمیشن نے حیرت انگیز طور پر ان پر کسی کارروائی کا مطالبہ نہیں کیا۔ مرکزی حکومت کی عدم کارکردگی کو بھی کمیشن نے موضوع بحث نہیں بنایا۔ جن سرکاری اہل کاروں نے اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا ہے ان کے خلاف کسی تادیبی کارروائی (یعنی محکمہ جاتی کارروائی) وغیرہ کی سفارش بھی کمیشن نے نہیں کی۔ البتہ کمیشن نے جن 68 افراد کو نامزد کیا ہے ان میں سے جن کے خلاف ابھی تک مقدمات رجسٹرڈ نہیں کئے گئے ان کے خلاف مقدمات رجسٹر کرنے کی سفارش کی ہے۔

سفارشات جتنی عمومی نوعیت کی ہیں، حکومت کی ایکشن ٹیکن رپورٹ اس سے زیادہ مایوس کن اور سرسری ہے۔ کمیشن کی متعدد سفارشات کے جواب میں ایکشن ٹیکن رپورٹ کہتی کہ اسے اس سے اتفاق ہے یا اس نے اسے نوٹ کر لیا۔ ایکشن ٹیکن رپورٹ میں صرف دو تین باتیں ایسی ہیں جن کا بابرؒ مسجد انہدام سے تعلق ہے۔ مثلاً کمیشن نے جن 68 افراد کو بابرؒ مسجد کی شہادت کا ذمہ دار قرار دیا ہے، ان میں سے جن کے خلاف اب تک مقدمہ قائم نہیں کیا گیا، ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ فوجداری کے جو مقدمات رائے بریلی مجسٹریٹ کورٹ یا سی بی آئی کی لکھنوا سپیشل کورٹ میں زیر سماعت ہیں ان میں تیزی لائی جائے گی وغیرہ۔ بابرؒ مسجد ملکیت کے مقدمہ میں تیزی لائی جائے گی۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ انسداد کے لئے سرکار کی طرف سے تجویز کردہ فرقہ وارانہ فساد بل کو منظور کئے جانے کی بات بھی ایکشن ٹیکن رپورٹ میں سرکار کی طرف سے کہی گئی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ رائے بریلی کورٹ میں بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے جن آٹھ افراد کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے اور جس میں سے CBI ایک سپلیمنٹری چارج شیٹ کے ذریعہ این ڈی اے (NDA) کے دور میں سازش کی دفعہ (120, B) نکال چکی ہے، کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں از سر نو یہ دفعہ اس میں شامل کی جائے (کمیشن نے بھراحت کہا ہے کہ بابرؒ مسجد کا انہدام ایک منصوبہ بند سازش کا حصہ تھا)۔

لکھنؤ کی اسپیشل CBI عدالت میں دیگر مجرمین کے خلاف جو مقدمہ اس وقت معطل ہے اسے دوبارہ بحال کر کے اس میں تیزی لائی جائے۔ جسٹس بھلا کے فیصلہ کے بعد جن سرکاری اہلکاروں اور سیاست دانوں کے نام اس مقدمہ سے خارج کر دئے گئے ان کے نام دوبارہ ڈلوائے جائیں۔ جن افراد کے خلاف اب تک مقدمہ قائم نہیں کیا گیا ان کے خلاف FIR درج کر کے فی الفور مقدمہ قائم کیا

جائے۔ جو سرکاری اہل کار اس واقعہ کے مجرم پائے گئے ان کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کے علاوہ تادیبی کارروائی بھی شروع کی جائے۔ جو افسران ریٹائر ہو چکے ہیں، مقدمات کا فیصلہ ہونے تک ان کی تنخواہ اور دیگر سرکاری مراعات پر روک لگا دی جائے۔

کمیشن نے مضبوط دلائل اور رپورٹوں کی بنیاد پر آریس ایس، وشنو ہندو پریشد، بجرنگ دل، شیوسینا، رام جنم بھومی نیاس، بھارت کلیان پریشد وغیرہ کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ لہذا سرکار اس رپورٹ کی روشنی میں ان پر پابندی عائد کرے۔ بی جے پی کے جن رہنماؤں کو اس واقعہ کا مجرم قرار دیا گیا اور جن کے خلاف عدالتوں میں مقدمات بھی درج ہیں ان کے الیکشن لڑنے پر پابندی عائد کی جائے اور جو لوگ اس وقت قانون ساز اداروں کے ممبر ہیں ان کی ممبر شپ ختم کی جائے۔

کلیان سنگھ بحیثیت وزیر اعلیٰ نہ صرف اس واقعہ کے لئے براہ راست ذمہ دار ہیں بلکہ انہوں نے سپریم کورٹ کو دئے گئے عہد کو توڑا ہے لہذا ان پر توہین عدالت Contempt of Court کا مقدمہ قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ سرکار اس بات کا اہتمام کرے کہ فوجداری کے مقدمات کی روز بروز سماعت ہو تا کہ یہ مقدمات جو 17 سال کے بعد بھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہیں جلد از جلد فیصلہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ملکیت کے مقدمے کی بھی روز بہ روز سماعت اور اس کو جلد از جلد فیصلہ کرانے کا سرکار کو اہتمام کرنا چاہئے۔ نیز سرکار کو پارلیمنٹ کے فلور پر یہ وعدہ بھی کرنا چاہئے کہ ملکیت کے مقدمہ کا جو بھی فیصلہ ہو گا سرکار اس کو نافذ کرائے گی۔



لبراہن کمیشن رپورٹ کی افادیت: ایک مطالعہ

مشتاق احمد ایڈوکیٹ آن ریکارڈ

سپریم کورٹ آف انڈیا

تحقیقاتی کمیشنوں کی معنویت اور افادیت کے بارے میں یہ آفاقی مثل مشہور ہے کہ حکومت جب کسی ایشو پر عوامی غصے کو دبانا یا ٹھنڈا کرنا چاہتی ہے تو کمیشن آف انکوائری ایکٹ کے تحت کسی قائم مقام یا سبک دوش جج کی سربراہی میں انکوائری کمیشن قائم کر دیتی ہے۔ کمیشن اپنا کام کرتا رہتا ہے اور جب تک اس کی رپورٹ آتی ہے، اس مخصوص ایشو کے تعلق سے عوامی غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہوتا ہے۔ ادھر کمیشن جو رپورٹ دیتا اور جو سفارش پیش کرتا ہے حکومت اس کو ماننے کے لئے پابند نہیں ہوتی۔ پہلے تو حکومت اس قسم کی رپورٹ کو عام بھی نہیں کرتی تھی لیکن بھلا ہو سپریم کورٹ کا کہ جس نے ایک فیصلے میں یہ کہہ دیا کہ حکومت پر لازم ہے کہ وہ رپورٹ کو عام کرے اور عوام کو یہ بھی بتائے کہ اس کا ارادہ رپورٹ پر عمل کرنے کا ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں تک۔ اس فیصلے کی وجہ سے ہی حکومت نے لبراہن کمیشن کی رپورٹ کو عام کیا اور اس کے ساتھ ایک لولی لنکڑی ایکشن ٹیکن رپورٹ بھی پیش کر دی۔

انکوائری کمیشن کا سربراہ بہت عرق ریزی اور جاں فشانی سے کام کر کے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرتا ہے۔ اس پر ایک بڑا صرفہ آتا ہے لیکن نتیجہ صفر ہوتا ہے۔ اس بات کو سپریم کورٹ نے محسوس کیا اور اسی لئے یہ آواز اٹھنے لگی کہ حکومت یہ

یقین دلائے کہ وہ رپورٹ پر عمل کرے گی۔ ورنہ یہ توجج کے لئے بڑی ہتک آمیز بات ہے کہ وہ برسوں کی محنت کے بعد حکومت کو رپورٹ پیش کرے اور حکومت اس پر کوئی کارروائی نہ کرے اور اگر کرے بھی تو نہایت بے دلی سے اور محض دکھانے کے لئے۔ رپورٹ پر عمل کرنے کی ہندوستان میں صرف ایک مثال ملتی ہے۔ وہ ہے بہار شریف فساد کی انکوائری رپورٹ۔ اس پر عمل کرتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعلیٰ جگن ناتھ مشرا نے خصوصی عدالت قائم کی اور جن ملزموں کی نشاندہی کی گئی تھی ان کے خلاف مقدمہ چلا کر ان کو قرار واقعی سزا دلوائی۔

ارتقائی منازل

6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد انہدام کے بعد اس وقت کے وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ نے فوری طور پر تین قانونی اقدامات کئے تھے۔ اول: اجودھیا حصول آراضی ایکٹ منظور کر کے بابری رام جنم بھومی والی متنازعہ زمین کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ دوم: آئین ہند کی دفعہ 144 کے تحت صدر جمہوریہ ہند نے سپریم کورٹ سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا کہ کیا متنازعہ عمارت پر بابری مسجد سے پہلے کوئی اور عبادت گاہ تھی اور سوم: جسٹس منموہن سنگھ لبرائن کمیشن کی تشکیل کی۔ اول اور دوم کے تعلق سے سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ 25 اکتوبر 1995 کو صادر ہوا۔ اجودھیا حصول آراضی ایکٹ کی کچھ دفعات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے کہا کہ ملکیت کے مقدمات کے فیصلے تک وہ متنازعہ زمین مرکزی حکومت کی تحویل میں رہے گی اور جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوگا اس کو سونپ دی جائے گی۔ اگر مسجد کے حق میں فیصلہ آتا ہے تو مسجد میں آنے جانے کے لئے جگہ بھی مسلمانوں کو حکومت فراہم کرے گی۔ اس فیصلے میں بابری مسجد انہدام کو قومی شرم اور انہدام کاروں کو غنڈے کہا گیا ہے۔ صدارتی رائے طلبی پر سپریم کورٹ نے مشورہ دینے سے یہ کہتے

ہوئے انکار کر دیا کہ یہ مسئلہ سیاسی نوعیت کا ہے۔

ہندوستان میں انکوائری کمیشنوں کی تاریخ میں جہاں لبرالہن کمیشن کو اس لئے یاد کیا جائے گا کہ اس پر سب سے زیادہ وقت اور پیسے کا صرفہ آیا ہے۔ وہیں اس لئے بھی یاد کیا جائے گا کہ یہ واحد کمیشن ہے جو ان حقائق کا پتہ لگانے کے لئے قائم کیا گیا تھا جس کا علم سب کو تھا۔ جن افراد اور تنظیموں نے بابر مسجد کا انہدام کیا انہوں نے بہ بانگ دہل اس کا اعتراف بھی کیا اور یہ دعوا کیا کہ انہوں نے ہی بابر مسجد گرائی ہے۔ پوری دنیا نے بھی اس المناک کارروائی کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔

شروع میں کمیشن کی کارروائی لکھنؤ میں چلی۔ بعد میں اس کا دفتر مستقل طور پر نئی دہلی کے دگیان بھون انیکسی میں منتقل ہو گیا۔ کمیشن کی پوری کارروائی دگیان بھون ہی میں مکمل ہوئی۔ پوری کارروائی کی ٹیپ ریکارڈنگ ہوئی۔ دوران سماعت بہت سے ویڈیو کیسٹ شواہد کے طور پر پیش کئے گئے۔ جو ٹی وی پر دیکھے گئے۔ راقم حروف کو ڈاکٹر سید فاروق صاحب نے ایک ویڈیو کیسٹ دیا تھا جسے کمیشن میں بطور ثبوت پیش کیا گیا اور بھری عدالت میں اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ویڈیو اور آڈیو کیسٹ پیش کئے گئے جن میں اوما بھاتی اور سادھوی رتمبھرا کی نفرت انگیز اور زہر آلود تقریریں تھیں۔

کمیشن کے سامنے فریق

انکوائری کمیشن ایک عام تحقیقاتی کمیشن ہوتا ہے جس میں کوئی فریق نہیں ہوتا۔ البتہ کوئی بھی فرد یا ایسی تنظیم فریق بن سکتی ہے جس کے پاس ریفرنس کے تعلق سے واقعاتی یا دستاویزی ثبوت ہو۔ کمیشن اخبارات میں نوٹس جاری کر کے عوام الناس کو خطاب کرتا ہے۔ کمیشن نے عام نوٹس کے علاوہ کچھ خاص تنظیموں اور افراد کو بھی نوٹس بھیجا تھا۔ جیسے کہ وی ایچ پی، بی جے پی، بابر مسجد ایکشن کمیٹی اور جناب سید

شہاب الدین وغیرہ۔ جب کمیشن کا دفتر لکھنؤ میں تھا تو اس میں سید شہاب الدین اور ظفر یاب جیلانی وغیرہ حاضر ہوئے تھے اور حلف نامہ داخل کرنے کے لئے مہلت مانگی تھی۔ لیکن جب کمیشن کا دفتر وگیان بھون انیکسی میں منتقل ہو گیا تو پھر معاملہ یکطرفہ ہو گیا۔ یعنی دہلی میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی پیروی نہیں ہو رہی تھی۔ جب کہ وی ایچ پی، بی جے پی اور کلیان سنگھ، فیض آباد کے ایس ایس پی مسٹر رائے اور وہاں کے ضلع مجسٹریٹ مسٹر شری واستو کے وکلا مستقل طور پر پیروی کر رہے تھے۔ یہ 1997 کی بات ہے۔ اسی زمانے میں راقم نے یہ درخواست دی کہ سوسائٹی فار جسٹس کو پارٹی بنایا جائے۔ دوسرے فریقوں کی مخالفت کے باوجود اسے فریق بنایا گیا۔ جس کی طرف سے راقم نے وکالت شروع کی۔ راقم کی کتاب 'بابری مسجد، سیکولرزم اور سپریم کورٹ' کی ایک کاپی کمیشن میں داخل کی گئی۔ جس وقت راقم نے وکالت شروع کی، اس وقت پرم ہنس رام چندر داس اور اشوک سنگھ کی گواہی قلمبند ہو رہی تھی۔ راقم نے ان دونوں سے تفصیلی جرح کی تھی جو کئی دنوں تک چلی۔ پرم ہنس رام چندر داس ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے 22-23 دسمبر 1949 کی درمیانی شب میں بابری مسجد کے اندر مورتیاں رکھ دی تھیں۔ ان لوگوں کے علاوہ کمیشن میں جن معروف لوگوں کی گواہی ہوئی ان میں کئی کمانڈنٹ، یو پی حکومت کے کئی اعلیٰ افسران جیسے کہ اس وقت کے چیف سکریٹری پر بھات کمار، اس وقت کے مرکزی داخلہ سکریٹری مادھو گوڈ بولے (جنہوں نے بابری مسجد انہدام پر ایک کتاب بھی لکھی ہے) ملائم سنگھ یادو، آچار یہ دھرمیندر، وشنو ہری ڈالمیا، اوما بھارتی اور پی وی نرسمہا راؤ قابل ذکر ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد سید شہاب الدین صاحب نے ایک وکیل کے ساتھ ایک دو تاریخوں پر حاضری دی جو بعد میں جاری نہ رہ سکی۔

اس زمانے میں راقم کا ایک مضمون 'بابری مسجد مقدمات اور ہماری ذمے داریاں' ملک کے اخباروں خاص طور پر جنوبی ہند کے اخباروں میں شائع ہوا جس سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ مشتاق احمد ایڈوکیٹ تن تنہا لبرالہن کمیشن میں پیروی کر رہا ہے۔ کچھ قارئین نے اس سلسلے میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو خطوط لکھے اور کہا کہ مشتاق ایڈوکیٹ نے جو کچھ لکھا ہے کیا وہ صحیح ہے۔ اگر نہیں تو پرسنل لا بورڈ اس کی تردید کرے یا پھر یہ بتائے کہ وہ اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے۔ (واضح ہو کہ بابری مسجد انہدام کے بعد بورڈ نے مقدمات کی ذمے داری اپنے سر لے لی تھی)۔ پھر جناب امین الحسن رضوی اور بورڈ کے سکریٹری مولانا نظام الدین صاحبان نے اوکھلا میں واقع بورڈ کے مرکزی دفتر میں راقم کو طلب کیا اور بورڈ کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے کہا۔ راقم بورڈ کی طرف سے پیروی اپنی شرائط پر کرنا چاہتا تھا۔ لہذا بات نہیں بن سکی۔ اس کے بعد بورڈ کی طرف سے سینئر ایڈوکیٹ جناب یوسف حاتم چھالا صاحب اپنے ایک جونیئر کے ساتھ کمیشن میں پیش ہونے لگے۔ اس درمیان اسلم بھورے کی طرف سے اوپی شرما ایڈوکیٹ بھی پیروی کرنے لگے۔ اب مسلمانوں کی طرف سے پیروی کافی وزنی ہو گئی۔ بورڈ نے اپنی جانب سے حکیم ظل الرحمن کو مقرر کیا تھا جنہوں نے اپنے وکلاء کی بھرپور مدد کی اور ایسے کاغذات اور مواد مہیا کرائے گئے جو بہت مفید ثابت ہوئے۔ بعد میں جانے کس وجہ سے انہوں نے کمیشن میں آنا بند کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی جانب سے پیروی متاثر ہوئے بخیر نہیں رہ سکی۔

کچھ گواہیوں کے بارے میں

گواہیوں کی قلمبندی کے دوران کچھ ایسی باتیں بھی ہوئیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ شروع میں جب ملائم سنگھ کو کمیشن نے سمن بھیجا تو انہوں نے یہ

کہہ کر آنے سے انکار کر دیا کہ انھیں اس واقعہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس پر راقم حروف نے ان سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے گواہی نہ دینے سے مسلمانوں میں غلط پیغام جائے گا۔ انصاف کا بھی تقاضہ ہے کہ آپ گواہی دیں۔ اس کے بعد وہ گواہی کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کی گواہی تین دنوں تک قلمبند ہوتی رہی۔ اس دوران ظفریاب جیلانی صاحب بھی کمیشن میں موجود رہے۔ ملائم سنگھ کی گواہی سب سے اچھی گواہی تھی۔ مخالف وکیل نے جرح کے دوران ان سے ایک عجیب و غریب سوال پوچھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ آپ شروع میں ایک پہلوان تھے اور اپنی بھینس کی پیٹھ پر سر کی طرف سے چڑھ کر بیٹھتے تھے۔ ملائم سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی ذاتی زندگی کی سچائی کو تسلیم کیا۔ اس پر جج صاحب اور دوسروں کی نظروں میں ان کا قد اور بلند ہو گیا تھا۔

ادھر جب اوما بھارتی کی گواہی چل رہی تھی تو وہ مرکزی کھیل وزیر تھیں۔ وہ بہت چالاک اور تیز طرار ہیں۔ کوئی وکیل جب ان سے سوال کرتا تو وہ الٹا سیدھا جواب دیتیں یا پلٹ کر سوال کر دیتیں اور وکیل لا جواب ہو جاتا۔ مسٹر اوپی شرما کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس لئے راقم نے ان سے جرح کرنے سے قبل خاصی تیاری کی تھی۔ پچھلے پندرہ برسوں کے ہندی کے رسالوں سے ان کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی تھیں اور کامیابی کے ساتھ ان سے جرح کی۔ جرح کے دوران وہ نفسیاتی طور پر پوری طرح راقم کے کنٹرول میں آ گئی تھیں۔ ایک سوال کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میں نے اوما بھارتی سے پوچھا ”اوما جی آپ نے اپنی گواہی میں کہا ہے کہ بابر ایک آکرمن کاری اور گھس پیٹھیا تھا۔ لیکن اسے تو ایک ہندو راجہ نے ہندوستان آنے کے لئے سادرا منتر کیا تھا“۔ اوما بھارتی نے جواب دیا ”وہ راجہ غدار تھا“۔ اس پر راقم نے یہ کہہ کر ان کو زروس کر دیا کہ ”چلئے آپ نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ وہ آکرمن کاری نہیں تھا بلکہ مدعو تھا“۔

کمیشن کی اصل رپورٹ

کمیشن نے 68 افراد کو بابرى مسجد انہدام کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ کمیشن نے کچھ سفارشات بھی کی ہیں جو نئی نہیں ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ جن 68 لوگوں کو قصور وار مانا گیا ہے ان کے خلاف کیا ہونا چاہئے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ مرکزی حکومت ان کے خلاف تازہ ایف آئی آر درج کرے، چارج شیٹ داخل کرے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائے۔ لیکن یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ جسٹس لبراہن نے جن کو ملزم گردانا ہے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن پر پہلے سے ہی بابرى مسجد انہدام کے سلسلے میں فوجداری مقدمات چل رہے ہیں۔ آئیے ذرا ان مقدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتے ہیں۔

6 دسمبر 1992 کو جب بابرى مسجد گرائی گئی تو وہاں کے مقامی پولیس اسٹیشن میں 49 ایف آئی آر درج ہوئی تھیں۔ جن میں سے 47 پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگوں نے درج کرائی تھیں، جو ان کو زد و کوب کرنے، کیمرے توڑنے اور جیب سے جبراً پیسے نکالنے کے تعلق سے تھیں۔ اور دو ایف آئی آر نمبر 97 اور 98 ایل کے اڈوانی، اشوک سنگھل، پرم ہنس رام چندر داس، کلیان سنگھ، اوما بھارتی، سادھوی رتمبھرا اور ورنے کٹیار وغیرہ کے خلاف درج ہوئی تھیں۔ واضح رہے کہ ان مقدمات کی تفتیش سی بی آئی سے کرائی گئی اور لکھنؤ میں ان دو مقدمات کی سماعت کے لئے خصوصی عدالت قائم کی گئی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ریاستی حکومت ہائی کورٹ سے مشورہ کے بعد ایک نوٹی فکیشن کے ذریعے خصوصی عدالت قائم کرتی ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں اڈوانی وغیرہ نے اس نوٹی فکیشن کو چیلنج کیا اور جس عدالت نے ٹرائل کے لئے ان ملزمان کو سمن جاری کیا تھا، لکھنؤ ہائی کورٹ کے جسٹس جگدیش بھلا کے اس فیصلے کے بعد کہ نوٹی فکیشن غیر قانونی اور نقائص سے پر ہے،

مقدمہ چلانے کے نا اہل ہو گئی۔ اس کا براہ راست نتیجہ یہ نکلا کہ ملزمان بغیر ٹرائل کے ہی بری ہو گئے۔ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد سپریم کورٹ میں اپیل کی جاسکتی تھی۔ لیکن نہ تو سی بی آئی نے اپیل کی نہ ہی یو پی حکومت نے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپیل نہیں کر رہا تھا اور اپیل کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ اس طرح ایک ایسا مرحلہ آ گیا کہ اتنے بڑے مقدمات کے اتنے سارے ملزمان تکنیکی بنیاد پر بری ہو گئے۔

لیکن راقم حروف نے سب سے پہلے سوسائٹی فار جسٹس کی طرف سے سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ اس کے بعد ممبئی کی سماجی کارکن تیتا سیتل واڈ اور اسلم بھورے نے اپیل دائر کی۔ او پی شرما اوڈو کیٹ کی کوششوں سے یو پی حکومت پر دباؤ پڑا اور اس وقت کی وزیراعلامایاوتی نے دوسرا نوٹی فکیشن جاری کر کے پہلے نوٹی فکیشن کے نقص کو دور کر دیا۔ اس کے بعد دونوں فوجداری مقدمات زندہ ہو گئے۔ لیکن انھوں نے یا نو کر شاہی نے ایک خرابی کی صورت پیدا کر دی کہ ایک مقدمہ کو لکھنؤ میں ہی چلنے دیا اور دوسرے کو رائے بریلی کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ یہ سراسر بد نیتی تھی ورنہ دونوں مقدمات ایک ساتھ قائم ہوتے۔ اب ان مقدمات کی پوزیشن کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب اس بارے میں مقامی اخبارات میں بھی کوئی خبر نہیں آتی۔ ملزمان کو حاضری سے چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ اب جسٹس لبراہن کمیشن رپورٹ کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بابری مسجد کے نامزد ملزموں کے مقدمات کی یہ حالت ہے کہ وہ یوں ہی پڑے ہوئے ہیں جب کہ ان کی جانچ سی بی آئی نے کی تھی، تو پھر یہ امید کیسے کی جائے کہ لبراہن کمیشن نے جن کی نشاندہی کی ہے ان کے خلاف از سر نو مقدمات دائر ہوں گے۔ یا اضافی فرد جرم داخل ہوگا اور انھیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کے لئے حکومت پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بجا طور پر مطالبہ کیا ہے کہ کمیشن کی سفارشات پر عمل کر کے

نشان زد 68 ملزموں کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کئے جائیں۔

تنقیدی جائزہ

لبرائن کمیشن رپورٹ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے ایک سابق وزیراعظم اٹل بھاری واجپئی کو انہدام کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے اور نرسمہاراؤ کو کلین چٹ دے دی ہے۔ کمیشن کی کارروائی کے دوران واجپئی کو سمن جاری کرنے کے لئے درخواست دی گئی تھی جسے کمیشن نے یہ کہہ کر خارج کر دیا تھا کہ واجپئی کے خلاف بادی النظر میں ثبوت غنقا ہے۔ لہذا ان کو سنے بغیر ان کے خلاف ایسی رپورٹ دینا قانون فطرت (Natural Justice) کے سنہرے اصولوں کے خلاف ہے۔ پھر کمیشن آف انکوائری ایکٹ کی دفعہ 8B میں یہ بات خاص طور سے کہی گئی ہے کہ بغیر کسی کو سنے اس کے خلاف کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ اگر واجپئی کمیشن رپورٹ کے اس حصے کو عدالت میں چیلنج کریں تو وہ حذف (Expunge) ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی عدالتی نظیر موجود ہے۔ کمیشن کے ریفرنس میں ایک ریفرنس یہ بھی ہے کہ کمیشن ان حالات کی نشاندہی کرے جن کی بنیاد پر انہدامی کارروائی ہوئی۔ وہ حالات 22-23 دسمبر 1949 سے شروع ہوتے ہیں جب مسجد کے اندر مورتیاں رکھی گئیں۔ 1986 میں مسجد کا تالا کھولا گیا اور پھر شلائیناس ہوا۔ یہ تمام کارروائیاں کانگریس دور حکومت میں ہوئی ہیں۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ نرسمہاراؤ بابرئ مسجد کے انہدام میں درپردہ ملوث رہے ہیں۔ انھوں نے عوام کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے لال قلعہ سے اعلان کیا تھا کہ بابرئ مسجد کی تعمیر اسی مقام پر کی جائے گی۔ جہاں تک مسلم تنظیموں کی بات ہے تو یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے۔ لیکن ان پر کمیشن کی تنقید نامناسب ہے۔ یہ صرف توازن قائم کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

اب کیا کرنا چاہئے

اس وقت بابرئ مسجد کے تعلق سے تین قسم کے مقدمات زیر سماعت ہیں۔ اول: ملکیت کے مقدمات جو لکھنؤ ہائی کورٹ میں چل رہے ہیں۔ دوم: فوجداری کے دو مقدمات جو لکھنؤ اور رائے بریلی کی خصوصی عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ اور سوم: توہین عدالت کے مقدمات جو سپریم کورٹ میں اڈوانی اور کلیان سنگھ وغیرہ کے خلاف معرض التوا میں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملکیت کے مقدمات میں مزید موثر پیروی کی جائے اور وہاں کے وکلاء جن کی قیادت ظفریاب جیلانی صاحب کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ قانونی امداد کی شکل میں انھیں کمک پہنچائی جائے اور ملکیت کے مقدمات میں جیت کو یقینی بنایا جائے۔ اس قسم کے بیانات سے پرہیز کیا جائے کہ عدالت کا جو بھی فیصلہ ہوگا مسلمان اسے تسلیم کریں گے۔ ایسے بیانات سے جج صاحبان کا دماغ متاثر ہو سکتا ہے۔ فوجداری کے مقدمات میں سی بی آئی کا سرکاری وکیل کچھ نہیں کر رہا ہے اس لئے اس میں مسلمان اپنا وکیل مقرر کریں اور ایسی منظم اور اعلیٰ حکمت عملی پر مبنی پیروی کریں کہ ملزمان کو سزا مل سکے اور اسی طرح سے سپریم کورٹ میں زیر سماعت توہین عدالت کے مقدمات میں بھی ملزموں کی سزا کو یقینی بنایا جائے۔

رپورٹ کی افادیت

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رپورٹ بالکل غیر مفید اور عبث ہے۔ اس رپورٹ کی تاریخی اور دستاویزی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص آج سے پچاس یا سو سال بعد اس کی اہمیت محسوس کی جائے گی۔ کیوں کہ دستاویزی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بابرئ مسجد کن افراد اور تنظیموں نے منہدم کی۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ منظم پلاننگ اور سازش کے تحت بابرئ مسجد توڑی گئی

تھی۔ دشمن شاطر اور جھوٹا ہے اور اسی لئے 6 دسمبر 92 سے قبل سپریم کورٹ میں بحث کے دوران آنجہانی اوپی شرمانے ان تنظیموں، ان کے افراد اور ان کے کارکنوں کو گوبلز کی اولاد کہا تھا اور اب وہ جھوٹ اور صرف جھوٹ کا سہارا لے کر بابر مسجد انہدام کے جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔



کمیشن نے مجرموں کے خلاف کارروائی کی سفارش کیوں نہیں کی؟

ہرش مندر

(سابق آئی اے ایس و معروف مصنف)

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر انسانی تاریخ پر پڑتا ہے۔ میری نسل میں اس قسم کا واقعہ 6 دسمبر 1992 کو اس وقت پیش آیا جب قرون وسطیٰ کی تاریخی بابر مسجد کو انتہا پسندوں کی ایک بھیڑ نے شہید کر دیا۔ آزاد ہندوستان کی ایک دہائی سے زیادہ کی مختصر تاریخ میں ایک چھوٹا سا خطہ زمین ”اجودھیا“ ملکی سیاست پر غالب آ گیا۔ حکومتیں آئیں اور گئیں، رہ رہ کر سڑکوں پر خون بہایا گیا، ہزاروں لوگوں کی جانیں گئیں اور مکانات نذر آتش کئے گئے۔ اور یہ سب کچھ جس معاملہ کو لے کر ہوا وہ معاملہ یہی تھا کہ 1527 میں پہلے مغل بادشاہ بابر کے ذریعہ بنائی گئی بابر مسجد کو قائم رکھا جائے یا اس کی جگہ عالیشان مندر تعمیر کیا جائے۔ بابر مسجد کے معاملہ کو ہندو قوم پرست جماعتوں نے ایک بڑا معاملہ بنالیا۔ یہ وہ جماعتیں تھیں جنہوں نے آزادی سے پہلے ہی اس کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ متنازعہ زمین کو لے کر یہ معاملہ رام کے ماننے والوں یا خدا کے ماننے والوں کے دعویٰ سے جڑا ہوا نہیں تھا بلکہ یہ معاملہ سیدھے طور پر آزاد ہندوستان کی قسمت سے جڑا ہوا تھا کہ آزاد ہندوستان میں تمام لوگوں کو آزادانہ طور پر عبادت کرنے کی آزادی ہوگی، انھیں بھی برابری کا درجہ ملے گا اور ملکی قانون کے تحت انھیں بھی تحفظ فراہم کرایا جائے گا یا پھر ہندوستان ایک ایسا ملک بن جائے گا جہاں کے

اقلیتی افراد ثقافتی اور آئینی لحاظ سے دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہ جائیں گے؟
 گاندھی کے قتل سے کثیر مذہبی ثقافت پر یقین رکھنے والے لوگ سکتے ہیں
 آگئے۔ آرائیں ایس اور اس کی سیاسی جماعت جن سنگھ جنھیں گاندھی کے قتل کے
 لئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا ہندوستانی سیاست میں حاشیہ پر رہیں، لیکن اس وقت انھیں
 سیاست میں جگہ ملی جب انھیں ایمر جنسی کے خلاف جدوجہد کرنے کی اجازت مل
 گئی۔ 1984 کے عامی انتخاب میں بی جے پی نے صرف ۴ سیٹوں پر ہی کامیابی
 حاصل کی۔ اسے ہندو اکثریت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کسی ٹھوس ہندو
 علامت کی ضرورت تھی اور بابری مسجد کی شکل میں اسے یہ علامت مل گئی۔ 1949
 میں یہاں رام کی مورتی رکھ دی گئی۔ اس وقت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے، کے نار نے
 نے مسجد کو مورتی سے خالی کرانے کے نہرو کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ نار نے
 بعد میں جن سنگھ میں شمولیت اختیار کر لی اور وہ اس کے ایم پی بن گئے۔ مسجد میں
 مسلمانوں کی عبادت پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن ہندوؤں کو ایک محدود دائرے
 میں پوجا کرنے کی چھوٹ دے دی گئی۔ 1986 میں ایک عدالتی فیصلہ کے تحت
 جسے کانگریس کی مرکزی حکومت کی بھی حمایت حاصل تھی، مسجد کے دروازے
 ہندوؤں کے لئے کھول دئے گئے تاکہ وہ وہاں پوجا کر سکیں۔ ستمبر 1990 میں بی
 جے پی لیڈر ایل کے اڈوانی کی رتھ یاترا نے بھی فرقہ واریت کو ہوا دی۔ ایئر
 کنڈیشن گاڑی پر سوار ہو کر وہ سوماتھ سے اجودھیا تک تقریباً 10,000 کلومیٹر
 کی مسافت طے کرنے کے لیے نکل پڑے۔ واضح ہو کہ سوماتھ وہی مقام ہے
 جہاں ۱۰۲۶ میں غزنوی نے حملہ کر کے سوماتھ کے مندر کو مسمار کر دیا تھا۔ سوماتھ
 سے اجودھیا تک اس رتھ یاترا کے گزرنے سے ہر طرف فرقہ واریت کو ہوا ملی اور
 ملک کے مسلمان ڈر اور خوف کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ ان دنوں جو نعرے لگائے
 جا رہے تھے وہ بہت زیادہ خوفناک تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں سے کہا جا رہا تھا

”مسلمانوں کے دو استھان پاکستان یا قبرستان“۔ پولیس کو بغاوت پر ابھارا گیا اور یہ نعرہ لگایا گیا ”ہندو ہندو بھائی بھائی بیچ میں پولیس کہاں سے آئی“۔ یہ گیت گایا جا رہا تھا ”رام لالا ہم آئیں گے مندر وہیں بنائیں گے“۔

بابری مسجد کی شہادت کے 17 سال بعد لبرائین کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی ہے۔ کمیشن نے آ ر ایس ایس اور بی جے پی کو بابری مسجد کی شہادت کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ اس معاملہ میں افسوسناک بات یہ ہے کہ اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے نہ تو مسجد کو بچانے کی کوشش کی اور نہ ہی وہاں 36 گھنٹوں کے دوران بنائے جانے والے مندر کی تعمیر کو روکنے کے لئے کوئی عملی کوشش کی۔ ان کی یہ پالیسی ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے تھی نہ کہ قانون کی حفاظت کے لئے۔

مسجد کی شہادت کے بعد ملک میں فسادات کا دور چل پڑا جو 2002 کے گجرات فسادات تک جاری رہا۔ بی جے پی اس کے سہارے 90 کی دہائی کے آخر میں اتحاد بنا کر حکومت میں آئی۔ عدلیہ نے ابھی تک 1992 کے مجرموں کو سزا نہیں دی ہے۔ لبرائین نے بی جے پی اور آ ر ایس ایس کے مجرمانہ کردار کو ثابت کر دیا ہے لیکن ان کے خلاف کسی ایکشن کی سفارش نہیں کی ہے۔ کانگریس کی مرکزی حکومت نے اس رپورٹ کو منظور کرنے میں بڑی عجلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ سپریم کورٹ نے اس معاملہ میں ابھی تک اپنے فیصلہ کو محفوظ رکھا ہے جس کی وجہ سے قانون کی بحالی ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت اور ہندو شدت پسندوں کے سراٹھانے کی وجہ سے ہندوستان کی انصاف پسند اور کثیر مذہبی شبیہ کو نقصان پہنچا۔ لیکن ہندوستان کے امن پسند ہندو اور مسلمان ایک بار پھر سامنے آ گئے۔ انھوں نے 2004 کے عوامی انتخاب میں شدت پسند ہندو تنظیموں کے خلاف ووٹ دیا اور انھیں حکومت سے بے دخل کر دیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہندو شدت پسند طاقتیں پوری طرح ٹوٹ چکی ہیں اور ہندوستان میں ایک بار پھر قومی یکجہتی کا دور شروع ہو چکا ہے۔

رپورٹ کی کچھ باتیں صحیح کچھ غلط

محمد عبدالرحیم قریشی

جسٹس لبراہن کمیشن رپورٹ پر تبصرہ آرائی جاری ہے اور عام تبصرہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی، وہی باتیں ہیں جن کو لوگ جانتے تھے۔ یہ تبصرہ پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریباً تمام لوگوں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یہ ضرور سمجھتے تھے کہ بابر کی مسجد کی شہادت کے سنگین جرم کی ذمہ داری آر ایس ایس، وی ایچ پی، بی جے پی اور بجرنگ دل؛ وشیو سینا پر عائد ہوتی ہے، لیکن عدالتی تحقیقات کے بعد کسی تحقیقاتی کمیشن کا یہ نتیجہ اخذ کرنا اور ان ہندو تو وادی جماعتوں کو ذمہ دار اور ملزم گردانے کی بات اور ہوتی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت قرار پاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لبراہن کمیشن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بابر کی مسجد کی عمارت کو منہدم کرنے کی واردات کسی فوری اشتعال کے نتیجہ میں انجام نہیں دی گئی، بلکہ اس جرم کے ارتکاب کے لئے منصوبہ تیار کیا گیا تھا اور اس منصوبہ کے مطابق یہ کام انجام دیا گیا۔ موقتی (SPONTANEOUSLY) کسی اشتعال کے رد عمل کے طور پر اس مسجد کی عمارت ڈھائی نہیں گئی بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ کارروائی کی گئی۔ کمیشن نے منطقی طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ بابر کی مسجد کو منہدم کرنے کی سازش جماعتوں اور ان کے لیڈروں نے کی۔ کمیشن کا یہ نتیجہ تحقیق بڑا اہم ہے۔ بابر کی مسجد کی شہادت کے تعلق سے اجودھیا پولیس کی درج کردہ دوایف آئی آر کی تفتیش کے بعد سی بی آئی نے چارج شیٹ میں مجرمانہ سازش

کا الزام عائد کیا تھا، مگر بعد میں یہ الزام ہٹا لیا گیا اور چارج شیٹ دو حصوں میں تقسیم کی گئی۔ ایک کی سماعت چیونٹی کی رفتار سے رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں 8 ملزمین کے خلاف جاری ہے اور دوسری کی سماعت لکھنؤ کی خصوصی عدالت میں ابھی شروع نہیں ہوئی ہے۔ حکومت ہند نے رپورٹ کے کسی حصہ کو رد نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں حکومت ہند کی ذمہ داری بنتی ہے کہ مجرمانہ سازش کی فوجداری دفعہ دونوں چارج شیٹ میں بڑھائی جائے اور اس تعلق سے جو شہادت سی بی آئی نے جمع کی ہے، اس کو چارج شیٹ میں شامل کیا جائے۔ سی بی آئی کا جو رویہ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند انہدام کے مجرموں کو قانون کی گرفت میں لانے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ جسٹس لبراہن کمیشن کی رپورٹ کے بعد یہ تساہل دور ہونا چاہئے۔ اے ٹی آر (ACTION TAKEN REPORT) میں صرف یہ وعدہ کہ سماعت میں تیزی لانے کے اقدامات کئے جائیں گے، کافی نہیں ہے بلکہ ان مقدمات کی تیزی سے شنوائی کے لئے سی بی آئی کو سخت ہدایت جاری کرنا ضروری ہے، کیونکہ سی بی آئی ہی سست رفتاری کی ذمہ دار ہے۔

لبراہن کمیشن نے 6 دسمبر 1992 کے سانحہ کے لئے اعلیٰ جنس کی ناکامی کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور یہ ریمارک تک کیا ہے کہ صورتحال کے تجزیہ کو پیش کرنے میں اعلیٰ جنس کی ناکامی نے حکومت کو بے دست و پا کر دیا۔ حکومت ہند کا ملکی معاملات میں اہم ترین اعلیٰ جنس ادارہ اعلیٰ جنس بیورو (IB) ہے، جس کا ڈائریکٹر ہر روز وزیراعظم اور مرکزی وزیر داخلہ کو صورتحال کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس اہم ترین ادارے کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہ حکومت کا ادارہ یا شعبہ نہیں، بلکہ آر ایس ایس کا ادارہ یا شعبہ ہے، جو حکومت کو آر ایس ایس کے ایجنڈہ کے مطابق صورتحال کا تجزیہ پیش کرتا ہے، جس میں جھوٹی خبروں اور افواہوں کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کو بڑھانے اور ہندو تو وادیوں کی قابل اعتراض

سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مہاراشٹر کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ایس ایم مشرف نے حال ہی میں شائع شدہ، حقیقت افروز کتاب ”کس نے کر کرے کا قتل کیا“ میں کئی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ ملک کا اہم ترین مرکزی اعلیٰ جنس ادارہ آئی بی آر ایس ایس کے ایجنڈے پر کام کرتا ہے۔

لبر اہن کمیشن رپورٹ کے پیرا گراف (160.11) میں یہ بات کہی گئی ہے کہ آر ایس ایس، بی جے پی اور وی ایچ پی نے سیکولرزم کی تعریف کو اوندھا کر دیا اور اس کو ایسے معنی پہنائے جو بالکل برعکس اور متضاد ہیں اور جو دستور میں دیئے گئے تصور کے برخلاف ہیں۔ کمیشن نے اس کے بعد کے پیرا گراف میں کہا ہے کہ سیکولرزم کے بارے میں یہ جمہوریت کش نقطہ نظر پھیل رہا ہے جس سے بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور ہماری جمہوریت کے اہم ستون کے گرنے کا اندیشہ ہے۔ کمیشن کا یہ نقطہ نظر قابل غور ہے۔ حکومت اور سیکولرزم کی دہائی دینے والی سیاسی جماعتوں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ سیاسی جماعتوں میں سب سے پہلے کانگریس سامنے آتی ہے۔ اگر کانگریس گجرات کے عوام کو جا کر انھیں بتاتی کہ ملک کی قوت اور سالمیت کے لئے سیکولرزم اور مذہبی رواداری کتنی ضروری ہے اور اقلیت دشمنی سے ملک کو کیسے کیسے خطرات لاحق ہوں گے اور اس عوامی مہم کے ذریعہ ان کے اندر مسلمانوں کے قتل عام کے تعلق سے دکھ اور افسوس کا جذبہ پیدا کیا جاتا تو اس ریاست میں کانگریس کی یہ درگت نہ بنتی اور قاتل نریندر مودی کو سینہ تان کر کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوتی۔

رپورٹ کے پیرا گراف (171) میں ان 68 افراد کی فہرست دی ہے گئی جنھیں کمیشن نے خاطی پایا ہے۔ اس فہرست میں 7 ویں نمبر پر اٹل بھاری واچپئی کا نام ہے۔ اس پر بی جے پی کے لیڈ راڈوانی نے لوک سبھا میں بڑے غصہ اور برہمی کا اظہار کیا، لیکن اب وہ کیا کہیں گے جبکہ وی ایچ پی کے اشوک سنگھل نے اپنے بیان

میں کہا ہے کہ واجپئی رام جنم بھومی مہم سے وابستہ تھے۔ بی جے پی کے دوسرے لیڈر مرلی منوہر جوشی نے یہاں تک کہہ دیا کہ 6 دسمبر سے پہلے جو میننگ متعلقہ کمیٹی کی ہوئی تھی، اس میں واجپئی شریک تھے۔ کلدیپ نیر صاحب نے لکھا کہ بابر مسجد کی شہادت کے بعد جب انھوں نے واجپئی کو فون کیا تو انھوں نے رنج یا افسوس کا اظہار کرنے کی بجائے کہا کہ اس مقام پر مندر تو بنتا ہے۔ اب تو بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ یوں بھی جب کوئی پارٹی کسی کام کے لئے ذمہ دار قرار پاتی ہے تو فطری طور پر اس کا لیڈر بھی ذمہ دار ہوتا ہے، جب کمیشن نے بی جے پی کو خطا کار پایا تو مسجد کی شہادت کے جرم کے ارتکاب میں واجپئی بھی خطا کار رہیں گے۔ کمیشن نے واجپئی کو خطا کار قرار دے کر بالکل ٹھیک کیا۔

68 خطا کاروں کی فہرست میں پولیس کے اعلیٰ عہدیدار اور ایڈمنسٹریٹرس بھی شامل ہیں۔ ان اعلیٰ عہدیداروں کے تعلق سے کارروائی ضروری ہے۔ یہ کام سی بی آئی یا کسی اور ایجنسی کے ذمہ کیا جائے کہ ان کے خلاف کیا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی فہرست میں کئی سیاسی اور غیر سیاسی لیڈروں کے نام بھی ہیں۔ اس کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ ایسی سیاسی جماعتوں اور غیر سیاسی اداروں کے خلاف کیا کارروائی کی جاسکتی ہے، تاکہ سیاسی جماعتیں اور غیر سیاسی ادارے اس طرح ملک کے اتحاد کو نقصان پہنچانے والی مجرمانہ سرگرمیوں سے دور رہیں۔

جسٹس لبراہن کمیشن کی رپورٹ میں دو پہلو قابل اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ کمیشن نے اس وقت کے وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ کمیشن نے یہ لکھا ہے کہ 6 دسمبر اور اس کے بعد کے واقعات سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ صدر راج نافذ کر دیا جانا چاہیے تھا۔ اس ریمارک کے بعد یہ جملہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ”بہر حال مرکزی حکومت پر عائد دستوری پابندیوں کو ریاستی حکومت نے چالاکی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے اس اختیار کے استعمال

سے اس کو روک دیا۔“ اس سلسلہ میں اس وقت کے یوپی کے گورنر کے خط کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں مرکزی حکومت کو کوئی سخت قدم نہ اٹھانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر راج نافذ کرنے کے لئے مرکزی حکومت گورنر کی رپورٹ یا مشورہ کی پابند نہیں ہے۔ اگر مرکزی حکومت کو یہ محسوس ہو جائے کہ ریاستی حکومت دستوری ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکے گی تو اس کو صدر راج نافذ کرنے کا اختیار مل جاتا ہے، چاہے گورنر کی رائے اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

رپورٹ کے مطالعہ سے ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ جسٹس لبر اہن کو وزیر اعظم نرسمہا راؤ اور مرکزی حکومت کے بارے میں کچھ کہنے میں پس و پیش تھا۔ جس کا انھوں نے متعلقہ باب کے پہلے پیرا گراف ہی میں اظہار کیا ہے کہ انھیں صرف ریاستی حکومت کی ذمہ داری کے تعین کا کام سونپا گیا اور مرکزی حکومت اور اس کی قیادت کی ذمہ داری کے بارے میں تحقیق و تفتیش ان کے دائرہ کار میں نہیں تھی۔ اس لئے بابرہ مسجد کی شہادت کے بارے میں مرکزی حکومت کا رول ان کے دائرہ تحقیقات سے باہر تھا، تاہم انھوں نے مناسب سمجھا کہ صدر راج کے عدم نفاذ اور مرکزی نیم فوجی فورسز کی عدم تعیناتی کا جائزہ لیا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ جائزہ مکمل غیر جانبداری کے ساتھ نہیں لیا گیا، رپورٹ میں یہ ذکر موجود ہے کہ وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے کئی بار ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کو یہ ہدایت جاری کی کہ کارسیوکوں کے خلاف اور ان کے خلاف جو مندر کی تعمیر کی تائید کرتے ہیں قوت کا استعمال نہ کیا جائے اور ان ہدایات سے یہ پیغام پولیس کو ملا کہ حکومت مندر کی تعمیر کے راستہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کے ایکشن میں فیسٹو میں کئے گئے وعدے کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نرسمہا راؤ بھی سازش میں شریک تھے اور 6 دسمبر کے پہلے کے ان کے تمام اقدامات مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہونے کے اندیشہ کو مٹانے

کے لئے اور ان کو جھوٹی تسلیاں دینے کے لئے کئے گئے۔ پی وی نرسمہا راؤ کو بری الذمہ قرار دینا اس رپورٹ کا تاریک ترین باب ہے، جس کی وجہ سے اس رپورٹ کی وقعت متاثر ہوئی ہے اور غیر جانبداری پر بھروسہ ٹوٹا محسوس ہوتا ہے۔

دوسرا قابل اعتراض حصہ مسلمانوں اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی پر غیر ضروری اور غیر واجبی ریمارکس کا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ مسلمانوں نے بابری مسجد ایکشن کمیٹی قائم کر کے سنگھ پر یوار کو مندر کی تعمیر کی مہم میں مدد پہنچائی۔ اجودھیا یا فیض آباد کے کسی مسلمان نے رام جنم بھومی مہم کی مخالفت نہیں کی۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے کبھی متنازعہ ڈھانچہ کے بارے میں اپنے طور پر یا کسی اور کے ذریعہ اپنا ادعا پیش نہیں کیا۔ یہ تمام ریمارکس بے بنیاد ہیں۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے قیام کا مقصد بابری مسجد کے حقائق کے بارے میں اور سنگھ پر یوار کی سازشوں کے بارے میں بشمول مسلمان تمام ہندوستانیوں کو واقف کرنا اور حکومت کو آگاہ کرنا تھا، تاکہ حکومت اپنی دستوری اور قانونی ذمہ داری کو پورا کرے۔ اس کمیٹی نے بارہا اپنا ادعا پیش کیا اور بتایا کہ بابری مسجد کھلی آراضی پر بنائی گئی اور کسی موجود مندر کو اس کے لئے منہدم نہیں کیا گیا۔ مندر کو منہدم کرنے کی بات سراسر جھوٹ ہے۔ بابری مسجد کے لئے عدالتوں میں قانونی لڑائی لڑنے والے مسلمانوں کا تعلق اجودھیا ضلع فیض آباد سے ہے۔ اس معاملہ میں جسٹس لبراہن نے قانونی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے بارے میں ان کے ذہن میں جو باتیں تھیں اور جوان کے نوک قلم سے نکلیں، ان کے تعلق سے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ذمہ داروں کو طلب کر کے سوال کرنا چاہیے تھا۔

جسٹس لبراہن صاحب کا مسلمانوں کے تعلق سے یہ ریمارک بالکل بے موقع اور نامناسب ہے کہ ”یہ ناقابل فہم ہے کہ جن کا تعلق اس فرقہ سے ہے، جس نے

اس ملک پر صدیوں موثر انداز میں حکمرانی کی، جس کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا، ہندوستان کے دوسرے شہریوں کی طرح قومی زندگی کے تمام پہلوؤں میں کوشش کاوش، جدوجہد، مسابقت کامیابی کی طرف پیش قدمی اپنے مذہبی اختلاف کی بنیاد پر خصوصی مراعات پر دار و مدار رکھے بغیر نہیں کرتے۔“

بابری مسجد کے مسئلہ میں مسلمانوں نے اپنے مذہب کی بنیاد پر کسی خصوصی رعایت یا مراعات کا مطالبہ نہیں کیا۔ کمیشن نے خود اپنے دائرہ کار کو تحقیقات کے حکم نامہ میں درج امور تک محدود رکھا تھا تو یہ سوال کب کہاں اور کیسے پیدا ہوا؟ مسلمان تو ہمیشہ حق، انصاف، قانون و دستور کی بات کرتے رہے۔ حکومت کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہے۔ اس نازیبا ریمارک کے لئے کمیشن کے ریکارڈ پر کچھ نہیں ہے۔ یہ دو نکات ایسے ہیں جن سے کوئی ذی فہم اور باشعور ہندوستانی کمیشن کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ بابری مسجد کی شہادت کی راست ذمہ داری کے تعلق سے کمیشن نے جو نتائج اخذ کئے ہیں، وہ صحیح ہیں اور ان پر حکومت کی جانب سے موثر اقدامات ضروری ہے۔



سنگھ پر یوار کے لوگ کب تک جھوٹ بولیں گے

ویر سنگھوی

6 دسمبر 1992ء کو جب اجودھیا میں بابر مسجد کا انہدام ہوا تو اس وقت وہاں بی جے پی لیڈر ایل کے اڈوانی بھی موجود تھے۔ وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ بالآخر جب یہ واضح ہو گیا کہ اب بہت تاخیر ہو گئی ہے اور انہدام کو روکا نہیں جاسکتا تو پرمود مہاجن سمیت کئی لیڈران کو اس گیٹ ہاؤس میں لے گئے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔

ان لوگوں نے اڈوانی سے سوال کیا کہ وہ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اس پر اڈوانی نے کہا کہ ”ان لوگوں نے یہ کیا کر ڈالا؟ انہوں نے تو میری پوری اجودھیا تحریک ہی منہدم کر دی۔“

یہی وجہ تھی کہ اڈوانی اس دن بہت برگشتہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ بعد میں اڈوانی نے عوام تک اپنی بات پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے روزنامہ ٹیلی گراف کے ایڈٹ پیج کے لیے ایک مضمون لکھا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ جس روز بابر مسجد کا انہدام ہوا وہ ان کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ دن تھا۔

میں نے بہت غور سے اس مضمون کو پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اڈوانی اس وجہ سے بہت دکھی تھے کہ ایک منظم اور نظم و ضبط کی پارٹی یعنی بی جے پی کی شبیہ منہدم ہو گئی ہے۔ اب سترہ برسوں کے بعد لوگ ان کے مضمون پر الگ الگ رد عمل ظاہر کر رہے ہیں۔ اڈوانی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک اعتدال پسند سیاستداں رہے

ہیں۔ جبکہ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے اور جو بجا بھی ہے کہ اڈوانی اس لیے دکھی تھے کہ اس طرح آرائیں ایس کوز بردست دھچکا لگا تھا، اڈوانی نے انہدام پر معذرت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے جو کہ ان کی رتھ یا ترا کا منطقی انجام تھا۔

لیکن ہم اصل نکتہ نظر انداز کر رہے ہیں۔ اڈوانی اپنی جگہ پر صحیح نہیں تھے۔ انہدام نے پریوار کی ساکھ کو خراب نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بھی کچھ ہوا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ 6 دسمبر کو واقعی کیا ہوا تھا۔ جب بی جے پی کے لیڈران یہ کہتے ہیں کہ مسجد عوامی غصے اور اشتعال کے نتیجے میں اپنے آپ پیدا ہونے والے اقدام کے سبب منہدم ہوئی تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ خالی ہاتھوں سے ایک بڑی عمارت منہدم کر کے اسی جگہ پر ایک عارضی مندر تعمیر نہیں کر سکتے۔ یہ کام محض لوگوں کے غصے اور جذبات سے بھی نہیں ہو سکتا۔ 6 دسمبر کو عینی شاہدوں اور ویڈیو کیمرہ والوں نے پیشانی پر بھگوا پٹا باندھے ہوئے لوگوں کو کچھ کرنے کی نیت کے ساتھ مسجد کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ انھوں نے رستی استعمال کی جس کے سہارے وہ عمارت پر چڑھے۔ وہاں انہوں نے ان ہتھیاروں کی نمائش کی جو لے کر وہ گئے تھے اور جس سے انہوں نے بابر مسجد کو توڑا اور منہدم کیا۔

اس وقت کی یو پی کی کلیان حکومت نے سپریم کورٹ اور مرکز سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ بابر مسجد کے نزدیک کسی بھی قسم کا ہتھیار لے کر جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ تصویروں کی زبانی ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح کارسیوک تعمیراتی سازو سامان لیکر گئے اور کلیان حکومت اور ان کی پولس خاموش تماشائی بنی رہی۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ کلیان سنگھ نے جھوٹ بولا تھا اور جس وقت کارروائی چل رہی تھی ان کی پولس اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

جس وقت بھگوا پٹی باندھے کارسیوک مسجد کے پاس پہنچے، دوسرے کارسیوک گروپوں نے صحافیوں پر حملہ کر دیا اور کیمرہ مینوں کو نشانہ بنایا۔ بی جے پی بعد میں یہ بھی

دعوا کر سکتی ہے کہ یہ بھی خود بخود اٹھنے والا قدم تھا۔ لیکن دراصل یہ ایک منظم پلان تھا تا کہ فوٹو گرافروں کو مسجد تک پہنچنے سے روکا جاسکے۔ جس وقت انہدام کا کام چل رہا تھا صحافیوں کی بڑی تعداد اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ چکی تھی۔

آخر وہ بھگوا پٹی والے کون تھے؟ اس وقت میں انگریزی جریدہ سنڈے کا ایڈیٹر تھا اور میرے نائب راجیو باگچی نے جو کہ اس وقت ہندوستان ٹائمز کلکتہ ایڈیشن کے ایڈیٹر ہیں، اس مشق کے بارے میں رپورٹ دی تھی جس میں سنگھ پر یوار کے لوگوں نے شرکت کی تھی اور جس میں رسوں کے سہارے بابر مسجد کی عمارت پر چڑھنے اور اسے توڑنے کی پریکٹس کی گئی تھی۔

لہذا یہ کہنا بے وقوفی ہے کہ سب کچھ خود بخود ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک منظم پلان بنایا گیا تھا جس میں انہدام کے ساتھ ساتھ صحافیوں کو بھی وہاں سے دور رکھنے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ یہ سب کچھ فوجی مہارت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مسجد توڑ کر کارسیوکوں نے بالآخر وہاں ایک عارضی مندر بنادیا۔ میں بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات سب جانتے بھی ہیں کہ اچانک غصے اور اشتعال سے سیمنٹ پیدا نہیں کی جاسکتی۔ دراصل کارسیوک وہ سب کچھ لے کر وہاں گئے تھے جس کی انہدام اور مندر تعمیر میں ضرورت تھی۔

انہدام کی جانچ کرنے والے سی بی آئی افسران نے وہی باتیں بتائیں جو راجیو باگچی نے لکھی تھیں۔ میں نے سنڈے کی تصویروں کے البم دیکھے تو ان میں یہ بھی دیکھا کہ پولس والے کارسیوکوں کو رکاوٹیں پار کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مرکزی تحقیقاتی ایجنسیاں بابر مسجد انہدام کی سازش کو بے نقاب کریں گی اور منصوبہ سازوں کے چہرے سامنے لائیں گی۔ لیکن میں غلط تھا۔ کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی گئی۔

پھر میں نے سوچا کہ جسٹس لبراہن، جنہوں نے 8 کروڑ روپے خرچ کئے اور سترہ سال لگائے، ان بھگوا پٹی دھاروں کے نام بتا سکیں گے اور اس کی وضاحت کر سکیں گے کہ کس طرح اس آپریشن کو انجام دیا گیا۔ لیکن میں یہاں بھی غلط ثابت ہوا۔

لبراہن رپورٹ میں انہدام کے بعد ہم لوگوں کے ذریعے تحریر کئے گئے احتجاجی اداروں کی نقل کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جج صاحب نے حکومت کے اخراجات پر سترہ سال تک عیش کیا ہے، لیکن ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اپنا پیسہ واپس مانگیں جس کو برباد کر کے یہ ایک بیکار کی رپورٹ تیار کی گئی ہے۔

اس کی اہمیت کیوں ہے؟ اس لیے ہے کہ عدالت سے جو وعدے کئے گئے ان کو پوری طرح توڑا گیا۔ اس لئے کہ مذہبی دہشت گردوں نے ایک تاریخی عمارت منہدم کر دی۔ اس لیے کہ اس کے بعد بھڑکے فسادات میں ہزاروں افراد کی جانیں گئیں۔ اور اس لیے کہ بابر مسجد کا انہدام ہی اس ملک کے لیے ایک شرمناک واقعہ ہے۔ اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم سترہ سال قبل جو جانتے تھے وہی آج بھی جان رہے ہیں۔ لبراہن رپورٹ نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ جب اڈوانی یہ کہتے ہیں کہ سنگھ پر یوار کی شبیہ منہدم ہو گئی تو میں کہتا ہوں کہ وہ غلط کہتے ہیں۔ دراصل یہ سنگھ پر یوار کی ڈسپلن ہی تھی جس نے بابر مسجد کا انہدام کیا۔ اور یہ بھی پر یوار ہی کی ڈسپلن ہے کہ سترہ برسوں کے بعد بھی ان لوگوں میں سے ایک نے بھی ابھی تک سچ بتانے کے لیے اپنی زبان نہیں کھولی ہے، جنہوں نے بابر مسجد منہدم کی تھی۔ یہ سب مذہبی سپاہی تھے، جنہوں نے بابر مسجد گرائی اور سترہ سال بعد بھی ہم یہ نہیں جان سکے ہیں کہ وہ لوگ کون تھے۔

اے ٹی آر ایک مایوس کن دستاویز

ڈاکٹر منظور عالم

تھوڑی دیر کے لیے سوچے کہ ۷۱ سالوں میں کیا ہو سکتا ہے۔ جاپان اور جرمنی جیسے ملک دوسری جنگ عظیم میں راکھ کے ڈھیر سے اٹھ سکتے ہیں۔ پسماندہ ممالک آگے بڑھ سکتے اور اقتصادی پاور ہاؤس بن سکتے ہیں جیسے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک نے 60 سے 80 کی دہائی میں کیا، یا جیسے چین نے 80 کی دہائی میں کیا اور اب تک کر رہا ہے۔ انفرادی طور پر ایک بچہ جو پہلی کلاس میں رہا ہو اس مدت میں انجینئر بن سکتا اور ملازمت پا کر شادی کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ 8 کروڑ کی عوامی رقم کا کیا ہو سکتا تھا جو لبر اہن کمیشن پر خرچ کی گئی۔ فرض کیجیے کہ ایک گاؤں میں دو کمروں پر مشتمل اسکول کی عمارت پر 5 لاکھ روپے لگتے ہیں تو اس حساب سے ہم 160، پرائمری اسکول دیہاتی علاقوں میں بنا سکتے تھے۔ اگر 100 گاؤں کو پینے کا صاف پانی فراہم کرنے پر یہ رقم خرچ کی جاتی تو کافی ہوتی۔ اس سب کے بدلے میں اس موٹی رقم میں ہم نے لبر اہن کمیشن رپورٹ حاصل کی۔ ہاں بونس کے بطور ساتھ میں 13 صفحات کا ایک سرکاری دستاویز بھی ملا جسے ایکشن ٹیکن رپورٹ (اے ٹی آر) کہا جاتا ہے۔ لہذا ہمیں سر دست تو مطمئن ہو جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔

لبر اہن کمیشن پر حکومت کا اے ٹی آر ایک مایوس کن دستاویز ہے۔ اس سے ذرا بھی یہ نہیں لگتا کہ حکومت بابر مسجد کے انہدام اور اس کے بعد مسلمانوں کے قتل

عام کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی ہے۔ اگر معاملہ ایک ٹریجڈی کا نہ ہوتا تو اس سرکاری دستاویز کی لیپا پوتی بڑی مزاحیہ ہوتی۔ کمیشن کی رپورٹ کی سفارشات میں نمبر 101 اور 102 کے سلسلہ میں ایک کے بارے میں لکھا ہے ”نوٹ کیا گیا“ دوسرے کے بارے میں کہا گیا ”منظور ہے“، سفارش نمبر 103 کے بارے میں ہے ”قبول کیا گیا“۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ اضافہ کرنا مناسب ہے کہ مجوزہ اقدامات میں سے فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور متاثرین کی بازآباد کاری کا بل بھی ایک قدم ہے۔ کئی اور سفارشات کے بارے میں بھی اسی بل کی سفارش کی گئی ہے۔ جبکہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس بل سے فرقہ پرست اور کرپٹ پولیس کو مزید طاقت ملے گی جس سے وہ متاثرین کو ہی نشانہ بنائے گی۔ مبینہ طور پر جو قدم اٹھائے گئے ہیں وہ ان ایشوز پر ہیں جو درج ذیل زمروں میں آتے ہیں۔

- (1) جنرل (2) سول سروسز (3) فسادات پر کنٹرول (4) اٹیلی جنس ایجنسیاں (5) مرکز اور صوبہ کے تعلقات (6) مذہبی اور ثقافتی مراکز (7) پولیس اور میڈیا۔ اگرچہ ایکشن ٹیکن رپورٹ زیادہ تر سرسری سی ہے پھر بھی تھوڑی سی امید ہے کہ اگر حکومت عوامی زندگی کی بہتری کے لیے سنجیدہ ہو تو چیزیں بہتر ہو سکتی ہیں۔ ایک سفارش یہ ہے کہ مذہب، مذہبی مقامات، اور مذہبی ایجنڈہ کے کسی سیاسی پارٹی کے ذریعہ غلط استعمال کو ایکشن کمیشن کے نوٹس میں لایا جائے تاکہ کمیشن کے لیے اسے نا اہل قرار دینا ممکن ہو سکے۔ تاہم ایسا کوئی قدم کبھی ان لوگوں کے خلاف نہیں اٹھایا گیا جو رام مندر کے نام پر ایکشن لڑ رہے ہیں اور نفرت کی سیاست کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ ٹی این سیشن جب ایکشن کمیشن کے سربراہ تھے تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی پارٹی کو نا اہل قرار دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔

حکومت نے ملزمین کے خلاف یوپی کی عدالتوں میں چلنے والے مقدموں کا حوالہ دیا۔ لیکن اجودھیا کے قتل عام کے متاثرین کو کوئی انصاف نہیں ملا ہے نہ ہی ان

کے رشتہ داروں کو معاوضہ۔ ان بھلا دیے گئے لوگوں کا کوئی تذکرہ اس رپورٹ میں نہیں ہے۔ پولیس کہتی ہے کہ متاثرین کے رشتہ داروں نے ایف آئی آر درج نہیں کروائی اس لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بچ جانے والے لوگ خونخوار غنڈوں کے جتھوں سے چھپ رہے تھے اور پولیس ان کی بجائے غنڈوں کی حفاظت کر رہی تھی۔ ایسے وقت میں کوئی عقل مند پولیس اسٹیشن کیسے جاسکتا تھا؟

ایکشن ٹیکن رپورٹ کالب ولجہ بتا رہا ہے کہ یوپی اے سرکار سنگھ کی دادا گیری سے متصادم ہونے کی ہمت نہیں رکھتی۔ قانون شکنی کرنے والوں کے بڑھتے ہوئے قد نے قانون کو بہرا اور دستور کی روح کو مردہ کر دیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے جس کا تذکرہ فوری ہونا چاہیے۔ سنگھ پر یو آر اور وابستہ تنظیموں پر پابندی لگنی چاہیے جنہوں نے بابری مسجد کو ڈھانے کی سازش کی اور قومی سطح پر معصوموں کا خون بہایا۔ بی جے پی جو سازش کرنے والوں کا حصہ تھی ایک سیاسی پارٹی ہے، اس لیے بجائے پابندی کے ایکشن کمیشن کو اس کا چناؤ نشان ضبط کر لینا چاہیے، جب تک وہ ملک کے قانون کا احترام نہ کرے۔ پانچ درجن سے زیادہ سنگھی لیڈروں کو کمیشن نے ۶ دسمبر 1992ء کو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث قرار دیا ہے۔ جنہوں نے منظم سازش کی، ان پر قتل عام، مسلم مخالف ہتھیار پھیلانے اور ایک قومی ورثہ کو برباد کرنے (یاد رہے کہ بابری مسجد کو یونیسکو نے بھی ورلڈ ہیریٹیج کا مقام دیا ہے)، اجودھیا کی 25 اور مسجدوں اور مزاروں کی تباہی اور ان کے علاوہ املاک کی تباہی کے لیے مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔

نیورمبرگ قوانین کے تحت ان پر مقدمہ چلانا بھی اس سمت میں اہم قدم ہوگا۔ اگر ملک ان مجرموں کو آزاد چھوڑ دے گا تو اسے دوسرے دہشت گردوں اور مجرموں پر مقدمہ چلانے کا اخلاقی حق نہ ہوگا، کہ ان کو سزا دیے بغیر چھوڑ دینا مستقبل میں ایسے جرائم کے اعادہ کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہوگا۔

ہندوستان کی جمہوریت سیاسی قیادت اور ہندو فاشزم کے منہ پر سخت طمانچہ

ڈاکٹر سید عبدالباری

ریٹائرڈ صدر شعبہ اردو

(اودھ یونیورسٹی فیض آباد)

بالآخر 17 سال کے بعد جسٹس لبراہن نے بابر مسجد کے انہدام پر اپنی رپورٹ حکومت کے حوالے کر دی اور حکومت کا رد عمل اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے تاثرات بھی سامنے آ گئے۔ افسوس صد افسوس کہ ہندوستان کی تاریخ کے اس وقت تک کے سب سے سنگین واقعہ پر نہ تو رپورٹ اطمینان بخش رہی اور نہ حکومت کا رد عمل اور 17 صفحات پر مشتمل اے ٹی آر۔ مگر 1992ء کے اس خوفناک دور کی جو تفصیلات جسٹس لبراہن نے پیش کر دی ہیں وہی فاشٹ مزاج ہندو لیڈر شپ اور اس وقت کانگریس کی اعلیٰ مرکزی قیادت کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کچھ کم نہیں ہیں۔ 1987ء سے 1992ء تک پورے ملک میں آریس ایس، شیوسینا، بی جے پی، بجرنگ دل وغیرہ نے حیوانیت کا جو ننگا ناچ کیا اور عوام کے جذبات کو نہایت جھوٹے پروپگنڈے اور بے بنیاد تاریخی واقعات کے ذریعہ ہندوستان کی مسلمان ملت کے خلاف مشتعل کرنے کی دن و رات کوششیں کیں اور اپنے کویکولر قرار دینے والی کانگریس جس طرح اس پر خاموش تماشائی بنی رہی وہ ایک المناک کہانی ہے۔ اس داد کو جنھوں نے جھیلا ہے اور خوف و دہشت کے ماحول میں جس

طرح زندگی گزاری ہے ان کے پرانے زخم اس رپورٹ کے بعد ہرے ہو گئے جب انھوں نے یہ سنا کہ نہ تو جسٹس لبراہن نے اور نہ حکومت نے بابرہی مسجد گرانے والے سفید پوش مجرموں کے خلاف کسی سخت اقدام کا کوئی فیصلہ کیا۔ یہ آزاد ہندوستان کی قدیم روایت بن گئی ہے کہ یہاں بڑے بڑے واقعات و حادثات ہوتے ہیں، ان کی تفتیش کے لئے کمیشن بنائے جاتے ہیں۔ ملزمین کی شناخت بھی ہو جاتی ہے لیکن نہ تو حکومت اور نہ عدلیہ اور ملک کے عوام کے اندر یہ جرأت ہوتی ہے کہ وہ مجرموں کو سزا دلانے کے لئے کوئی اقدام کر سکیں۔ دنیا کا کوئی بھی قانون یا دستور اس وقت تک بے جان حروف کی شکل میں کاغذوں کے اندر دفن رہتا ہے جب تک کہ اس کو نافذ کرنے والے ہاتھ مستحکم دلیر اور اخلاقی قوت کے حامل نہ ہوں۔ لبراہن کمیشن کی رپورٹ اور اس پر نہایت کمزور و لا حاصل رد عمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت میں بھی کمزور طبقات اور اقلیتوں کی عزت و آبرو محفوظ نہیں ہوتی جس طرح استعمار اور ڈکٹیٹر شپ میں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ بقول اقبال ۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مگر خوشی ہے کہ حق بات کہنے والے اس ملک میں مفقود نہیں جو جمہوریت کے پردے میں ملک کو ہندو راشٹر بنانے کی کوششوں میں مصروف گروہوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ چنانچہ اس رپورٹ پر نہایت شدید رد عمل سامنے آیا ہے اور اس سے خوشی ہوتی ہے کہ ابھی ہندوستان کا ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے۔ مسٹر انوپم گپتا جو 8 سال تک کمیشن کے قانونی مشیر تھے اور آخری ایام میں اپنی بے اطمینانی کے باعث اس سے الگ ہو گئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ لبراہن کمیشن نے مسجد کے انہدام سے متعلق بہت سے حقائق کو جن کا اسے علم ہوا اپنے نتائج اخذ کرنے کے دوران نظر انداز کر دیا بلکہ جان بوجھ کر اور کچھ خاص مقاصد کے تحت اسے زیر غور

لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثلاً کمیشن نے رہنماؤں اور افسران سے انہدام کے افسوسناک دن پیرامٹری فورسز کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں سوالات پوچھے اور ان کے جوابات کی تفصیل کمیشن کی کارروائی کے ضمیموں میں موجود ہے لیکن جو رپورٹ تیار کی گئی اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں اگرچہ اس سلسلہ میں خاصی تفصیلات خط و کتابت، پوچھ تاچھ اور دیگر دستاویزوں میں محفوظ ہیں۔ آخری رپورٹ میں ریاستی ایڈمنسٹریشن جس کے سربراہ مسٹر کلیان سنگھ تھے کافی زیر گفتگو آیا ہے لیکن نرسمہاراؤ کے اس معاملہ میں کردار کو نظر انداز کیا گیا اور مکمل طور پر نرسمہاراؤ کو اس معاملہ میں اپنی سنگین غلطیوں سے چھٹکارا دے دیا گیا ہے۔“ مسٹر گیتا بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں کہ مرکزی حکومت نے دسمبر کے ابتدائی دنوں میں اجودھیا میں جولاوا پک رہا تھا اور اس سلسلہ میں جو خبریں معتبر ذرائع سے اسے مل رہی تھیں اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ جسٹس لبراہن کے نہایت ہوشیاری سے سترہ سال کی کارروائیوں کے درمیان پیش ہونے والے سیکڑوں گواہوں کے بیانات کا خلاصہ اپنی رپورٹ میں نہیں کیا ہے بلکہ ان کو بطور ضمیمہ رپورٹ کی زینت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب 16 جلدوں پر مشتمل اس رپورٹ کی کھود کرید کرنے پر ہوشربا تفصیلات مرکزی حکومت کی مجرمانہ بے حسی کی سامنے آتی ہیں۔ مسٹر لبراہن نے صرف وٹے کٹیار مہنت رام چندر پر مہنس جسے کچھ لوگوں کے بیانات کا ذکر کیا ہے مگر ان پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا البتہ مسٹر نرسمہاراؤ کے پورے بیان کو حرف بحرف بڑے اہتمام سے پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کے اس معاملہ میں بے قصور ہونے کے لوگ قائل ہو سکیں۔ مبصرین نے سوال کیا ہے کہ جسٹس لبراہن نے پورے پانچ سال سے لگاتار فرقہ پرست و فاشٹ قوتوں نے جس طرح ملک کے جمہوری و سیکولر ڈھانچہ کو ہائی جیک کر کے اسے ایک تنگ نظر ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کا ماحول بنایا تھا، ہر طرف خوف و دہشت کا ماحول طاری تھا، کھلے عام تاریخ کو از سر نو مرتب کر کے

مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دور حکومت کو ظلم و تشدد اور ہندوؤں اور ان کی عبادت گاہوں کی پامالی کا بھیانک دور قرار دیا جا رہا تھا اور ملک کی ہر قدیم مسجد کے نیچے کوئی نہ کوئی مندر دبا ہوا ثابت کیا جا رہا تھا اور اس سارے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کے لئے ملک کی کچھ جماعتوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی، اس ماحول کو بدلنے اور شر پسندوں پر قدغن لگانے سے مرکزی حکومت پوری طرح بے نیاز تھی اسے کیوں موضوع گفتگو نہیں۔ بنایا پھر اجودھیا میں شلانیاس کے بعد مسجد کے انہدام کے دو سال پہلے جس طرح ملک میں جگہ جگہ شلا پوجن کا ڈرامہ کر کے مسلمانوں کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں، بے پناہ سیاہ دولت مندر کے نام پر جمع کی جا رہی تھی، مندر بنانے کے لئے پتھروں کی تراش خراش کے متعدد بڑے کارخانے اجودھیا میں کھل گئے تھے، ہندو عوام کو اجودھیا چل کر مسجد کی جگہ مندر کی تعمیر کے نیک کام میں حصہ لینے کی کھلے عام دعوت دی جا رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ صوبائی اور مرکزی حکومت حتیٰ کہ عدلیہ بے بس اقلیتوں کو یہ یقین بھی دلارہی تھی کہ مسجد پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اس سارے ڈرامے کا آخری سین یعنی 6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں جب ملک کے گوشے گوشے سے مسجد توڑنے اور مندر بنانے والے شر پسند کھلے عام آ آ کر جمع ہونے لگے تو مرکزی حکومت نے جمہوریت و سیکولرزم کی جلتی ہوئی لاش پر مکمل خاموشی اختیار کر لی اور سارے ہیبت ناک واقعہ کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔ مسجد توڑنے والوں کو اجودھیا میں جمع ہوئے اور پورے ساز و سامان اور مہارت کے ساتھ مسجد کو کئی گھنٹے تک توڑنے کا وحشیانہ کارنامہ حکومت کے ذمہ داروں، سیکورٹی کے افراد اور ہندوؤں کے تقریباً سبھی ممتاز رہنماؤں کی موجودگی میں انجام دینے کا موقع ملا۔ کیا تاریخ کے اس گھناؤنے اور شرمناک جرم کے مرتکب لوگوں کو خواہ وہ صوبائی حکومت کے ذمہ دار ہوں، خواہ مرکزی حکومت کے سربراہ، خواہ ملک کے اندھے دھرماتما اور سیاسی رہنما ہوں، خواہ جرائم پیشہ کاریوں کو دور دور سے لانے

والے سازشی افراد ہوں کوئی انصاف کا ترازو ہاتھ میں لے کر عدل کی کرسی پر بیٹھنے والا شخص نظر انداز کر سکتا ہے۔ افسوس کہ جسٹس لبراہن نے اپنے فرض کو ادا کرنے میں افسوسناک کوتاہی کی اور اس حادثہ کے آدھے حصہ کو بقول سید شہاب الدین بیان کیا اور آدھی سچائیوں پر اکتفا کیا۔ پھر اس سے زیادہ اندوہناک بات یہ ہے کہ 68 لوگوں کو اس تاریخ کے بھیا نک ترین جرم کا قصور وار ٹھہرایا لیکن ان کے لئے کسی عبرتناک سزا کے لئے ایک لفظ زبان پر لانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔

لطف یہ ہے کہ جسٹس لبراہن نے اپنی رپورٹ میں مسلم لیڈر شپ کو بھی مسجد کے انہدام کے لئے ہی قابل ملامت قرار دیا ہے۔ ممتاز مورخ ڈی این جھانے ان کے خیال کو غلط قرار دیا ہے اور اس بات کی تردید کی ہے کہ مسلم تنظیموں نے اپنی قوم کو اس معاملہ میں بنیاد پرستی اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے لئے ابھارا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی لیڈر شپ اور عوام نے اس موقع پر حیرت انگیز صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور ہندو فاشسٹوں کے اشتعال انگیز نعروں اور مسجد کے انہدام کے عزائم کے برسر عام اظہار کے باوجود خاموشی اختیار کی۔ مسجد کے انہدام کے کچھ دن پہلے اور کچھ دن بعد میں نے فیض آباد اور اجودھیا میں جا کر وہاں کے باشندوں کے آنسوؤں کو دیکھا تھا۔ مسجد کے انہدام کے دن میں چند کیلومیٹر فاصلہ پر سلطانپور میں تھا جب کہ ہر طرف کرفیو جیسی حالت تھی، ہر طرف کارسیوں کے جتھے رواں دواں نظر آتے تھے اور یہ سب نہایت غلیظ الفاظ میں مسلمانوں کو دھمکا رہے تھے۔ مستقل طور پر انھیں ہندوستان کا معزز شہری ہونے کے باوجود بابر کی اولاد کے عنوان سے پکار رہے تھے۔ مسٹر ڈی این جھا کے الفاظ میں ”1970ء تک اس قضیہ کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ و شو ہندو پریشد کے وجود میں آنے کے بعد یہ جھگڑا کھڑا ہوا۔ جب یہ تنظیم کاشی متھرا اور اجودھیا کو ہندو مذہب کے مقدس مقامات کی حیثیت سے پیش کرنے لگی اور پھر 1986ء میں مسجد کا جو 1949ء سے مقفل تھی تالا کھول دیا گیا اور پھر

شلا نیاس ہوا اور ان واقعات نے وی ایچ پی کو غیر معمولی طاقت عطا کی۔ اس کے ساتھ بھرت سنگھ دل اور آ ر ایس ایس کا بازار بھی خوب گرم ہو گیا۔ ان جماعتوں نے اس معاملہ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ ہندو تو ایکمپ نے یہ جھگڑا کھڑا کیا جس کے نتیجہ میں مسجد منہدم کر دی گئی۔ اس وقت پورے شمالی ہند میں ہر طرف ”مندر وہیں بنائیں گے“ اور ”یہ (بابری مسجد) رام کی جنم بھومی ہے“ جیسے نعرے گونجنے لگے لیکن تاریخی حقائق کچھ اور بیان کرتے ہیں۔“ (فرنٹ لائن دسمبر 2006)

بابری مسجد کے انہدام کے ملزموں کو خواہ جسٹس لبراہن کسی عبرتناک سزا کا مستحق نہ سمجھیں اور خواہ حکومت ان ملزموں کا گریبان پکڑنے سے کتر ایسے اور یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لے کہ رائے بریلی کورٹ میں ان پر مقدمات چل رہے ہیں اور کچھ اور پر بھی مقدمات قائم کئے جائیں گے لیکن اس حقیقت سے کون آنکھیں بند کر سکے گا کہ 1992ء کے شرمناک حادثے نے ہندوستان کے موجودہ نظام کے کمزور طبقات کے حقوق کی حفاظت کے معاملہ میں شرمناک ناکامی کا آخری باب تحریر کر دیا۔ ملک آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے ملک میں 20 فیصد آبادی کی زبان اردو کو قتل کر دیا گیا۔ پھر شمالی ہند کے تمام سرکاری اسکولوں میں ایسی کتابیں داخل نصاب کر دی گئیں جو کھلے عام ہندو مذہب کی مانتھا لوجی کو نو عمر بچوں کے ذہن میں بٹھانے کے لئے لکھی گئی تھیں اور ان کے سبب مسلمانوں نے اپنے بچوں کو اپنے وسائل سے قائم کئے گئے مکاتب میں بھیجنا شروع کیا۔ پھر فسادات کا خوفناک دور 1961ء سے شروع ہوا اور 1992ء تک ایک لمحہ بھی ملک کی مسلمان اقلیت چین سے نہ بیٹھ سکی پھر تمام سرکاری ملازمتوں میں خاص طور پر پولیس، خفیہ محکمہ اور فوج و پیرا ملٹری فورسز میں ان کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا۔ پھر ان کو قومی دھارے یعنی ہندو تہذیب و عقائد کے سیلاب میں اپنا سب کچھ گنوا کر بہہ جانے کا مشورہ دیا گیا۔ اس کے باوجود جب ہندوستان کی مفلوک ملت اپنے مذہب و عقائد سے جدا ہونے پر

تیار نہ ہوئی تو اسی جمہوری نظام میں ہندو فاشٹ تنظیمیں آگے بڑھ کر ان کی عبادت گاہوں، ان کی تاریخ، ان کے کلچر کو ظلم و زیادتی کا محور قرار دینے لگیں۔ دعوے کئے جانے لگے کہ ہزاروں مسجدیں ملک میں ایسی ہیں جو گزشتہ صدیوں میں مندروں کے انہدام کے بعد تعمیر کی گئی ہیں۔ پھر اجودھیا کی بابر کی مسجد کو اپنا خاص نشانہ بنا کر تمام ہندو جماعتیں اٹھ کھڑی ہوئیں تاکہ مسلمانوں کو اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ قرار دینے اور ان کے مذہب اور مذہبی مقامات و مساجد کو ظلم و زیادتی کا مرکز قرار دینے کی کوشش کی جائے۔ یہ سب اسی جمہوری ملک میں دھڑلے سے ہوتا رہا اور ملک کی خود کو سیکولر قرار دینے والی جماعتیں خاموشی سے اس کی تائید کرتی رہیں۔ مسلمان خود کو اپنے ہی ملک میں اجنبی اور دوسرے درجہ کا شہری محسوس کرنے لگے اور بالآخر دستور قانون عدلیہ سب کو ٹھوکر مار کر لاکھوں کی تعداد میں آزادی کے ساتھ شریک ملک کے گوشے گوشے سے اجودھیا آئے اور آرام سے مسجد کو منہدم کر کے اور عارضی مندر بنا کر چلے گئے۔ سیکورٹی ایجنسیاں اور قانون کے رکھوالے مستعدی سے ان کی مدد کرتے رہے اور اس بات کا عملی ثبوت پیش کر دیا گیا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت اب غیر ملکیوں بلکہ دشمنوں جیسی ہے جنہیں بادل ناخواستہ برداشت لیا جا رہا ہے۔ اب انہیں خاموشی سے جتنا کچھ مل رہا ہے اسی پر خاموشی سے اکتفا کرنا چاہئے۔

شاید آزادی سے پہلے ہندوستان کی اکثریت کے کسی مستحکم ضابطہ اخلاق سے محرومی، خالص مادہ پرستانہ مزاج اور قومی و مذہبی خود غرضی کی وجہ سے کچھ مسلم دانشوروں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ملک آزاد ہونے کے بعد یہ سارے جمہوری و دستوری تقاضوں کو روند کر مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں ڈرتھا کہ آگے چل کر سیاستداں، پولیس و نیم فوجی دستے اور عوام کا ایک طاقتور گروہ اقلیتوں کے ساتھ لاقانونیت بلکہ تشدد کی راہ اختیار کرے گا اور یہ تشدد وحشت و درندگی کی حد تک جا پہنچے گا۔ اس کے عملی مظاہر ۱۹۶۱ء کے بعد مسلسل فسادات کی

شکل میں پھر بابرؒ مسجد کے انہدام کی صورت میں سامنے آئے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد ایک سیکولر جمہوری اسٹیٹ کے قیام اور تمام شہریوں کے حقوق کی محافظت کے معاملہ میں ملک کی خوش قسمتی سے ایک ایسا دستور بن کر نافذ ہو گیا جو اکثریت کو اقلیت کے پامال کرنے کے دروازے بند کرنے اور ہر شہری کو آزادی کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق عطا کرنے کا دعوے دار تھا۔ لیکن اسی دستور کے زیر سایہ ہندوستان میں مسلمان اپنا سیاسی وزن اور تہذیبی امتیازات رفتہ رفتہ کھوتے چلے گئے۔ قدم قدم پر مذہبی عصبیت اور امتیازی سلوک کا نشانہ بننے لگے۔ دھیرے دھیرے اکثریت کے ایسے ادارے اور جماعتیں سیکولرزم اور جمہوریت کو نئے معنی عطا کرنے کے لئے منظر عام پر آ گئیں جن کی روشنی میں مسلمانوں کو ایک باعزت پارٹنر اور معزز شہری کے بجائے ایک پست درجہ کا ناپسندیدہ شہری سمجھنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ شہری زندگی میں اہم مناصب اور حکومت و انتظامیہ کے عہدوں سے وہ مکمل طور پر محروم کر دیے گئے۔ چنانچہ بابرؒ مسجد کے انہدام کے وقت ملک کی بیس فیصد آبادی کا ایک بھی فرد سیکورٹی فورسز اور سرکاری حکام میں موجود نہ تھا۔ گویا یہ سب وشو ہندو پریشد کی فوج کا ایک حصہ بن کر 6 دسمبر کو کام کر رہے تھے ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ اتنا سنگین دستوری و قانونی جرم کرنے والوں میں کسی فرد کی نکسیر نہ پھوٹی۔ البتہ اجودھیا کے ساڑھے چار ہزار مسلمان شام کو آخری گنبد گرنے کے بعد شہر چھوڑ کر پناہ گاہوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جو پندرہ بیس مسلمان رہ گئے وہ شہید کر دیئے گئے جن میں میرے ایک عزیز محمد صابر صاحب بھی تھے جنہیں اپنے پڑوسی ہندو پرکاشی بھروسہ تھا اور جو بابرؒ مسجد کے آخری امام عبد الغفار صاحب کے بیٹے تھے۔

یہ سچ ہے کہ آزادی کے بعد ساری انسان دوستی اور انسانی حقوق کی تعلیمات

اور دعوؤں کے باوجود ملک کی آبادی کے ایک بڑے طبقے کو جوڑنے والی سب سے بڑی قوت ہندو تو ایسا ہندو قوم پرستی تھی اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ملک کے کچھ رہنما اسلام اور مسلم دشمنی کے شعلوں کو مستقل بھڑکانے کا کام کرتے رہے۔ کسی بھی فساد کے ایک ملزم کو کوئی سزا نہ ملی حتیٰ کہ احمد آباد کے 2002ء کے قیامت خیز مسلم قتل عام کے بعد بھی سب سے بڑا مجرم مودی نہ صرف آزاد رہا بلکہ دوبارہ اکثریت کی تائید سے برسر اقتدار آ گیا۔ افسوس ہے اس سرزمین پر سب سے زیادہ جوشے پامال ہوئی وہ عدل و انصاف کی قدریں ہیں۔ چنانچہ آج ہندوستانی عوام کسان مزدور اور پس ماندہ لوگ سب سے زیادہ جس چیز سے محروم ہیں وہ انصاف ہے۔ کرپٹ افسران، جرائم پیشہ افراد عورتوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ اور طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے لوگ آزاد ہیں اور قانون ان کی گرفت میں لاچار ہے۔ اس لئے کہ گرفت کرنے والے ہاتھ خود اب طرح طرح کی بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔ بس جو چیز متحد کرنے والی ہے وہ اسلام دشمنی کی نفسیات ہے جسے خوب خوب نمایاں کرنے کا کاروبار جاری ہے۔ جمہوریت، آزاد پریس اور بااختیار عدلیہ بابرہ مسجد کے ملزموں اور ملک کے بے شمار مجبور و لاچار مظلوموں کو پامال کرنے والے گنہ گاروں کو کٹھ گھرے میں کھڑا کرنے میں بے بس نظر آ رہی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جسٹس لبرائین کی اس رپورٹ اور اس پر جو رد عمل سامنے آیا ہے اس کو دیکھ کر ملک میں جمہوریت و سیکولرزم کے کھوکھلے پن کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔



واچپٹی بھی اتنے ہی ذمے دار ہیں

جتنے کہ نرسمہا راؤ

موہن سنگھ

اٹل بہاری واچپٹی نے پانچ دسمبر 1992 کو لکھنؤ میں ایک جلسے سے خطاب کیا تھا۔ اس کے بعد انھیں اجودھیا لے جانے کے بجائے دہلی بھیج دیا گیا تا کہ وہ وہاں ایوان میں سنگھ پر یوار کے دفاع کی کمان سنبھال سکیں۔ انھوں نے بعد میں ایوان میں بی جے پی کی ریاستی حکومتوں کی برطرفی کے خلاف دھرنا دیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے دھرنا ختم کر کے پنڈت پنت مارگ پر واقع بی جے پی دفتر میں بھوک ہڑتال شروع کر دی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے جن ساتھیوں کو (بابری مسجد انہدام کے جرم میں) گرفتار کیا گیا ہے ان کو رہا کیا جائے۔ اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ شنکر راؤ چوان ان کی بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لئے خود بی جے پی دفتر گئے۔ انھوں نے پورے حالات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن تشکیل دینے کا وعدہ کیا۔

اس سے قبل اس وقت کے وزیراعظم نرسمہا راؤ بیان دے چکے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس وقت کی کانگریس حکومت کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ لبرال کمیشن نے اپنی ایک ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ میں اس وقت کی مرکزی حکومت کی سرگرمیوں کا بالکل جائزہ نہیں لیا ہے۔ پہلا گنبد گرنے کے ساتھ ہی ریاستی حکومت باہر ہو گئی تھی۔ اس وقت مرکزی

حکومت کو فوری طور پر پہل کرنی چاہئے تھی۔ گھنٹوں کی محنت سے مسجد کا ملبہ صاف کیا جاتا رہا۔ پھر وہاں دوبارہ مورتیاں رکھ کر کپڑا تان دیا گیا اور مندر بنایا جاتا رہا۔ لیکن مرکزی حکومت کے نمائندے اور فوجی دستے خاموش تماشا شائی بنے رہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ کمیشن نے ان سرگرمیوں کا کوئی جائزہ نہیں لیا ہے۔

ادھر بی جے پی والوں کو اس بات پر ناراضگی ہے کہ کمیشن میں اٹل بھاری واجپئی کا نام ناحق گھسیٹا گیا ہے۔ حالانکہ بی جے پی کا یہ کہنا سراسر غلط ہے۔ کیا واجپئی رام مندر کی تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ کیا انھوں نے اس تحریک کے ابتدائی دور یعنی تالا کھولے جانے سے قبل 'تالا کھولو آندولن ستیہ گرہ' کے دوران جیل نہیں گئے تھے۔ کیا اڈوانی کی رتھ یاترا کا آغاز انھوں نے جھنڈی دکھا کر نہیں کیا تھا۔ شروع شروع میں تو بی جے پی کہتی تھی کہ یہ تحریک وی ایچ پی کی ہے۔ وہ اسے صرف اخلاقی سپورٹ دے رہی ہے۔ مگر بعد میں جب اس کو لگا کہ اس سے عوامی حمایت مل سکتی ہے تو اس نے اس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔ جس میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کیا واجپئی اس میں نہیں تھے۔ رتھ یاترا کے وقت بہار کے سستی پور میں اڈوانی کی گرفتاری کے بعد وی پی سنگھ کی حکومت سے حمایت واپسی کا خط لے کر صدر جمہوریہ کے پاس واجپئی نہیں گئے تھے۔ رتھ یاترا روکنے کے موضوع پر ہونے والی بحث میں کیا واجپئی نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اور کیا انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر رتھ یاترا روکی گئی تو وہ حکومت سے حمایت واپس لے لیں گے۔ کیا بابرہ مسجد انہدام کے ذمے دار بی جے پی لیڈروں کی رہائی کے لئے واجپئی نے بھوک ہڑتال نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ پھر کس بنیاد پر ان کو پاک صاف کہا جاسکتا ہے۔ لبرائن کمیشن نے حالانکہ ان کی تمام سرگرمیوں کا باریک بینی سے جائزہ نہیں لیا ہے تاہم ان کے بارے میں کمیشن کے سرسری تبصرے کو قطعی جھوٹا نہیں کہا جاسکتا۔

دراصل بابرہ مسجد انہدام کے لئے سنگھ پر یوار پوری طرح سے ذمے دار ہے

اور بی جے پی، وی ایچ پی اور بجرنگ دل کے نیتا محض اس کی کٹھ پتلی ہیں۔ یہ بات تو کوئی بھی سمجھتا ہے۔ پھر بھی سنگھ پر یوار سے نمٹنے کے لئے ایوان اور حکومت کو کیا کرنا چاہئے اس پر کمیشن نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ رپورٹ میں اس سلسلے میں کوئی سمت متعین نہیں کی گئی ہے۔



تاریخ کے اوراق سے کچھ تلخ حقائق

سید منصور آغا

یاد کیجئے، حضور اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر پہلی مسجد کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو ٹھوک بجا کر معلوم کر لیا کہ قطعہ آراضی کا مالک کون ہے؟ اور جب اس کے نابالغ مالکان اور ان کے ورثاء نے برضا و رغبت زمین ہدیہ کرنے کی پیش کش کی تو آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ مروجہ شرح سے زیادہ رقم ادا کر کے پہلے اس کو خریدا اور پھر مسجد بنوائی۔ بعض تاریخی اسناد اور کچھ حالات کی بنا پر یہ گمان ہوتا ہے کہ مفتوح عوام پر سیاسی رعب و دبدبے کی مصلحت میر باقی پر کچھ اس طرح حاوی آگئی کہ مسجد کی تعمیر کے لئے قطعہ آراضی کا انتخاب کرنے میں جس احتیاط کی مثال خود نبی کریمؐ نے قائم کر دی تھی، اس کی اتباع میں اس سے چوک ہوئی ہے، ورنہ یہ معاملہ اکبر کے دربار میں نہ جاتا، جس کے بعد مسجد کے احاطے میں، صدر دروازے سے متصل ایک 17 فٹ چوڑا 21 فٹ لمبا وہ چبوترہ تعمیر ہوا، جس پر صدیوں سے رام لالا، سیتا جی اور لکشمن جی کی مورتیوں کی پوجا ہوتی تھی۔ یہی مورتیاں تھیں جن کو 22-23 دسمبر 1949 کی درمیانی رات میں، جب کہ پنڈت گووند بلیمھ پنت یوپی کے وزیراعلا اور سردار ٹیل مرکز میں وزیر داخلہ تھے، مسجد کے ممبر پر پہنچا دیا گیا اور مسجد میں نماز کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

’بابری مسجد‘ جو ۱۹۴۰ء تک ’مسجد جنم استھان‘ کے نام سے معروف تھی (سید صباح الدین عبدالرحمن: ’بابری مسجد‘ مطبوعہ اعظم گڑھ) کا قضیہ صدیوں تک مقامی

نوعیت کا رہا۔ لیکن تقسیم وطن کے بعد اس واقعہ نے اس کی نوعیت بدل دی۔ اب یہ قضیہ ہندو اchiاء پرستی کی تحریک کا ایک حصہ بن گیا۔ تقسیم کے بعد شمالی ہند کے مسلمان سیاسی طور پر مقہور اور نفسیاتی طور پر مجروح ہو چکے تھے۔ کانگریس کی ہندو قیادت نے، جس میں بد قسمتی سے گاندھی جی اور نہرو بھی شامل ہو گئے، تقسیم کا فارمولہ منظور کر کے عملاً 'دو قوم'۔ دو ملک کے نظریہ پر اپنی مہر لگا دی تھی۔ ان حالات میں جب بابرؒی مسجد میں مورتیاں رکھ کر تالا لگا دیا گیا تو اس کے خلاف کوئی موثر آواز نہیں اٹھائی جاسکی۔ جواہر لال نہرو نے، بحیثیت وزیر اعظم یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کو متوجہ کیا اور مورتیاں ہٹوانے کے لئے کہا تو، پنت کو، جو خود ہندو اchiاء پرستوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اپنے ہم خیال مرکزی لیڈروں کی حمایت حاصل ہو گئی اور مورتیاں نہیں ہٹائی گئیں۔ 17 اپریل 1950ء کو پنڈت پنت کے نام، جن کو اے جی نورانی نے 'بابری مسجد تنازعہ کا خالق' قرار دیا ہے، ایک خط میں نہرو جی نے لکھا تھا: 'کل تک جو لیڈر کانگریس کے ستون تھے، آج ان کے قلب و نظر پر فرقہ پرستی مسلط ہو گئی ہے۔'

"Communalism has invaded the minds and hearts of those who were the pillars of the Congress in the past."

اپنی سوانح حیات میں نہرو جی نے اعتراف کیا ہے:

"Many a Congressman was a communalist under his national cloak." The Hindu Mahasabha's communalism "masquerades under a nationalistic cloak"

”بہت سے کانگریسی قوم پرستی کے لبادے میں فرقہ پرست ہیں“ اور ہندو مہاسبھا نے ”اپنی فرقہ پرستی کو قوم پرستی کے لبادے میں چھپا رکھا ہے۔“ چنانچہ

آزادی کے فوراً بعد کے دور میں کانگریس کے ہندو لیڈروں اور ہندو مہاسبھا کے فرقہ پرستوں میں فرق کرنا مشکل تھا، لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ جواہر لال نہرو کی پہلی کابینہ میں شیاما پرساد مکھرجی بھی موجود ہیں، جو جن سنگھ (موجودہ بھاجپا) کے جنم داتا اور اہم سنگھی نظریہ ساز ہیں۔

اس ذہنیت کے برملا اظہار اور اس کے تحت اقدام کے نئے دور کا آغاز سومناٹھ مندر کی تعمیر نو سے سمجھا جاتا ہے۔ خود وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے اس منصوبہ کو برملا 'ہندو احیاء پرستی' کی مہم قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد اور سردار پٹیل کی ایما پر شروع کی گئی اس تحریک کو گاندھی جی کا بھی آشیر واد حاصل تھا اور 'سیکولر ہندستان' کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے وزیراعظم جواہر لال نہرو کی اصولی مخالفت کے باوجود سومناٹھ جا کر افتتاحی جلسہ میں شرکت کی اور اس منصوبہ کو ہندستان کی ویسی ہی خوشحالی کا پیش خیمہ قرار دیا، جیسا ماضی میں یہ مندر سمجھا جاتا تھا۔ مسٹر نہرو کی کابینہ کے ایک وزیر کے ایم فٹشی نے، جو سردار پٹیل کی وفات کے بعد اس تحریک کے لیڈر بنے، اس کو 'ہندوؤں کے ساتھ نا انصافی' کا ازالہ قرار دیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو شاید یہ بات معلوم ہوگی کہ سومناٹھ مندر تعمیر کے لئے صدیوں سے وہاں موجود ایک مسجد کو بھی ہٹا دیا گیا تھا اور اس کے عوض دوسری جگہ ایک مسجد تعمیر کرادی گئی تھی۔ لال کرشن اڈوانی نے اجودھیا میں رام مندر کی تحریک کے لئے اپنی رتھ یا ترا سومناٹھ مندر سے اسی لئے شروع کی تھی کہ وہ ایودھیا میں بھی اس منصوبہ کا عکس اتارنا چاہتے تھے اور اسی لئے وہ بار بار بابر کی مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے نظریہ پر اصرار کرتے تھے۔

ہر چند کہ لبرالہن کمیشن نے اپنی حالیہ متنازعہ رپورٹ میں ہندو احیاء پرستی کے فروغ اور مسجد کے انہدام کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کے لئے صرف سنگھ پر یوار کو ہی نشان زد کیا ہے، لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ بابر کی مسجد کا وجود صرف بھگوا دھاریوں کی نظروں میں ہی خار نہیں تھا، بلکہ بہت سے سفید کھدر

دھاریوں کی نگاہ میں بھی باعث عار تھا۔ برطانوی مورخ آرنلڈ ٹوئینی کا تاثر تو اس سے بھی شدید ہے، جس کو 'اکونومک ٹائمز' (18 ستمبر 1997ء) میں نقل کیا گیا ہے: 'آرنلڈ ٹوئینی نے 1950ء کی دہائی میں ہندوستان کے دورے کے موقع پر کہا تھا کہ (ہندو) دانشور بابری مسجد کے وجود کو ہندوؤں کی توہین قرار دینے کی رائے پر متفق ہیں۔'

Arnold Toynbee during his visit to the country in fifties said the (Hindu) intelligentsia was unanimous in describing that the existence of the Babri Masjid was an insult to the Hindus.

یہ حقیقت بھی جگ ظاہر ہے کہ اس مقامی تنازعہ کو قومی مسئلہ بنانے اور اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا سنگھ پر یوار کا حربہ، دراصل سیاست کے کھیل میں نہلے پر دبے کا حکم رکھتا ہے۔ لبرال ہن کمیشن نے جس طرح ہندو احیا پرستی کی تحریک کے لئے عبوری وزیراعظم گلزاری لال نندا کو یاد رکھا، اچھا ہوتا کچھ دوسرے لیڈروں کو بھی یاد رکھا ہوتا۔ ننداجی کے فوراً بعد وزیراعظم کے منصب پر لال بہادر شاستری فائز ہوئے جو سنگھ کے لئے بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے۔ گولوالکر بھی ان کے بڑے مداح تھے۔ نہرو جی کی کابینہ میں 1961ء میں وزیر داخلہ کا منصب سنبھالتے ہی انہوں نے آرائس ایس کے سرسنگھ چالک گورو گولوالکر سے طویل ملاقات کی۔ 1965ء کی ہند پاکستان جنگ کے دوران، جب شاستری جی وزیراعظم تھے، سنگھ کی غیر معمولی حوصلہ افزائی کی گئی اور اس کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ گورو گولوالکر کی بھی پذیرائی کی گئی اور انکو قومی پارٹیوں کے لیڈروں کی میٹنگ میں اہمیت کے ساتھ مدعو کیا گیا۔ اگر میرا حافظہ خطا نہیں کر رہا ہے تو وزیراعظم کا منصب سنبھالنے کے بعد انہوں نے گولوالکر کو اپنی رہائش گاہ پر مدعو کر کے طویل ملاقات کی تھی جس میں 'راشر' کے نو

زمان کے لئے گہن منترنا' (ملک کی تشکیل جدید کے لئے گہرائی سے صلاح و مشورہ) کیا گیا۔ اس ملاقات کے بعد ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو ایمر جنسی کے نفاذ تک مرکزی حکومت اور آرائس ایس کے درمیان رابطوں اور خوشگوار رشتوں کی اپنی ایک تاریخ ہے، جس میں آرائس ایس کی فرقہ پرستی کو قوم پرستی کا تمغہ عطا کیا گیا۔

خیر یہ تو ماضی کے قصے ہیں۔ اس تحریک کی چنگاری کو شعلہ بنانے میں ماضی قریب کے بعض اہم لیڈروں کے نام بھی کمیشن کو یاد نہیں رہے، حالانکہ ان میں سے کئی سیاست دانوں کے نام عوام کے ذہنوں میں آج بھی تازہ ہیں۔ مثلاً راجیو گاندھی کی کابینہ کے وزیر داخلہ سردار بوٹا سنگھ اور وزیر مملکت برائے داخلی سلامتی ارون نہرو کے نام کس کو یاد نہیں، جنہوں نے راجیو گاندھی کو ورغلا کر پہلے مسجد کا تالا (یکم فروری 1986ء) پوجا پاٹھ کے لئے کھلوا کر مسجد کو عملاً باضابطہ مندر میں تبدیل کرادیا اور پھر دھوم دھام سے عین الیکشن سے قبل شیلانیاس (10 نومبر 89) کرایا اور پھر انتخابی مہم کا آغاز بھی اجودھیا سے 'رام راجیہ' کے وعدے کے ساتھ کرایا۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ راجیو گاندھی ہر چند کہ سیاسی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، مگر ان کو سیاست سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ 1980ء میں چھوٹے بھائی بجنے گاندھی کی ہوائی حادثہ میں موت کے بعد ان کو زبردستی سیاست میں لایا گیا تھا اور صرف چار سال بعد 1984ء میں وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اچانک وزیراعظم کے منصب پر بٹھادیا گیا تھا۔ یہ اتفاقات سیاسی تجربہ کا بدل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ابتدا میں ان کو بہت کچھ اپنے مشیروں پر منحصر رہنا پڑا۔ اس لئے دور درشن پر پورے ایک سال تک 'رامائن سیریل' کی نمائش سے لے کر، جس کی بدولت عوام کے ذہنوں میں شری رام کے کردار کی عظمت کے نقوش اچھی طرح نکھر گئے، بابری مسجد کا تالا کھلوانے، عین الیکشن سے قبل شیلانیاس کرانے اور 'رام راجیہ' کا بھولا بسرا سبق یاد دلانے کی حکمت عملی خود جدید ذہن و فکر کے حامل

راجیو گاندھی کی سوچ کا نہیں بلکہ ان کے انہی مشیروں کی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھے۔ راجیو گاندھی کے دماغ میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ مسلم مطلقہ بل سے مسلمان خوش ہو جائیں گے اور شیلانیاس سے ہندو۔ وہ اس تکلیف دہ سماجی حقیقت سے بے خبر تھے کہ مسلمانان ہند کی نگاہوں میں مسجد کی جواہریت ہے وہ شرعی عائلی قوانین کی نہیں۔ [اس کا ثبوت سامنے ہی موجود تھا۔ ہماری جس قیادت نے مطلقہ کو سابق شوہر سے گزارہ دلوانے کے فیصلے کے خلاف ملک گیر مہم چلائی تھی، وہ کبھی عورتوں کا شرعی حق وراثت قانوناً قائم کرانے کے لئے اس طرح مضطرب نظر نہیں آئی۔ چنانچہ مسلم معاشرے میں عورتوں کو حق وراثت مار لینے والے ہرگز کوئی سبکی یا شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ البتہ مسجد یا امام باڑے کی کوئی ایک اینٹ بھی گرا دیتا ہے تو مضطرب پھیل جاتا ہے۔]

6 دسمبر 1992ء کو مسجد کے انہدام کے افسوسناک واقعہ سے قبل یہ نظر آنے لگا تھا کہ جتنے بڑے پیمانے پر ملک بھر سے 'کارسیوک' اچودھیا پہنچنے والے ہیں، وہ کسی انہونی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ انہدام سے قبل جب گورنر بی ستیہ نرائن ریڈی نے وزیراعظم کو مطلع کیا کہ وہ ریاست میں گورنر راج کی سفارش بھیج رہے ہیں تو مسٹر راؤ نے ان سے کہا کہ وہ انتظار کریں۔ یہ انتظار اس وقت ختم ہوا جب انہدام کے بعد ۶ دسمبر کی شام کو مسٹر کلیان سنگھ نے استعفا دیدیا۔ اس سے قبل 23 نومبر 1992ء کو قومی یکجہتی کونسل کی ایک میٹنگ دہلی میں وزیراعظم نرسمہا راؤ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں اتفاق رائے سے وزیراعظم کو مسجد کے تحفظ کے لئے ہر ضروری اقدام کا اختیار دیا گیا۔ لیکن ان کے وزیر داخلہ مسٹر ایس بی چوان کا بیان ہے کہ: جب مجھے پتہ چلا کہ اچودھیا میں کچھ گڑبڑ ہے تو میں وزیراعظم کی رہائش گاہ پہنچا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ٹی وی دیکھنے لگا۔ جب مسجد کا انہدام مکمل ہو گیا تو وزیراعظم آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کانچی کے

شکر آچاریہ نے دہلی کے ایک بھرے جلسے میں، جس میں مسٹر راؤ بھی سامنے ہی بیٹھے تھے، ان کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ مسٹر راؤ کی شردھا سے وہاں رام مندر بن سکا ہے۔ مسٹر راؤ نے مرتے دم تک اس بات کی تردید نہیں کی۔ کانگریس نے بھی ان کو لوک سبھا کا ٹکٹ نہ دیکر اور یوپی اے چیر پرسن محترمہ سونیا گاندھی نے کمال فراخ دلی اور حوصلہ مندی سے مسجد کی شہادت پر قوم سے معافی مانگ کر مسجد کے انہدام میں ان کے رول کو تسلیم کر لیا تھا۔ کمیشن نے ان کے عدم اقدام کے لئے بعض قانونی مجبوریوں کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ یہ قانونی مجبوریاں اس وقت بھی موجود تھیں جب 1984ء میں بھی مرکز نے جرنیل سنگھ بھنڈرانوالا کے خلاف "آپریشن بلو اشار" کا حکم دیا تھا۔

میرادل کہتا ہے کہ اڈوانی جی کے اس بیان پر شک نہیں کیا جانا چاہئے کہ 6 دسمبر 92ء کا دن ان کی زندگی کا سب سے المناک دن تھا۔ ہر چند کہ ان کی نظر میں بابر مسجد کا وجود ہندوؤں کے لئے 'توہین' تھا، تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس دن بابر مسجد ہی نہیں ٹوٹی تھی، بلکہ اڈوانی جی اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔ بھلا اجودھیا تحریک کے سب سے قد آور لیڈر کی زندگی میں اس سے شدید المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سنگھ پر یوار کی 'برہمنی قیادت' نے بابر مسجد کے انہدام کا بھرپور تفصیل کے ساتھ منصوبہ بنالیا اور اس کے نفاذ کی زبردست تیاری بھی کر لی، مگر ان سے مشورہ تو دور کی بات، اپنے 'سندھی مہاجر سیوم سیوک' کو اس اعتماد کے قابل بھی نہیں سمجھا کہ ان کو اس منصوبے کا علم ہی ہو جاتا اسی لئے یہ دن اڈوانی جی کے لئے ان کی زندگی کا سب سے المناک دن بن گیا۔ آخر یہ بات کیا ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی کہ اتنی بڑی اور پختہ عمارت، جس کو بقول کلیان سنگھ زمین بوس کرنے کے لئے کوئی ٹھیکیدار بھی ڈیڑھ دو ماہ سے کم وقت نہ لیتا، صرف پانچ گھنٹے میں مسمار بھی کر دی گئی اور اس کا سارا ملبہ بھی صاف کر دیا گیا، یہ اتنا بڑا کام اچانک اہل پڑنے والے جوش اور جنون کا نتیجہ

نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لئے وسیع منصوبہ سازی اور ٹریننگ کی ضرورت پڑی ہوگی۔ چنانچہ اڈوانی جی نے پارٹی صدر کی حیثیت سے بھاجپا کے ترجمان "بی جے پی، ٹوڈے" (30-16 ستمبر 1997) میں اپنے دستخط شدہ ادارہ میں لکھا تھا کہ بابر مسجد کا انہدام افسوسناک نہیں ہے بلکہ جس طرح اس کو توڑا گیا وہ افسوسناک

ہے۔ "What is Demolition is not a matter of regret."

"regretted is the manner in which it happened."

بابر مسجد کے انہدام سے اڈوانی جی کو اس لئے بھی شدید صدمہ ہوا ہوگا کہ ان کی دوراندیش سیاسی نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ 'بابر مسجد' کا وجود اس مرغی کے مثل ہے جو ہر الیکشن کے موقع پر سونے کا انڈا دے گی۔ چنانچہ 2004 اور 2009 کے پارلیمانی چناؤ میں اس موضوع سے محرومی کا سب سے زیادہ خمیازہ خود ان کو اٹھانا پڑا اور ملک کا پہلا سندھی وزیراعظم بن جانے کا ان کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

لبرالہن کمیشن کو اس سازش میں اٹل بہاری واجپئی کا حوالہ شاید اس لئے شامل کرنا پڑا کہ انہوں نے انہدام سے صرف ایک دن پہلے لکھنؤ میں کارسیوکوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: نوکیلے پتھروں پر بیٹھا نہیں جا سکتا اس لئے دھرتی کو ستمل کرنا ہوگا۔ مرلی منوہر جوشی نے بھی متھرا میں مسجد کو گرا دینے کی بات کہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے جس سازش کا علم اڈوانی جی کو نہیں تھا، وہ بھاجپا کے ان دونوں برہمن لیڈروں کو معلوم تھی۔ لیکن واجپئی جی کا نام آجانے سے حکومت کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ کیونکہ ان کی سیاست دانی اور جراتمندی کو خود وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ پارلیمنٹ میں خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ جو کاروائی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی گئی ہے، وہ محض خانہ پری ہے۔ حکومت انصاف کے تقاضوں کی پرواہ نہیں کیا کرتی بلکہ سیاسی مصلحتوں کو سامنے رکھ

کر اقدام کیا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس رپورٹ پر ہرگز کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔

ہمارے لئے راہ عمل

ہمیں مسٹر راشد علوی کی اس رائے سے اتفاق ہے: "ایسے معاملوں کو بار بار اٹھانا نہ تو ملک کے لئے اچھا ہے اور نہ اقلیت کے لئے..... بابرہ مسجد شہید ہو چکی ہے..... اب یہ کوئی سیاسی اسٹو نہیں رہ گیا ہے۔ وہاں مندر بن چکا ہے اور ایسے آثار نظر نہیں آرہے کہ وہاں دوبارہ مسجد بن سکے۔"

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی سیاسی تحریک چلانا قرین مصلحت نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم مایوس ہو کر از خود اپنے حق سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیں۔ ہماری قیادت بار بار یہ اعلان کر چکی ہے کہ ہم عدالت کے فیصلے کو قبول کریں گے۔ چنانچہ عدالت میں مسجد کے مالکانہ حق کا جو مقدمہ (Title Suit) چل رہا ہے، کوشش یہ کی جانی چاہئے کہ اس کا فیصلہ، حق کا فیصلہ ہو اور قانونی موثر گافیوں کا شکار بن کر نہ رہ جائے۔

سازش کا پہلا اہم ترین

دوسرا اہم کام یہ کیا جانا چاہئے کہ مرکزی حکومت سے شد و مد کے ساتھ یہ مطالبہ کیا جائے کہ کمیشن کے اس انکشاف کی گہرائی سے جانچ کرائے کہ "مسجد کا انہدام اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ انہدام کا منصوبہ 'باریک بینی' سے (meticulously) تیار کیا گیا تھا۔" حالات سے اس انکشاف کی تائید ہوتی ہے۔ سی بی آئی نے بھی ابتدا میں جو فرد جرم عدالت میں داخل کی تھی اس میں مجرمانہ سازش کی دفعہ موجود تھی، جس کو بعد میں کسی دباؤ میں

آکر ہٹالیا گیا تھا۔ سازش کے اس پہلو کی تائید بجرنگ دل کے شریک قومی کنوینر ہریش بھٹ کے اعتراف سے بھی ہوتی ہے کہ "مسجد کے انہدام کے لئے اس کی نگرانی میں بجرنگ دل کے 40 نو جوانوں کو وسیع تربیت دی گئی تھی۔ اس تربیت کا ایک مرکز احمد آباد کی نواحی بستی سرکھج (Sarkhej) میں تھا" ہریش کا یہ بیان تہلکہ نے ایک خفیہ آپریشن کے دوران فلمایا تھا۔

خفیہ ایجنسیوں کا مشتبہ رول

ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ نہ تو ایک دو دن میں بن گیا ہوگا، نہ ایک دو آدمیوں نے بنالیا ہوگا اور نہ عمارت کے انہدام کی تربیت ایک دن میں پوری ہوگئی ہوگی۔ اہم سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی تیاری ہوگئی اور ہماری خفیہ ایجنسیوں سے اس کی کوئی پیشگی اطلاع حکومت کو نہیں ملی؟ بابرئ مسجد کے انہدام کے سلسلہ میں ہمارے نزدیک سب سے اہم سوال یہی ہے، جس کی طرف حکومت کو متوجہ کیا جانا چاہئے کہ وہ سازش کے اس پہلو کی گہرائی سے جانچ کرائے اور یہ دیکھے کہ کیا سازش ملک کے سیکولر آئینی نظام کو دریا برد کر کے ہندو [برہمنی] راشٹرا قائم کرنے کی مہم کا تو حصہ نہیں ہے؟ یہ حکومت کی آنکھ اور کان سمجھی جانے والی خفیہ ایجنسیوں کی نااہلی ہے یا جان بوجھ کر چشم پوشی یا پھر ان سازشوں میں خود اس کے 'برہمنی ذہنیت' کے افسران کا ہاتھ تو نہیں ہے، جن کو ہندو راشٹر کے مہم بازوں نے منصوبہ بند طریقے سے ان میں نصب کر دیا ہے۔

انہدام کے وقت فیض آباد میں تعینات ڈی ایم آر این سر یو استوانے کمیشن میں جو بیان دیا تھا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بابرئ مسجد معاملہ میں بھی آئی بی نے کچھ ایسا ہی رخ دینے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ضلع انتظامیہ کو آئی بی سے تین طرح کی رپورٹیں ملی تھیں۔ 'پوجا ساگری کی صورت میں گولا بارود رام جنم بھومی مندر میں لایا جاسکتا ہے، کارسیوکوں پر راکٹوں سے دہشت گرد حملہ ہو سکتا ہے یا

کارسیوکوں میں آئی ایس آئی کے ایجنٹ شامل ہو کر گڑ بڑ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کمیشن کو یہ بھی بتایا کہ آئی بی نے ایسی کوئی رپورٹ نہیں دی تھی کہ کارسیوک مسجد پر حملہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ آئی بی کے لوگ وہاں موجود تھے اور ایس ایس پی براہران سے رابطے میں تھے۔ اس بیان سے اس اندیشہ کو تقویت ملتی ہے کہ سنگھ پر یورار، جو ملک کے موجودہ سیکولر آئینی نظام کو ختم کر کے "ہندو [برہمنی] راشٹر" قائم کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا، اور رام مندر کی تحریک جس کا ایک حصہ ہے، اس میں کہیں ہماری خفیہ ایجنسیوں کے بعض افسران بھی تو ملوث نہیں ہیں؟

بابری مسجد کی عمارت کو کوئی ہاتھوں سے نہیں گرا دیا گیا بلکہ اس کیلئے باضابطہ لوہے کے بھاری اوزار، تھوڑے اور گنتیاں وغیرہ استعمال کئے گئے۔ مگر خفیہ ایجنسیوں کو وہ اوزار نظر ہی نہیں آئے؟ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے؟ ہماری نظر میں اس رپورٹ کا یہ پہلو اہم ترین ہے کہ حکومت سنجیدگی سے اس سوال پر غور کرے اور اس معاملے کی گہرائی سے جانچ کر ائے کہ کیا اس سازش کا بروقت پتہ نہ لگ پانا، خفیہ نظام کی ناکامی ہے یا کسی سازش کے تحت اس کو چھپایا گیا اور کیا اس میں سازش کو چھپائے رکھنے میں اس وقت مرکزی حکومت کے کچھ اہم ذمہ دار تو ملوث نہیں تھے؟

یہ جانچ سپریم کورٹ کے کسی جج کی سربراہی میں ماہرین کی ایسی بااختیار کمیٹی سے کرائی جانی چاہئے جس کے ارکان اپنے سیکولر نظریہ اور گہری نظر میں ممتاز ہوں، اور جن سے کوئی مطلوبہ فائل 'خفیہ' یا 'حساس' قرار دیکر چھپائی نہ جاسکے۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے اس سانحہ کے لئے (اور اسی طرح کی دوسری انتہا پسندانہ کارروائیوں کے لئے) سب سے بڑی خطا کار خفیہ ایجنسیاں ہیں، جو افواہیں تو مسلمانوں کا ہوا بنا کر پیش کرنے اور ان کو خونخوار دہشت گردی میں ملوث باور کرانے کے لئے افواہیں بھی خوب پھیلاتی رہتی ہیں، بغیر تصدیق و سند مسلم نوجوانوں کو جیلوں میں ٹھونس رہتی ہیں، مگر دہشت گردانہ واقعات کے رونما ہونے تک ان سے بے خبر رہتی ہیں۔

اتنی معلومات کے لیے سترہ برسوں کی ضرورت نہیں تھی

ایم۔ جے۔ اکبر

جسٹس ایم ایس لبراہن کو ہمیں وہ سب بتانے میں 17 برسوں کی ضرورت نہیں تھی، جو 6 دسمبر 92 کے بعد سے ہی ہم جانتے ہیں۔ بابرؒی مسجد کا انہدام رات کی تاریکی میں نہیں ہوا تھا۔ اسے اتوار کے روز دن کے اجالے میں رفتہ رفتہ ایک ایک پتھر گرا کر منہدم کیا گیا۔ اور یہ کام خوشی میں نعرے لگاتے ہزاروں کارسیوکوں اور وہاں موجود سیکڑوں صحافیوں کی موجودگی میں کیا گیا۔ جس کو ڈانٹا مائٹ لگا کر نہیں اڑایا گیا بلکہ اسے گینکتی اور پھاوڑے سے توڑا گیا۔

بلاشبہ آرائس ایس اور بی جے پی کے سینئر لیڈران وہاں موجود تھے۔ وہ بھی دراصل کارسیوک تھے۔ ہاں اٹل بھاری واجپئی وہاں اس دن موجود نہیں تھے۔ ہمیں یہ جاننے کے لیے 17 برسوں کے انتظار کی ضرورت نہیں تھی کہ ان سب کے ذمے دار و نے کئی تھے۔ وہ چھ ہزار روز سے اس کی ذمہ داری کا دعوا کر رہے ہیں۔

اس وقت کے وزیر دفاع شرد پوار نے چھ دسمبر کو ریکارڈ کی گئی ایک فلم چنندہ ممبران پارلیمنٹ کو چند روز بعد دکھائی تھی۔ لبراہن کمیشن اگر اس فلم کو دیکھ لیتا تو نصف رپورٹ اسی سے مکمل ہو جاتی۔

بہر حال یہاں صرف ایک سوال ہے جو شبہات میں گھرا ہوا ہے وہ یہ کہ جس روز بابرؒی مسجد کا انہدام ہوتا رہا اس روز وزیراعظم نرسمہا راؤ کیا کرتے رہے اور

وزیر داخلہ ایس بی چوان کیوں منجمد ہو گئے تھے۔ جس وقت دہلی میں یہ خبر ملنے لگی کہ اجودھیا میں بابر مسجد پر حملہ ہو گیا ہے، تو لوگ سکتے میں آ گئے تھے۔ اس وقت اس امید کے ساتھ وزیراعظم کے گھر پر فون کال کا مسلسل تانتا لگا رہا کہ وہ اپنی حکومت کی طاقت کا استعمال کریں گے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کی اپنی ذمہ داری پوری کریں گے لیکن وزیراعظم کے سکرٹری کی طرف سے ننگ انسانیت جواب دیا جاتا رہا۔ وہ کہتے رہے کہ وزیراعظم موجود نہیں ہیں یا پھر سو رہے ہیں۔ یہ سراسر دروغ بیانی تھی۔ راؤ کی ناکارکردگی اور چوان کی خاموشی میں ملی بھگت تھی۔

لبرائن رپورٹ میں جان بوجھ کر مبہم انٹلی جنس ایجنسیوں پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ جبکہ ہر شخص جانتا ہے کہ کیا ہو رہا تھا۔ اور انٹلی جنس بیورو کے افسران دوسروں سے بہتر جانتے رہے ہوں گے۔ نرسمہا راؤ نے شام میں اس وقت جا کر کاہینہ میٹنگ طلب کی جب بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کے بعد الزام، انعام، اور سزا کی کارروائی کے لیے ایک وسیع پروگرام عمل میں لایا گیا۔ جو افسران اور صحافی راؤ کے رتھ پر سوار تھے انہیں انعامات دیے گئے۔ نرسمہا راؤ 1996 تک اقتدار میں رہے لیکن انہوں نے کبھی بھی امن و چین کے ساتھ نہ حکومت کی اور نہ ہی زندگی گزاری۔

کوئی بھی حکومت اس طرح آسانی کے ساتھ ماضی کو بلے میں دفن کر سکتی ہے جس طرح اپوزیشن پارٹی نے صدیوں پرانی مسجد کو منہدم کر کے بلے میں تبدیل کر دیا۔ ان دنوں وزیراعظم کے گھر کے باہر جو سنگی دیوار تعمیر کی گئی تھی اس کو صرف ان کے حاشیہ بردار ہی عبور کر سکتے تھے کوئی اور نہیں۔

رپورٹ کے حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

معصوم مراد آبادی

آج لبر اہن کمیشن کی رپورٹ کے مختلف پہلوؤں پر زور دار بحث ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں گفتگو ہوتی رہے گی لیکن اس سے زیادہ پریشان کن خبر یہ ہے کہ رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں بابرہ مسجد انہدام کے سلسلے میں جو فوجداری مقدمات چل رہے ہیں، انہیں فیصلہ ہونے میں مزید 20 سال لگ سکتے ہیں۔ واضح ہو کہ بابرہ مسجد انہدام کیس کے بیشتر ملزمان اس وقت پیرانہ سالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آئندہ بیس برسوں میں ان میں سے کتنے زندہ رہ پائیں گے، یہ کہنا مشکل ہے۔

رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں بابرہ مسجد کی شہادت کے 11 برس بعد 29 مارچ 2003 کو سماعت شروع ہوئی تھی اور اب تک صرف 7 گواہوں نے اپنے بیانات درج کرائے ہیں حالانکہ اب تک 56 سماعتیں ہو چکی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اب بھی تقریباً 500 گواہوں کو اپنی گواہی دینی ہے۔ عدالت میں جن ملزمان کے خلاف بابرہ مسجد انہدام کیس میں سی بی آئی نے فرد جرم داخل کر رکھی ہے، ان میں لبر اہن کمیشن کے ذریعے نامزد کئے گئے تمام اہم ملزمان کے نام شامل ہیں۔

لبر اہن کمیشن کی رپورٹ میں ایک بار پھر ان تمام مجرموں کو عوام کی عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے، جنہوں نے تاریخ کے اس سب سے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن ان کی بے شرمی، بے حیائی اور بے غیرتی کا عالم یہ ہے کہ وہ اس رپورٹ پر شرمندہ ہونے کے بجائے موضوع اس بات کو بنا رہے ہیں کہ آخر یہ

رپورٹ 'لیک' کیسے ہوگئی۔ اس رپورٹ میں سنگھ پر یوار کی سازشی ذہنیت اور گھناؤنے جرائم کی جو تفصیلات موجود ہیں، وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت پہلی بار سنگھ پر یوار اور بی جے پی کے کالے کارنامے ایک عدالتی کمیشن کی رپورٹ میں مکمل ثبوتوں کے ساتھ منظر عام پر آئے ہیں۔ ورنہ آج تک یہی ہوتا رہا ہے کہ یہ لوگ تمام الزامات کو بے بنیاد اور فضول قرار دے کر اپنی گردنیں بچاتے رہے ہیں۔

اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ بابری مسجد پچھلے 60 سال سے منہدم ہو رہی ہے۔ یعنی 1949 میں مسجد میں مورتیاں نصب کر کے اس کے انہدام کی جو داغ بیل ڈالی گئی تھی، اس پر قسطوں میں عمل ہوتا رہا ہے۔ 22/23 دسمبر 49 کی درمیانی شب میں شریپسندوں نے مسجد کی دیوار پھاند کر جب اس میں مورتیاں نصب کی تھیں تو اس کی رپورٹ ایک ہندو کانٹریبل نے ایودھیا کی پولس چوکی میں یہ کہتے ہوئے درج کرائی تھی کہ ”رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کچھ شریپسندوں نے مسجد کی دیوار پھاند کر وہاں مورتیاں نصب کر دی ہیں“۔ انتظامیہ نے مسجد سے مورتیاں ہٹانے کے بجائے وہاں تالا ڈال دیا اور تبھی سے بابری مسجد میں نماز کا سلسلہ رک گیا۔ بابری مسجد میں آخری بار 22 دسمبر 49 کی شب عشاء کی نماز ادا کی گئی تھی۔

بابری مسجد پر دوسرا بڑا حملہ 1986 میں کیا گیا جب ایک مقامی عدالت نے بابری مسجد کے صدر دروازے پر لگے ہوئے تالے کو کھول کر وہاں عام پوجا پاٹ کی اجازت دی۔ جس وقت بابری مسجد میں پوجا پاٹ شروع ہوئی تبھی سے وہاں عدالت نے یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ مسلمان اس اراضی سے 500 میٹر دور ہی رہیں گے۔ یعنی مسلمانوں کی ایک تاریخی عبادت گاہ سے ان کا رابطہ بالکل توڑ دیا گیا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ راقم الحروف نے بھیس بدل کر بابری مسجد میں

داخل ہونے میں کامیابی حاصل کی۔ بابرؒی مسجد کا تالا کھلنے کے بعد، میں پہلا مسلمان صحافی تھا جو مسجد میں داخل ہوا اور وہاں کے حالات کی مکمل رپورٹنگ مفت روزہ 'نئی دنیا' میں شائع کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بابرؒی مسجد میں گزار کر اس کے سنگ مرمر کی نہایت خوبصورت جائے نمازوں اور منبر سے لے کر درود یوار اور طاقوں کا بھرپور جائزہ لے کر قلم بند کیا۔

بابرؒی مسجد پر تیسرا پھاؤ 9 نومبر 1989 کو چلایا گیا جب حکومت نے بابرؒی مسجد کے روبرو قبرستان کی متنازعہ اراضی پر رام مندر کا شلانیاس کرنے کی اجازت دی۔ 9 نومبر 1989 کو جب بابرؒی مسجد کے روبرو رام مندر کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو راقم الحروف ایک بار پھر ایودھیا کے اسی مقام پر موجود تھا اور اس نے اس پورے واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا تھا۔ اس موقع پر وشو ہندو پریشد اور بی جے پی کے لیڈروں نے بہ آواز بلند یہ نعرے لگائے تھے کہ یہ ڈھانچہ (بابرؒی مسجد) کے انہدام کا نقطہ آغاز ہے۔ اس دوران 1990 میں سو مناتھ سے ایودھیا تک نکالی گئی لال کرشن اڈوانی کی رتھ یا ترا کو بھی یاد رکھا جانا چاہئے جس نے مسجد کے انہدام کے لئے کارسیو کوں کی بھرتی کی مہم چلائی تھی اور پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کا آتش فشاں تیار کیا تھا۔

6 دسمبر 1992 کو بابرؒی مسجد شہید کی گئی تو اس وقت ملک میں قانون کی حکمرانی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سنگھ پر یوار نے اس کام کے لئے ملک میں ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی اور یہ کام خود حکومت کیمشینری میں موجود وہی عناصر انجام دے رہے تھے جنہوں نے آئین کی پاسداری کا حلف اٹھا رکھا تھا۔ لیکن وہ ہندوستان کے سیکولر جمہوری آئین کے بجائے آرایس ایس کے ملک دشمن آئین پر عمل کر رہے تھے۔ اسی لئے جس وقت بابرؒی مسجد شہید کی جا رہی تھی حکومت کی مشینری کو سانپ سونگھ گیا تھا اور سارے اختیارات آرایس ایس کی

متوازی حکومت کو سونپ دئے گئے تھے۔ اسی لئے ملک کی ذیلی عدالتوں سے لے کر سپریم کورٹ تک کے احکامات کو پیروں تلے روند اگیا۔ جن لوگوں نے مسجد کی حفاظت کے حلف نامے داخل کئے تھے وہی اس کے انہدام میں پیش پیش تھے۔ جس میں بنیادی کردار کلیان سنگھ نے ادا کیا جو اس وقت اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے آئینی اختیارات رکھتے تھے لیکن انہوں نے آئین اور عدالت عالیہ سے کھلی غداری کا مظاہرہ کیا جس کے لئے سپریم کورٹ نے انہیں ایک دن کی علامتی سزا بھی دی۔

لبراہن کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ میں جسے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت بے وقعت اور فضول ثابت کرنے کی مہم چلی ہوئی ہے،۔ بابر مسجد کے انہدام کی سازش کا بھرپور بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔ جسٹس لبراہن نے ایک عدالتی کمیشن کے تحت سنگھ پر یوار کے بارے میں ایسی باتیں درج کی ہیں جو آج تک کبھی کسی سرکاری ریکارڈ میں درج نہیں تھیں۔

لبراہن کمیشن کی رپورٹ میں جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ سنگھ پر یوار کی گھناؤنی سازش کا مکمل پردہ فاش کرتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

- بابر مسجد کا انہدام کارسیوکوں کے غصہ کا نہیں بلکہ ایک منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھا۔
- کارسیوکوں کو جو آلات فراہم کئے گئے تھے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسجد کو منہدم کرنے کی سوچی سمجھی سازش تیار ہوئی تھی۔

- اس کام کے لئے سنگھ پر یوار نے مالی مدد فراہم کی تھی اور سنگھ پر یوار سے وابستہ مختلف لوگوں نے یہ رقومات بینکوں سے نکالی تھیں۔

- اس وقت کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ اور ان کے سرکاری افسران کی سازش کے نتیجے میں مسجد منہدم ہوئی اور اسی گٹھ جوڑ کے نتیجے میں وہاں ایک متوازی حکومت وجود میں آئی۔

- حکومت اتر پردیش اس سازش میں جان بوجھ کر ایک فریق کے طور پر شامل رہی۔

● بابر مسجد انہدام کی سازش سنگھ پر یوار اور وشو ہندو پریشد کے دماغوں کی اختراع تھی جس کے تحت انہوں نے عام لوگوں کے ذہنوں میں نفرت کا زہر انڈیل کر انہیں مشتعل ہجوم میں تبدیل کیا۔ پولیس نے اس سازش کو عملی جامہ پہنانے کے زیر اثر اپنی کارروائیاں انجام دیں۔

● مرکزی حکومت کا خفیہ نظام پوری طرح ناکام رہا اور 6 دسمبر کو حکومت کی طرف سے ایک بھی ویڈیو کیمرہ وہاں نصب نہیں کیا گیا۔

● واچسٹی، جوشی، اڈوانی اور گووند اچاریہ سنگھ پر یوار کے منصوبے سے پوری طرح آگاہ تھے اور انہوں نے اس سازش کی تکمیل کے لئے مختلف طریقوں سے تعاون کیا۔ مجموعی طور پر اس سازش میں 68 لوگوں کو شامل کیا گیا جس میں اڈوانی، واچسٹی اور جوشی شامل ہیں۔

لبراہن کمیشن نے 1029 صفحات میں اپنی جو رپورٹ تیار کی ہے اس کے مذکورہ نکات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سازش کتنی گہری تھی۔ اسی لئے جسٹس لبراہن نے بار بار ملک کے سیکولر جمہوری تانے بانے کی برقراری پر زور دیتے ہوئے مستقبل میں پختہ انتظامات کرنے کی ضرورت اجاگر کی ہے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ سیاستدانوں کے ساتھ پولیس افسران اور نوکر شاہوں کا گٹھ جوڑ توڑ نا ضروری ہے کیونکہ مذہب اور سیاست کی بنیاد پر منقسم پولیس اور نوکر شاہ ملک کے لئے زہر ہلاہل ہیں۔ رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ سیاستدانوں اور آئینی عہدوں پر بیٹھے لوگوں کو کسی بھی مذہبی اور فلاحی تنظیموں کا عہدیدار نہیں بننا چاہئے۔

لبراہن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جو فرقہ واریت کے نتیجے میں ہمارے ملک کو شدید نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کمیشن نے حکومت سے کہا ہے کہ بابر مسجد تنازع کا جلد ہی عدالتی فیصلہ ہونا چاہئے۔ کمیشن

نے اپنے دائرہ اختیار سے باہر جا کر بھی بعض بنیادی باتیں کہی ہیں۔ اس میں بہتر نظم و نسق، پولیس کی اصلاح، سول سروسز، فسادات پر قابو پانے، خفیہ ایجنسیوں کے کام کاج مرکز اور صوبائی حکومتوں کے رشتوں، مذہبی مقامات اور ملک کے کام کاج پر حکومت کو طویل اور کارآمد مشورے دئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ رپورٹ جہاں ایک جانب بابر مسجد انہدام کی سازش میں ملوث سنگھ پر یوار کے کالے کارناموں کو بے نقاب کرتی ہے، وہیں پولیس، سول انتظامیہ اور سیاست میں موجود ان کالی بھیڑوں کی بھی نشاندہی کرتی ہے جو ایک سیکولر جمہوری آئین کی وفاداری کا حلف لے کر ملک میں ایک متوازی حکومت رہے ہیں۔ یہ صورتحال ملک کے لئے خاصی تشویشناک ہے۔ اسی لئے سنگھ پر یوار اور بی جے پی کے تمام لیڈران لبرالہن کمیشن کی رپورٹ کو بے وقعت ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ وہ اس رپورٹ کو بھی بابر مسجد کی طرح زمیں بوس کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ لبرالہن کمیشن کے ذریعہ نامزد کئے گئے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ ملک کے آئین قانون عدلیہ اور انصاف کو منہدم کرنے کا جو عمل 1949 میں بابر مسجد کی بے حرمتی کر کے شروع کیا گیا تھا اور جس کا نقطہ عروج بابر مسجد کی شہادت کا المناک واقعہ تھا وہ آج بھی زور و شور سے جاری ہے۔ بابر مسجد اس ملک میں آئین قانون، سیکولرازم اور جمہوریت کے قیام کی ایک کسوٹی تھی۔ آج بابر مسجد ایک عمارت کی شکل میں موجود نہیں ہے لیکن ملک میں آئین، قانون، سیکولرازم اور جمہوریت کے سنہرے اصول موجود ہیں جن کے انہدام کی کوششیں آج بھی جاری ہیں۔ لبرالہن کمیشن کی رپورٹ میں اس انہدام کو روکنے کا نسخہ موجود ہے۔

تاخیر کی وجہ سے رپورٹ کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی

ظفریاب جیلانی

لبر اہن رپورٹ ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج کی تیار کردہ رپورٹ ہے، اس لیے اس کی اہمیت تو ہے ہی۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ رپورٹ کا خلاصہ کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کن ثبوتوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ رپورٹ کے تاخیر سے آنے سے اس کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔ البتہ کچھ ایسے معاملے ہوتے ہیں جن پر تاخیر سے رپورٹ کا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سے متعلق باتیں لوگ بھلا بھی دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا زخم ہے جسے مسلمان کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بالخصوص اس وقت تک جب تک کہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں آ جاتا۔ مسلمانوں کے علاوہ سیکولر طبقات بھی اس رپورٹ کے منتظر تھے کہ ایک باضابطہ اور سرکاری رپورٹ آئے اور لوگ جان سکیں کہ بابر کی مسجد انہدام میں دراصل کن لوگوں کا ہاتھ تھا۔

البتہ اس سلسلے میں جاری مقدمات کے تعلق سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مقدمات ثبوتوں کی بنیاد پر فیصلہ ہوتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ مستقبل میں یہ رپورٹ ہندوستانیوں کے لیے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھے گی۔ اور اس معاملہ کی سچائی جان لینے کے بعد شاید مستقبل میں ایسا کوئی واقعہ نہ ہو۔ اس رپورٹ میں لبر اہن نے تکنیکی بنیادوں پر نرسمہاراؤ کو جس طرح بری الذمہ کیا ہے، ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ البتہ جہاں تک اٹل بھاری واچسٹی کا سوال ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس

سازش سے واقف تھے۔ لیکن وہ خود اس معاملے میں کس حد تک شامل تھے۔ اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے کبھی بھی ان کو ملزم بنانے کی بات نہیں کہی۔ ان کے بارے میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ انہیں ملزم بنایا جائے۔ ہاں یہ ضرور کہا گیا کہ یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری تھی کہ وہ جس ہونے والے واقعہ کی سازش سے واقف تھے، اس سے لوگوں کو باخبر کرتے۔ اس بارے میں اٹل جی نے کبھی ذکر نہیں کیا کہ جذبات میں آ کر مسجد گرا دی جائے گی۔

جہاں تک اس رپورٹ میں مسلم قیادت پر نکتہ چینی کی بات ہے تو یہ نکتہ وہ صرف اس بات پر ہے کہ مسلمانوں نے ثبوت فراہم کرنے کا سلسلے میں کوئی تعاون نہیں دیا۔ اس سلسلے میں میرا کہنا ہے کہ جسٹس لبراہن نے ہم لوگوں کے بارے میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط فہمی کی بنیاد پر ہے، کمیشن نے اس سلسلہ میں کچھ جاننے کے لیے ہم لوگوں کو بلایا ہی نہیں۔ لیکن بابر میسج انہدام کے لیے انہوں نے ہم لوگوں کو بالکل ذمہ دار نہیں ٹھہرایا ہے۔ یوں تو اس واقعہ کے لیے سنگھ پر یوار کا پورا کنبہ ذمہ دار ہے جس میں آ ر ایس ایس، بی جے پی، وشو ہندو پریشد، شیو سینا اور بجرنگ دل شامل ہیں، لیکن سب سے زیادہ ذمہ دار کلیان سنگھ ہیں، جنہوں نے اتنی خراب صورتحال میں بھی فائرنگ نہ کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ جبکہ 1990 میں بھی ایسی ہی صورتحال تھی اور ملائم سنگھ نے فائرنگ کروائی تھی جس میں دو لوگوں کی موت ہوئی تھی اور باقی سب بچ گئے تھے۔ اس طرح ایک حادثہ ٹل گیا تھا۔

اس کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر مقدمہ آگے تو نہیں بڑھایا جاسکتا لیکن ایسی بہت سی باتیں جو شروع میں ایف آئی آر میں نہیں تھیں لیکن اب کمیشن کی رپورٹ میں کھل کر سامنے آئی ہیں۔ اگر سی بی آئی چاہے تو وہ نئے سرے سے رپورٹ فائل کر کے مقدمہ کو اور مضبوطی دے سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس سلسلہ میں ہم نے بھی اپنے مقدمہ میں کچھ باتیں شامل کی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے بہت سے

لوگ ہیں جو سی بی آئی کی رپورٹ میں شامل نہیں ہیں لیکن جسٹس لبراہن کی انکوائری میں وہ شامل ہوئے ہیں۔ چاہے وہ بابر مسجد انہدام سے براہ راست منسلک نہ ہوں لیکن وہ سازش میں شامل تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو جسٹس لبراہن نے اپنی جانچ کے احاطہ میں لے کر انہیں ملزم قرار دیا ہے۔ ان افراد کے خلاف مقدمہ نئے سرے سے چلایا جاسکتا ہے۔

کمیشن کی رپورٹ میں بہت سے خطوط اور تحریروں کے علاوہ ایسے ویڈیو کیسٹ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے بالواسطہ طور پر بابر مسجد کو گرانے کی سازش کی تھی یا انہوں نے اس کے لئے ماحول بنایا تھا۔ جس طرح آج کچھ لوگ سابق وزیراعظم اٹل بھاری واجپئی اور دیور ہوا بابا کے ناموں کی شمولیت پر اعتراض کر رہے ہیں تو وہ صرف بے بنیاد باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے یا تو رپورٹ کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر معاملے کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رپورٹ میں جسٹس لبراہن نے دیور ہوا بابا کو مسجد انہدام میں ملزم ہی نہیں قرار دیا ہے، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد منہدم کرنے سے بہت قبل جو ملک اور ریاست میں ماحول بنایا جا رہا تھا اور فرقہ پرستی کی بنیاد پر سماج کو تقسیم کیا جا رہا تھا اس کو یہ لوگ اپنی تقریروں اور باتوں سے ہوادے رہے تھے ان کی اس میں سازش تو شامل ہے لیکن وہ خود براہ راست اس میں شامل نہیں ہیں۔ سابق وزیراعظم اٹل بھاری واجپئی کی تقریروں کے کیسٹ آج بھی لوگوں کے پاس موجود ہیں، ان کے اخباری بیان اور الیکٹرانک میڈیا کو دیئے گئے انٹرویوز ہیں۔ ذرا ان کی وکالت کرنے والے بتائیں کیا وہ بالکل معصوم ہیں اس مسئلہ میں۔ اٹل بھاری واجپئی کو اس کا پورا علم تھا۔ جسٹس لبراہن نے یہی تو کہا ہے کہ اس سازش کا علم واجپئی کو تھا۔ جسٹس لبراہن نے بہت مدلل اور ثبوتوں کے ساتھ ساری باتیں کہی ہیں۔ ہمارے سیاست داں جن میں ہندو

اور مسلمان دونوں شامل ہیں ان میں نصف اس رپورٹ کو اہمیت دیتے ہیں تو نصف اسے بیکار سمجھتے ہیں۔ اس میں ایسے لیڈر اور مذہبی شخصیتیں بھی شامل ہیں جو باہری مسجد مسئلہ کو خوب سمجھتی ہیں اور اس میں پیش پیش بھی ہیں۔ لبرالہن کمیشن نے جہاں ملزمان کا نام گنایا ہے وہیں ان میں مذکورہ لوگوں کو شامل کر کے ایک علاحدہ عنوان سے نیا باب قائم کیا ہے جس میں مسجد انہدام کے لئے ماحول بنانے والوں کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔



کیا حکومت کوئی کارروائی کرے گی؟

ظفر آغا

آخرش لبر اہن کمیشن رپورٹ کا انتظار بھی ختم ہوا۔ فروری 1986 میں ایودھیا میں بابری مسجد کا تالا کھلنے سے لے کر 6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد گرنے تک اور پھر 2002 میں گجرات فساد تک ہندوستانی سیاست میں سنگھ پر یوار نے جو ایک نفرت اور خونی سیاست کا باب رچا تھا، آخر وہ باب لبر اہن کمیشن رپورٹ کے ساتھ اپنے اختتام تک پہنچا۔ بابری مسجد انہدام یقیناً اب تک کی آزاد ہندوستانی سیاست کے نہ صرف اہم ترین ابواب میں سے ایک باب ہے بلکہ اس خونچکاں افسانے میں پندرہ کروڑ مسلمانوں کے ساتھ ہر سطح پر ظلم و زبردستی کی ایک ایسی داستان رقم ہے جس کی نظیر دنیا میں ذرا مشکل سے ملے گی۔ 6 دسمبر 1992 کو ایودھیا میں محض ایک تاریخی عمارت ہی زمین بوس نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس روز مسجد کی جگہ پر باقاعدہ ایک مندر بھی تعمیر ہوا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ 6 دسمبر 1992 سے اس ملک میں مندر کو مسجد پر فوقیت رہے گی۔ بالفاظ دیگر یہ ہندوستانی سیکولرزم کا وہ نیارخ تھا جس میں اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کو حکومت کی سطح پر دوسرے درجے کا شہری بنائے جانے کا اعلان تھا اور ایودھیا میں بابری مسجد ڈھائے جانے سے لے کر 2004 میں مرکز میں بی جے پی حکومت کے قیام تک باقاعدہ دوسرے درجے کے شہری کی ہی حیثیت حاصل رہی۔ کبھی مسجد گرا کر سنگھ پر یوار نے سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے خون سے ہندو راشٹر بنانے کا جشن منایا جس میں بقول جسٹس

لبراہن دو ہزار سے زیادہ مسلمان مارے گئے۔ اس کے بعد مہاراشٹر اور بالخصوص فوراً بعد بال ٹھا کرے کی قیادت میں 1993 میں شیوسینا نے تقریباً ایک ہزار تا ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کا خون بہایا اور مسلمانوں کی اس نسل کشی کروانے والی شخصیت کو ہندوستانی میڈیا نے 'ٹائیگر' کہہ کر بہادری کے تمنغے سے نوازا۔ پھر گجرات میں 2002 میں نریندر مودی نے نہ صرف ہندوستانی آئین کا کھلا مذاق اڑایا، بلکہ مسلمانوں کی نسل کشی کروا کر اور ان کی ناموس کی آبروریزی کروا کر انسانی تہذیب کی تمام تر قدروں کو مجروح کیا۔ یعنی بابری مسجد اور رام مندر کشمکش کے بہانے مسلمانوں کا تقریباً 22 برس (یعنی بابری مسجد کا تالا کھلنے سے لے کر گجرات فسادات تک) نہ صرف قتل و غارت چلتا رہا، بلکہ سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی اعتبار سے اس ملک کے مسلمان کی مستقل تذلیل کی جاتی رہی تاکہ مسلمان نہ صرف اپنے کو لاچار و مجبور سمجھے بلکہ وہ نفسیاتی طور پر خود کو دوسرے درجے کا شہری بھی سمجھ لے۔ بابری مسجد کا انہدام محض ایک مسجد کو گرائے جانے کی کہانی نہیں تھی۔ دراصل رام مندر کے نام سے اس ملک میں ایک نئی سیاست کا آغاز ہوا تھا جس کو اس ملک کے تمام نظام اور نظام کے باہر ہندو اعلیٰ ذاتوں کے ایک بہت بڑے طبقے کی پوری حمایت حاصل تھی۔ تب سے ہی تو آرائس ایس، اور سنگھ پر یوار نے بابری مسجد کو گرانے کی منصوبہ بند سازش رچی۔ بقول جسٹس لبراہن اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور اشوک سنگھ جیسے سنگھ اور بی جے پی کے مکھوٹوں نے بابری مسجد گرائے جانے کی پورے ملک میں فضا بنائی۔ پھر کلیان سنگھ اور اس کی انگلیوں پر ناپنے والے افسروں نے حکومت اتر پردیش اور پولس کی نگرانی میں بے سیارام کی دھن اور گانے بجانے کے ساتھ اطمینان سے بابری مسجد گرائی اور بھلے ہی لبراہن کمیشن نرسمہاراؤ کی کانگریس اور مرکزی حکومت کو مسجد گرانے کی ذمہ داری

سے مبرا کر چکی ہو۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ سیاسی سطح پر کانگریس پارٹی نے اور بطور وزیراعظم نرسمہاراؤ نے مسجد گرانے کی سازش میں آرائس ایس کا پورا ساتھ نبھایا اور کمال یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے اڈوانی اور جوشی کی انتہائی فرقہ وارانہ رتھ یا ترا کے باوجود سنگھ پر یوار کو ایودھیا میں کاریسوا کی اجازت دی اور سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس عدالت نے کاریسوا ٹھیک ہونے کے لئے ایک نمائندہ ایودھیا میں تعینات کیا۔ اس کو مذاق نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟ پھر نہ صرف ملک کے اخباروں نے بلکہ اس وقت اعلیٰ ذات برہمن نظام نے رام مندر کی تعمیر کے نام پر جو ہنگام بپا کیا جس کے سبب بابری مسجد گری وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت ملک کی صوبائی اور مرکزی حکومت ہی نہیں بلکہ اس ملک کے سیاسی نظام بابری مسجد کو ڈھیر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ سپریم کورٹ کے مشاہد کی موجودگی میں آخر مسجد گری اور اسی مسجد کے گرانے کے ایک ماہ بعد نرسمہاراؤ نے اس سازش پر سے پردہ اٹھانے کے لئے لبراہن کمیشن کی تشکیل دے دی۔ جسٹس لبراہن نے آرائس ایس اور سنگھ پر یوار کو جس طرح اس رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے، ویسا ان سے قبل کوئی اور یہ کام انجام نہیں دے سکا۔ الغرض بابری مسجد گرانے کی ذمہ داری جسٹس لبراہن کمیشن نے تین گروہوں پر رکھی ہے۔ میں ذیل میں ان کے اقتباس پیش کر رہا ہوں۔

”پوری ایودھیا تحریک کا سہرا اگر کسی کو جاتا ہے تو وہ ہے سنگھ پر یوار ہے“
 پھر آگے اسی رپورٹ میں جسٹس لبراہن نے 6 دسمبر کو مسجد گرانے کی ذمہ داری تین گروہوں پر یوں رکھی ہے۔

”پہلا گروہ وہ ہے جو 6 دسمبر 1992 کو ایودھیا میں پیش آنے والے

تمام واقعات کا بنیادی طور پر ذمہ دار ہے۔ ان افراد اور تنظیموں کو ایودھیا

میں پیش ہونے والے واقعات کا نہ صرف پہلے سے علم تھا بلکہ انہوں نے ہی ان واقعات کی پوری اسکرپٹ بھی لکھی تھی۔“

یہ بات جسٹس لبراہن آرایس ایس اور سنگھ پر یوار کے لئے لکھ رہے ہیں۔ پھر دوسرا گروہ جس کو جسٹس لبراہن نے بابرہ مسجد انہدام کے لئے ٹھہرایا ہے اس کو انہوں نے نفلی اعتدال پسند کا نام دیا ہے۔ ان کے متعلق لبراہن رپورٹ کہتی ہے:

”دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جن پر (مسجد گروانے کی) جسمانی، نظریاتی اور دانشورانہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ افراد خود کوئی فیصلہ نہیں کر رہے تھے (بلکہ آرا ایس ایس کے ہر فیصلے کے لئے ملک میں راہ ہموار کر رہے تھے)۔ یہ افراد عوام کے اور عدالتوں کے سامنے ایک بھولا بھالا چہرہ پیش کرتے تھے۔ (لیکن ان کو معلوم تھا کہ ان کا اصل نشانہ کیا ہے)۔ ایسے افراد کو نفلی اعتدال پسند گردانا جاسکتا ہے۔ اس گروہ میں جسٹس لبراہن نے لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اٹل بہاری واجپئی اور کلیان سنگھ جیسوں کو شمار کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عوامی اور عدالتی سطح پر جھوٹے اور بھولے بن کر مسجد گروانے کا کام کیا۔ پھر تیسرے گروہ میں جسٹس لبراہن نے ان افسروں کو رکھا ہے جو بہت سوچ سمجھ کر مسجد گروانے کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس کو وہ Teritory Group کہتے ہیں اور ان کے بارے میں وہ اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں۔

”یہ سنگھ پر یوار کے افراد نہیں تھے۔ یہ وہ افسران تھے جن کا حلیہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ایودھیا میں ہونے والے واقعات کو پوری طرح روکیں۔ لیکن ان افراد نے اپنے فرائض کے عین الناکام کیا۔“

اب سوال یہ ہے کہ آیا ان تینوں گروہوں کے خلاف حکومت ہند کی جانب سے کوئی قدم اٹھایا جائے گا یا نہیں۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا حکومت ہند آرایس ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیو سینا جیسی تنظیموں کے خلاف کوئی

قدم اٹھائے گی۔ کیونکہ بقول لبراہن کمیشن یہ وہ گروہ ہیں جو بابرؒ مسجد ڈھائے جانے کے بنیادی ذمہ دار ہیں اور انہوں نے مسجد گرائے جانے کی ”اسکرپٹ“ بھی لکھی تھی۔ دوسرا سوال یہ کہ آیا لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور اشوک سنگھ جیسے افراد کو سزا ملے گی! کیا حکومت ہند میں یہ جرأت ہے کہ اب کمیشن میں اٹل بھاری کا نام آنے کے بعد حکومت ان پر مقدمہ قائم کرے! اور تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ افسران جنہوں نے مسجد گروائی ان کو سخت سے سخت سزا دے کر حکومت ہند مستقبل کے لئے کوئی مثال قائم کرے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہند کی جانب سے وزیر داخلہ نے Action taken report میں جو کہا اس کا لب لباب یہی ہے کہ آریس ایس، وشو ہندو پریشد جیسی تنظیموں کے خلاف حکومت کوئی قدم نہیں اٹھانے والی ہے۔ لال کرشن اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی جیسوں پر جو مقدمہ چل رہا ہے وہ ان کی زندگی میں ختم ہونے والا نہیں اس لئے ان کو سزا کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اسی طرح وہ افسران جنہوں نے کلیان سنگھ کے ساتھ مل کر مسجد گرائی وہ جیسے مزے سے گھوم رہے تھے ویسے ہی مزے سے گھومتے رہیں گے۔ اب بنیادی سوال: وہ ہندوستانی مسلمان جو بابرؒ مسجد کی آڑ میں سنگھ کی سازش کا شکار ہوا کیا لبراہن کمیشن رپورٹ ملنے کے بعد انصاف کی کوئی امید رکھ سکتا ہے؟ جواب: پی چدمبرم کی action taken report کے بعد اگر کسی کو اس بات کا یقین ہے کہ مسلمانوں کو انصاف ملے گا تو اس کو محض بیوقوف ہی گردانا جاسکتا ہے۔ لب و لباب یہ کہ ہندوستانی مسلمان 6 دسمبر 1992 کو جہاں کھڑا تھا، لبراہن کمیشن رپورٹ آنے کے 17 برس بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ یعنی نہ بابرؒ مسجد گرتے وقت مسلمانوں کے لئے انصاف تھا اور نہ مسجد گرنے کی سازش پر سے پردہ اٹھنے کے بعد اس کے لئے کہیں انصاف کی گنجائش ہے اور یہی بات ہندوستانی مسلمان کے لئے ایک لمحہ فکر یہ ہے۔

لبراہن رپورٹ: قاتلوں کو کب سزا ملے گی

سید علی

بابری مسجد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ قہراً مجبوراً پارلیمنٹ میں پیش کر دی گئی اور بوتل میں بند وہ جن اپنی پوری ہیبت کے ساتھ باہر نکل آیا جس کا مے ابرسوں سے انتظار تھا۔ رپورٹ پیش ہوتے ہی حسب توقع ہنگامہ مچ گیا اور چور مچائے شور کے مصداق پورا سنگھ پر یو اریڈی پر کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ اس نے اس کا انکار نہیں کیا کہ جن 68 افراد کو ملزم ٹھہرایا گیا ہے وہ سرتاسر غلط ہے بلکہ اس نے پہلا ایشوا اس کو بنایا کہ یہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے پہلے افشا کیسے ہو گئی۔ دوسرا ایشوا اس کو بنایا کہ اٹل بھاری واجپئی کو مسجد توڑنے کی منصوبہ سازی میں شریک کیوں مانا گیا؟ حالانکہ اگر یہ کسی صورت میں مان بھی لیا جائے کہ مرکزی حکومت کی ”سازش“ سے یہ رپورٹ لیک آؤٹ ہوئی ہے تو اس سے ان دہشت گردوں کا مجرمانہ کردار تو متاثر نہیں ہو جاتا اور بابری مسجد کے مجرموں کو مواخذہ سے بری نہیں کیا جاسکتا۔ جسٹس لبراہن نے صحیح کہا ہے کہ کسی جمہوریت میں عوام کے بھروسے کی پامالی سے بڑھ کر کوئی دغا یا جرم نہیں اور اس کے ارتکاب کرنے والوں کو شبہ کا فائدہ بھی نہیں ملنا چاہئے۔

لبراہن کمیشن رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بابری مسجد کی شہادت منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھی اور اس کا مقصد فرقہ وارانہ فساد بھڑکانا تھا۔ رپورٹ میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ پورا سنگھ پر یوار بشمول آ ر ایس ایس، بی جے پی، شیو سینا، بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد سبھوں نے منصوبہ بنایا اور مسجد شہید کی۔ اس کی جگہ

میک شفٹ (عارضی) مندر کھڑا کر دیا گیا اور مورتی نصب کر دی گئی۔ مسجد کی شہادت کی منصوبہ بندی میں پر یوار کا انتہا پسند طبقہ، نام نہاد اعتدال پسند طبقہ اور افسروں کا طبقہ شامل تھا۔ واضح رہے کہ اٹل بہاری واجپئی کے خلاف فرد جرم پران کی پارٹی بڑا شور مچا رہی ہے لیکن ٹی وی میں 5 دسمبر 1992ء کا وہ فوٹیج دکھایا جا رہا ہے جس میں واجپئی جی کو لہک لہک کر جوشیلے انداز میں کارسیوں کے مجمع کو لاکارتے ہوئے بابر ی مسجد کو زمین کے برابر کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ بابر ی مسجد کے انہدام کے پورے پلاٹ میں سنگھ پر یوار کے لیڈروں کا ہاتھ تھا جس میں واجپئی، اڈوانی، جوشی، سنگھل، آ ر ایس ایس کے سابق چیف سدرشن، بال ٹھا کرے، کلیان سنگھ، اوما بھارتی، ونے کٹیار سب شامل تھے اور ان کا مقصد ملک کو فرقہ وارانہ آگ میں جھونک کر سیاسی فائدہ اٹھانا تھا۔ البتہ لبرائین کمیشن کی رپورٹ میں اس وقت کے وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ کو کلین چٹ دی گئی ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

اس رپورٹ میں جہاں ایک طرف سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ کو کلین چٹ دی گئی ہے اسی کے ساتھ مسلم لیڈروں اور تنظیموں کو ناحق مایوس اور پست حوصلہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ رپورٹ میں مجرمین کے خلاف سزا اور بابر ی مسجد کی تعمیر نو کی بھی سفارش نہ کر کے کمیشن نے بھول کی ہے۔ مسلم قیادت نے آنجہانی وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے وعدے اور حکومت کے اس حلف نامہ پر اعتماد کیا تھا کہ بابر ی مسجد کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ رپورٹ میں مسلم قیادت پر تو تنقید کی گئی ہے جب کہ نرسمہا راؤ کو تمام ذمہ داریوں سے صاف بچالیا گیا ہے۔ مسجد کی شہادت کے بعد اخلاقی طور پر وزیر اعظم کو مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔ نرسمہا راؤ اگر مداخلت کرتے اور حالات کی نزاکت کا علم رکھتے ہوئے صدر راج نافذ کر دیتے تو مسامری ٹالی جاسکتی تھی اور متنازع جگہ فوج اور مرکزی سلامتی دستوں کے سپرد کر دی جاتی تو یہ سانحہ پیش نہیں آتا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ بابر ی مسجد کے خلاف سازش 1949 میں شروع

ہو چکی تھی۔ جب شری پسندوں نے رات کی تاریکی میں چوری چپکے مسجد کے اندر مورتی نصب کر دی اور شور مچایا کہ رام کا پرگٹ ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مسجد کے گیٹ پر تالا لگ گیا، نمازیں بند ہو گئیں۔ یہ کانگریس کے دور حکومت میں ہوا۔ شیلانیاس سے لے کر مسجد کے انہدام تک کانگریس کی حکومت تھی۔ بابری مسجد کے تحفظ کے لئے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ 6 دسمبر 1992ء کو دن کے اجالے میں ایک جمہوری سیکولر ملک میں ایک تاریخی مسجد ڈھائی جا رہی تھی اور جمہوریت کا قتل ہو رہا تھا اور سب لوگ اس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب مسجد چورس ہو گئی اور مسجد کے اندر عارضی مندر کی بنیاد رکھ دی گئی تب نرسمہاراؤ حرکت میں آئے اور مگر مجھ کے آنسو بہاتے ہوئے وعدہ کیا کہ مسجد وہیں بنائی جائے گی۔ کیا نرسمہاراؤ کا سارا رول مجرمانہ نہیں تھا؟

آر ایس ایس کا کہنا ہے کہ اجودھیا کا واقعہ اس وقت کی سرکار کی لاپرواہی سے پیدا شدہ عوامی غصے کا نتیجہ تھا حالانکہ سوائے فسطائی گروہوں کی منصوبہ بند سازش کے عام ہندوؤں میں کوئی غصہ نہیں تھا۔ رام مندر تحریک کبھی عوامی نہیں بن سکی اور ہندوؤں کی بڑی اکثریت کی حمایت تحریک کو کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔ اقبالی مجرم اوما بھارتی سینہ ٹھوک کر کہتی رہی ہے کہ اس کو بابری مسجد ڈھانچہ گرائے جانے کا کوئی افسوس نہیں ہے جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری قبول ہے۔ ورنہ کئی بار ہمیشہ کہتا رہا ہے کہ اس کی پارٹی کو رام جنم بھومی کے سوا کوئی چیز تسلیم نہیں۔ کمیشن کی رپورٹ بیکار ہے۔ ایسی رپورٹ صرف سیاسی بحث کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ کلیان سنگھ الگ گرج رہا ہے کہ کمیشن کی رپورٹ اور اس کی سفارش کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آر ایس ایس کے ترجمان رام مادھونے اپنے رد عمل میں کہا ہے کہ ڈھانچے کو گرانے کا سنگھ کو کوئی ملال نہیں ہے اور سرکار اس بات کے لئے آزاد ہے کہ وہ جس کو قصور وار سمجھتی ہے قانون کے مطابق اسے سزا دلائے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے مسجد

کے انہدام کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ لبر اہن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ان سیاست دانوں کے اس رویے کی سخت تنقید کی ہے جو مذہب کی سیاست میں آمیزش کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں حکومت نے اس بات کی یقین دہانی کرائی ہے کہ بابر مسجد انہدام کے ملزموں کے خلاف درج مقدمات کی سماعت میں تیزی لائی جائے گی۔ ایکشن ٹیکن رپورٹ میں وضاحت کی گئی ہے کہ مذہبی امور پر سیاست کرنے والی پارٹیوں پر پابندی لگانے سے متعلق کمیشن کی سفارش غور طلب ہے۔ سرکار نے سیاست کے لئے مذہب کا استعمال کرنے پر فوری کارروائی کی سفارش ایکشن کمیشن کو بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ بعد از خرابی بسیار حکومت اپنے عہد کی کتنی پابند رہتی ہے اور کب تک رپورٹ میں نامزد ملزموں پر مقدمہ چلاتی اور سزا دلاتی ہے اور کب کمیشن کی دیگر سفارشوں پر عمل کرتی ہے۔ عمل بھی کرتی ہے یا اس مسئلے کو بھی ٹھنڈے بستے میں ڈال دیتی ہے۔ حکومت کے فقط اعلان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر حکومت اب بھی انصاف کرنے سے خوفزدہ ہے تو یہ ملک کے لئے بھی اور کانگریس کے لئے بھی زبردست نقصان دہ ہوگا۔ بابر مسجد کے انہدام کے بعد مسلمان کانگریس سے بہت دور چلے گئے تھے، بڑی مشکل سے ان کا اعتماد بحال ہوا اور 15 ویں لوک سبھا ایکشن میں مسلمانوں نے کانگریس کا بھرپور ساتھ دیا۔ کانگریس حکومت نے اب بھی مسجد انہدام کے ملزموں کو سزا نہیں دلائی اور ان دہشت گرد پارٹیوں پر پابندی عائد نہیں کی جنہوں نے منصوبہ بند طریقے سے مسجد شہید کی اور مذہب کا ناجائز سیاسی فائدہ اٹھایا تو یہ مسلمانوں کے لئے بابر مسجد کی شہادت سے کم صدمہ کی بات نہیں ہوگی۔

جسٹس لبراہن نے فوتیدار جیسے سیاستدانوں سے جرح کیوں نہیں کی؟

پنکج دوہرا

لبراہن کمیشن رپورٹ نے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ دراصل دوسرے ذرائع پر اس سے کہیں زیادہ اطلاعات موجود ہیں، اتنا طویل وقفہ اور بے حساب سرمایہ لگانے کے باوجود کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جسٹس لبراہن نے ایسے بہت سے لوگوں سے کوئی جرح نہیں کی جو بہت کچھ جانتے تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے ایک ایسا نتیجہ نکالا جو نہ صرف یہ کہ بے میل اور بے جوڑ ہے بلکہ ایک الگ انداز تحریر میں لکھا گیا ہے۔ دراصل لبراہن نے اپنے مخالفین کی یہ بات سچ ثابت کر دی ہے کہ انہیں فیصلہ لکھنا نہیں آتا۔

سازش کرنے والوں میں اٹل بہاری واجپئی کا بھی نام شامل کیا گیا ہے۔ میں اس سلسلے میں کہوں گا کہ وشو ہندو پریشد کے لیڈر اشوک سنگھل نے اس کی تصدیق کی ہے کہ واجپئی رام جنم مندر تحریک سے وابستہ رہے ہیں تاہم اس کا کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا کہ وہ اس میں براہ راست ملوث رہے ہوں۔ بہر حال اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس تحریک سے سب سے زیادہ فائدہ انہی کو پہنچا، وہ ساڑھے چھ سال تک وزیراعظم کے عہدے پر فائز رہے۔

اشوک سنگھل نے اڈوانی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ یہ کہنا ترک کر دیں کہ چھ دسمبر ان

کی زندگی کا افسوس ترین دن تھا۔

بہر حال اس رپورٹ میں نرسمہا راؤ کو بری کر دیا گیا ہے۔ ایم ایل فوتیدار جیسے لیڈروں سے جرح کے بغیر یہ فیصلہ کیا گیا۔ جنہوں نے اس معاملہ پر حکومت سے اختلاف کرتے ہوئے مرکزی کابینہ سے استعفا دیدیا تھا۔ اور انہوں نے وزیر اعظم کو بار بار وارننگ دی تھی کہ کارسیوک با بری مسجد گرا دیں گے۔

فوتیدار اندرا گاندھی اور بعد میں راجیو گاندھی کے بھی سیاسی مشیر رہے ہیں۔ انہوں نے ۶ دسمبر کو نرسمہا راؤ سے کہا تھا کہ عمارت کی تباہی کے ذمے دار وہی مانے جائیں گے۔ اس سے قبل اس وقت کے صدر ڈاکٹر شکر دیال شرمانے فوتیدار سے کہا تھا کہ یہ تاثر ملتا ہے کہ نرسمہا راؤ نے اس وقت کے ریاستی گورنر ستیہ نرائن ریڈی کو پیشگی قدم کے طور پر صدر راج نافذ کرنے سے روک دیا تھا۔ لبراہن نے ستیہ نرائن ریڈی سے بھی جرح نہیں کی۔

افسر شاہی کے ذرائع بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس وقت کے کابینہ سکریٹری ایس راج گوپال کو اس کا اندازہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے، لیکن وزیر اعظم نے ان کی باتوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اشوک سنگھل کا کہنا ہے کہ نرسمہا راؤ ان کے کاز کے تئیں ہمدردانہ جذبہ رکھتے تھے۔ باقی جو کچھ ہے وہ تاریخ ہے اور لوگ جانتے ہیں۔

لبراہن رپورٹ پر حکومت کا تبصرہ بیورو کرٹیک ہے۔ حکومت اپنے اے ٹی آر میں کچھ بہت زیادہ نہیں کر سکے گی۔ عوام میں یہ کمیشن مذاق کا موضوع بن گیا ہے اور لوگ سوال کر رہے ہیں کہ اس گھٹیار رپورٹ کے بعد انکوائری کمیشنوں پر کون بھروسہ کرے گا۔

کیا اب لبراہن کمیشن کی جانچ کے لیے بھی کوئی کمیشن قائم ہوگا؟

مانس چکرورتی

لبراہن کمیشن رپورٹ نے نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی زبردست اثرات ڈالے ہیں۔ غیر مصدقہ اطلاعات بتاتی ہیں کہ بوسنیا میں نسل کشی کے سربیائی جنگی مجرموں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کی جانچ ایک ایسے کمیشن سے کرائی جائے جس کے سربراہ جسٹس ایم ایس لبراہن ہوں۔ نسل کش مجرموں کے سربراہ وفد نے مزید کہا ہے کہ جسٹس لبراہن کو اس سلسلے میں خاصا تجربہ ہے۔ بلاشبہ وہ اپنی رپورٹ داخل کرنے کے لیے کم از کم ایک دہائی کا وقت لیں گے، کوئی بات نہیں، ہم انتظار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جبکہ دوسری غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق اس رپورٹ سے پاکستانی اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ انہوں نے جسٹس لبراہن سے ممبئی حملوں کی جانچ کرانے کی بات کہی ہے۔

تاہم ادبی دنیا کے لوگ اس رپورٹ سے بہت زیادہ متاثر نظر نہیں آتے۔ شیکسپیر قسم کے ایک اسکالر کے مطابق میں سمجھتا تھا کہ رپورٹ تحریر کرنے میں اتنی تاخیر اس لیے ہو رہی ہے کہ جسٹس لبراہن اسے شاعری میں اور وہ بھی مسدس میں لکھ رہے ہیں لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ وہ تو نثر میں ہے۔ لیکن بہر حال اسے قطعات میں یا آزاد اشعار میں تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ جبکہ جاسوسی ناولوں کے ایک دیوانے نے کہا کہ اس رپورٹ میں ماسٹر ماسنڈوں کی نقاب کشائی ہونی چاہئے تھی۔

لیکن ایسا کرنے میں رپورٹ نام کا ثابت ہوئی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ لبر اہن رپورٹ میں 68 افراد کے نام بے نقاب کئے گئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ کیا ایک جاسوسی کہانی میں 68 ماسٹر مائنڈوں کو کوئی پسند کرے گا۔ بعض دوسرے لوگوں کا استدلال ہے کہ ایک کمیشن کے ذریعے سترہ برسوں کے بعد رپورٹ پیش کرنے کے بجائے، کمیشنوں کی ایک سیریز ہونی چاہئے تھی۔ جیسا کہ سکھ مخالف فسادات کے تعلق سے ہوا ہے۔ ایک تاریخ داں کا کہنا ہے کہ سکھ مخالف فسادات کی جانچ کے لیے مرواہ کمیشن بنا، پھر مشرا کمیشن، کپور متل کمیٹی، جین بنرجی کمیٹی، پوتی اوشا کمیٹی، جین اگروال کمیٹی، اہوجہ کمیٹی، ڈھلوں کمیٹی، نرولا کمیٹی اور ناناوتی کمیشن۔ یکے بعد دیگرے یہ بالکل ایک سیریل جیسا ہے۔

ایک ٹی وی پروڈیوسر نے اس رائے کا اظہار کیا کہ لبر اہن کمیشن میں بھی کئی سکویئل ہونے چاہئے تھے۔ تاکہ وہ اس کو اس طرح پیچ کرتے، ”لبر اہن، آغاز، ابن لبر اہن اور کمیٹی کی واپسی“

ادھر دوسرے کئی مصنفوں کو رپورٹ پر آٹھ کروڑ روپے خرچ ہونے بہت حسد ہے۔ ایک معروف مصنف کا کہنا ہے کہ یہ رپورٹ 1029 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک صفحہ پر 77,745.38 روپے خرچ ہوئے۔ مجھے تو اپنی تصنف پر اتنا معاوضہ نہیں مل سکتا۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ خرچ ہونے والی یہ رقم واپس طلب کرے۔ وہ اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جسٹس لبر اہن نے 17 برسوں میں 1029 صفحات قلمبند کئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہفتے میں ایک صفحہ سے کچھ زیادہ۔ وہ پھر سوال کرتے ہیں کہ کیا آئندہ بھی وہ کسی کمیشن کے سربراہ مقرر کئے جاسکیں گے۔

دریں اثناء دہلی کے ایک پرائمری اسکول میں ایک بچے نے اپنے ٹیچر سے کہا

کہ اسے اپنا ہوم ورک کرنے میں کم از کم چھ ماہ کا وقت چاہئے۔ اس نے اس سلسلے میں لبراہن رپورٹ کی مثال پیش کی۔ جب اس کے ٹیچر نے اعتراض کیا تو اس نے دھمکی دی کہ وہ ایسا کر کے توہین عدالت کر رہے ہیں۔

تاہم بعض افراد جسٹس لبراہن کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں ایسے خیالات نہیں رکھتے۔ ایک سیاستداں کے مطابق اس نے سکھ مخالف فسادات پر بغاوت کی۔ بابری مسجد انہدام سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ فرقہ وارانہ فسادات اور بم دھماکوں سے اسے دکھ پہنچا ہے۔ گجرات فسادات سے وہ برگشتہ ہوا ہے اور بلاشبہ مستقبل میں بھی اگر ایسا کچھ ہوگا تو اسے بہت تکلیف پہنچے گی۔ ادھر ذرائع بتاتے ہیں کہ حکومت ایک ایسا کمیشن قائم کرنے پر غور کر رہی ہے جو اس کی جانچ کرے گا کہ لبراہن کمیشن نے اتنا وقت کیوں لیا اور وہ چھ ماہ میں اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ کمیشنوں کی کارکردگی پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جب جسٹس لبراہن تین ماہ کی ڈیڈ لائن میں توسیع کروا کر سترہ سال لگا سکتے ہیں، تو پھر یہ کمیشن اپنی رپورٹ پیش کرنے میں تیس چالیس سال ضرور لے گا۔



انکوائری کمیشنوں اور ان کی کچھ رپورٹوں کا

ایک مختصر جائزہ

سہیل انجم

پارلیمنٹ نے 1952ء میں کمیشن آف انکوائری ایکٹ کے نام سے ایک قانون منظور کیا جس کے تحت تحقیقات کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اس میں دوبارہ ترمیم کی گئیں۔ ایک بار 1971ء میں تاکہ اس کے نفاذ کی مشکلات کو دور کیا جاسکے اور دوسری بار 1990ء میں تاکہ رپورٹ کے ساتھ اس پر کی گئی کارروائی رپورٹ بھی ایوان میں پیش کی جاسکے۔ دوسری ترمیم کے بعد کارروائی رپورٹ پیش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

ملکی یا عوامی مفاد کے اہم ترین معاملات میں مثلاً سیلاب یا دیگر آسمانی آفات، کسی مہلک وبا اور صحت عامہ سے متعلق مسائل وزیروں اور حکومت کی اعلیٰ سطح پر کرپشن کی شکایات اور فرقہ وارانہ فسادات کی تفتیش و تحقیق کے لئے مرکزی حکومت لوک سبھا کی تجویز پر یا از خود اسی طرح کوئی ریاستی حکومت اسمبلی کی تجویز کے مطابق یا از خود کمیشن آف انکوائری مقرر کر سکتی ہے۔ یہ کمیشن ایک یا ایک سے زائد نفوس پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

اس کمیشن کی کارکردگی کی میعاد (جو بعد میں ضرورتاً بڑھائی جاسکتی ہے) اور جس عوامی مسئلہ کی تحقیقات اس کے ذمہ ہوگی وہ تمام تفصیلات سرکاری گزٹ میں شائع کی جائیں گی۔ ماضی میں بعض معاملات میں حکومت کو کمیشن رپورٹ پیش کی

گئی مگر متعلقہ حکومتوں نے اسے منظر عام پر لایا ہی نہیں۔ اس لئے لاکمیشن نے اس قانون کے Sec-3 میں ایک ضمنی شق بڑھادی جس کے مطابق کمیشن کی رپورٹ موصول ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں رپورٹ پر کی گئی کارروائی کی رپورٹ کے ساتھ پوری رپورٹ اسمبلی میں پیش کر دینا حکومت کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔

مذکورہ قانون کے Sec-4 میں اس کے اختیارات درج ہیں وہ کسی بھی ہندوستانی شہری کو حلف نامہ یا شہادت دینے کے لئے حکم جاری کر سکتا ہے۔ کسی بھی سرکاری ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے یا کسی بھی سرکاری افسر کے ذریعہ چھان بین کا کام لے سکتا ہے۔ گویا اس کا طرز عمل کسی سول کورٹ کے مطابق ہوگا۔

اس قانون کا Sec-6 بہت اہم ہے جس میں درج ہے کہ کمیشن کے سامنے جو افراد بیان دیں گے ان بیانات کو ملک کی کسی بھی فوجداری یا دیوانی عدالت میں ان کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکے گا۔ البتہ جھوٹی گواہی دینے کے معاملہ میں اس بیان کی بنیاد پر اس کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے۔

Sec-۷ کے مطابق اگر حکومت کمیشن کے تقرر کے بعد یہ محسوس کرے کہ کمیشن کو برقرار رکھنا ضروری نہیں تو اسے ختم کرنا یا موقوف کر دینے کی مجاز و مختار ہے مگر تقرری کی تجویز کے تحت ہو تو اسے موقوف یا ختم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔

Sec-8-b کے مطابق کمیشن میں دی گئی گواہیوں کے پیش نظر کسی شخصیت کی نیک نامی پر حرف آنے کا احتمال ہو تو کمیشن کو اس شخص کو اپنی صفائی میں دلائل و بیان صفائی پیش کرنے کا موقع دینا چاہئے۔

کمیشن کی تحقیقات کے دوران مطلوبہ افراد کمیشن کی اجازت سے کسی وکیل کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ یا ان کے خلاف بیان دینے والے کو Cross

Examin کر سکتے ہیں۔

مذکورہ قانون کے Sec. 10 A کے مطابق کوئی شخص تحریر و تقریر کے ذریعے کمیشن کو یا کمیشن میں شامل کسی فرد کو بدنام کرے تو اس اہانت کے جرم پر اسے چھ ماہ تک قید سادہ کی سزا دی جاسکتی ہے۔ یا اس سزا کے ساتھ جرمانہ بھی عائد کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ قانون میں صرف بارہ دفعات شامل ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کمیشن کو کسی مسئلہ میں صرف تفتیش کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور کمیشن کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ ان معاملات میں حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرے۔ ان سفارشات پر حکومت کے ذریعے تعمیل کرانے کا کوئی اختیار اس کے پاس نہیں۔ یہ حکومت کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ سفارشات پر عمل کرے یا نہ کرے۔

فسادات کی تحقیقات کرنے والے کمیشنوں کی افادیت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، لیکن ان کی رپورٹوں اور سفارشات کے تئیں مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ان پر عوام کے خون پسینے کی جو کمائی صرف کی جاتی ہے وہ عملاً ضائع ہو جاتی ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ حکومتیں ان کمیشنوں کی رپورٹوں اور سفارشات کے تئیں سرد مہری کا رویہ نہیں اپناتیں بلکہ انتظامی مشینری اس بات کی بھی پوری پوری کوشش کرتی ہے کہ یہ کمیشن حقائق تک نہ پہنچنے پائیں۔

تحقیقاتی کمیشنوں کی مجبوری ہے کہ انہیں اپنے سامنے پیش کئے جانے والے ثبوتوں کی بنیاد پر ہی نتائج اخذ کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ان کی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ان کے سامنے پیش کی جانے والی شہادتیں اور ثبوت اگر مفروضات پر مبنی ہوں گے تو نتائج کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ ۱۹۶۹ میں احمد آباد اور گجرات کے دیگر مقامات پر ہونے والے فسادات کی تحقیقات کرنے والے جسٹس جگموہن ریڈی

کمیشن نے اسی اندیشے کے تحت اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ ”عدالتی تحقیقات سے کوئی مفید مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ حکام کے خلاف یا ان کے حق میں شہادتیں اور ثبوت پیش کرنے کے معاملے میں کوئی پس و پیش نہ کیا جائے۔ حکام کو چاہئے کہ وہ تحقیقاتی کمیشن کے سامنے جانبدارانہ رویہ اختیار نہ کریں۔“

اکثر و بیشتر فسادات سے متعلق تحقیقاتی کمیشنوں کو جو حقائق اور دستاویزات پیش کی جاتی ہیں وہ اس بات پر قطعاً روشنی نہیں ڈالتیں کہ فسادات کے لئے فضا کس طرح بنی یا بنائی گئی اور اس سے پہلے کہ آگ پوری طرح بھڑک اٹھے انتظامیہ اور پولیس کے ذمہ داروں کی طرف سے کس طرح کے اقدامات کئے گئے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ توڑ مروڑ کر بیان کئے گئے حقائق پر مبنی کمیشنوں کی تحقیقاتی رپورٹوں میں اخذ کردہ نتائج میں سچائی کا عنصر کم ہی ملتا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو کمیشنوں کو اصل حقائق اور واقعات کی ہوا تک لگنے نہیں دیتے۔

غیر معمولی تاخیر

تحقیقاتی کمیشنوں کی افادیت اس بات سے بھی مجروح ہوتی ہے کہ یہ عام طور پر اپنی رپورٹ مرتب کرنے میں کافی وقت لگا دیتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر دیکھنے کو ملتی ہے کہ کمیشن کی رپورٹ پیش ہو جانے کے بعد اس کے قیام کا مطالبہ کرنیوالوں کی طرف سے رپورٹ کا مطالعہ کرنے، اس پر رائے زنی کرنے یا اس پر عمل درآمد کے معاملے میں اس جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا جس جوش و خروش کے ساتھ کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اور جب متعلقہ لوگوں کا جوش سرد پڑتا ہے اور حکومت کے لئے بھی یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ ان رپورٹوں کو سرد خانے میں ڈال دے تو وہ خود بھی ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی کیونکہ اکثر و بیشتر وہ ان کے قیام کا فیصلہ عوامی دباؤ کے تحت اور لوگوں کو دلاسا دینے کے لئے ہی کرتی ہے۔

تحقیقاتی کمیشنوں کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے اس کا اندازہ لبرائیں کمیشن کے علاوہ علی گڑھ کے فسادات سے متعلق جسٹس ششی کانت ورما کمیشن سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ کمیشن 2 اکتوبر 1978ء کو قائم کیا گیا تھا اور 31 جولائی 1980ء کو اسے ختم کر دینے کا اعلان کیا گیا۔ راجیہ سبھا میں اس سے متعلق ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مذکورہ کمیشن کو چار مہینے کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی، لیکن یہ مدت نا کافی ثابت ہوئی پھر اس کی مدت میں بتدریج اضافہ کیا جاتا رہا یہاں تک کہ اپریل 1980ء میں کمیشن نے درخواست کی کہ رپورٹ کو مکمل کرنے کے لئے کم سے کم ڈیڑھ سال کی مزید مہلت دی جائے۔

فسادات کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے کمیشن کو دو سو سے زیادہ گواہوں کی جانچ پڑتال کرنی تھی لیکن آخر تک صرف آٹھ گواہوں کی ہی جانچ پڑتال کی جاسکی تھی، کمیشن کی اس سست رفتار کارکردگی اور ریاستی حکومت کے اس خیال کے پیش نظر کہ تحقیقاتی کمیشن کی برقراری کے نتیجے میں کشیدگی میں مزید اضافہ کا اندیشہ ہے، ریاستی حکومت نے 31 جولائی 1980ء کو کمیشن کو تحلیل کرنے کا حکم جاری کر دیا اور اس طرح ساری محنت اور کمیشن پر خرچ کیا جانے والا سارا سرمایہ ضائع ہو گیا۔ اسی طرح کی ایک اور مثال دیسائی کمیشن کی بھی ہے۔ یہ کمیشن حکومت گجرات نے 1985ء میں احمد آباد کے فسادات کی تحقیقات کے لئے جون 1986ء میں قائم کیا تھا۔ تقریباً ایک سال کی مدت گزر جانے کے بعد کمیشن کی تشکیل کس حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

کوئی کارروائی نہیں: اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کمیشنوں کے تعلق سے جو مدت متعین کی جاتی ہے وہ ہمیشہ ہی نا کافی ہوتی ہے۔ اس طرح متعلقہ حکومتیں پہلے سے ہی یہ گنجائش نکال لیتی ہیں کہ مقررہ مدت کے اندر کام ختم نہ کرنے، بار بار وقت مانگنے کو بہانہ بنا کر انہیں تحلیل کر دیا جائے۔

فسادات کی تحقیقات کرنے والے کمیشنوں کی افادیت اس بات میں ہی مضمر ہے کہ ان کی رپورٹوں کا تجزیہ کیا جائے اور ان کی سفارشات پر عمل کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔ لیکن حکومتیں اکثر انہیں پڑھنے تک کی زحمت گوارہ نہیں کرتیں۔ یہ بات اس بنیاد پر کہی جاسکتی ہے کہ فسادات کے اسباب پر پولیس و انتظامیہ کے رویہ اور سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے رول کے بارے میں تحقیقاتی کمیشنوں نے اکثر و بیشتر ملتی جلتی باتیں کہی ہیں اور ان کی سفارشات میں بھی کافی یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن ان سفارشات کی روشنی میں سرکاری سطح پر کبھی بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

1967 میں رانچی، ہٹیا فسادات کی تحقیقات جسٹس رگھو بردیال کی سربراہی میں ایک تین نفری کمیشن نے کی تھی۔ کمیشن کی رپورٹ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فسادات کی روک تھام کے سلسلہ میں جو غلطیاں اس وقت کی گئی تھیں ان کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ حکومت کی طرف سے مداخلت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اعلیٰ حکام کو فسادات کی روک تھام کے سلسلے میں آزادانہ طور پر کوئی فیصلہ کرنے میں رکاوٹ پیش آئی بلکہ وہ مقامی ذمہ داروں پر ان کی نامناسب اور غیر قانونی کارکردگی پر اعتراض کرنے کے حق سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

1968ء میں پیش کی گئی رگھو بردیال کمیشن کی رپورٹ میں کہی جانے والی اکثر باتیں 1968ء میں احمد آباد کے فسادات کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کی رپورٹ سے مماثلت رکھتی ہیں۔ احمد آباد اور گجرات کے دوسرے قصبوں میں 1965ء کے فسادات کی تحقیقات کے لئے قائم کئے جانے والے جگموہن ریڈی کمیشن نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ فسادات کے ابتدائی مراحل میں پولیس نے کوتاہی کا مظاہرہ کیا حالانکہ فسادات کے شروع میں اگر پولیس نے سرگرمی دکھائی ہوتی تو فسادات پر کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی اس کوتاہی کے سبب فسادات سے

نمٹنے میں ناکام ہو گئی۔ اس فساد میں زبردست اتلاف جان ہوا تھا۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس فساد میں 524 جانیں ضائع ہوئی تھیں۔

کمیشن نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ سرکار کو پیش کی جس میں صاف طور سے بتایا گیا کہ یہ مسلم کش فساد تھا۔ کیونکہ 6072 مکانات اور دکانیں جلائی گئیں۔ اس میں 2706 دکانیں اور مکانات مسلمانوں کے تھے۔ صرف مکانات ہندوؤں کے جلائے گئے۔ اس تباہی میں ۴ کروڑ 23 ہزار 671 دکانیں روپے کی املاک تباہ کی گئیں اور ہندوؤں کا صرف 75 لاکھ 85 ہزار 545 روپے کا نقصان ہوا۔ اس فساد میں کل 1512 افراد مارے گئے جن میں 430 مسلمان تھے اور صرف 24 ہندو۔ جب کہ 158 افراد کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔

احمد آباد کے فساد کی چنگاری ابھی دبی بھی نہیں تھی کہ ۱۹۷۰ میں بھونڈی میں بدترین فساد پھوٹ پڑا۔ بھونڈی میں 80 فیصد مسلم آبادی میں زیادہ تر پاورلوم مزدور ہیں۔ بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے، اس کی تحقیقات کے لئے جسٹس ڈی پی مدان کمیشن کی تقرری ہوئی، کمیشن نے تین سال تک تحقیقات کی اور سرکار کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے تحت فساد میں کل 78 افراد مارے گئے۔ اس میں 59 مسلمان اور 17 ہندو تھے۔ بقیہ دو کی شناخت نہیں ہو سکی۔ رپورٹ میں 6 مسلم عورتوں کی آبروریزی کا بھی تذکرہ تھا۔ لیکن سرکار نے کسی کو سزا نہیں دی اور رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا۔

بھونڈی میں 1984 میں دوبارہ فساد ہوا۔ لیکن چند منٹوں میں ہی شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ اس لئے تباہی کم ہوئی اور اس مرتبہ پولیس نے مستعدی دکھاتے ہوئے 611 معاملات درج کئے تھے۔ 185 معاملات عدالت میں زیر سماعت ہوئے۔ جس میں سے ۱۱۳ افراد بری کر دیئے گئے۔ ۱۴ افراد پر ڈیڑھ سال تک مقدمہ چلا اور جنوری 86 میں انہیں سزا دی گئی۔ بھونڈی کے 70 کے فساد کی

جانچ کرنے والے ڈی پی مڈان کمیشن نے اپنی رپورٹ میں پولیس کی جانبداری کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ کمیشن کے مطابق بھیونڈی کے بعد جلگاؤں میں بھی فساد کا اندیشہ تھا لیکن پولیس نے احتیاطی قدم نہیں اٹھایا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کوئی کارروائی نہ کرنے کا اصل سبب بعض افسران کا فرقہ وارانہ جھکاؤ تھا۔

1971ء میں مراد آباد میں فساد ہوا۔ لیکن اسے قابو میں کر لیا گیا پھر 19 اگست 1980 کو عید الفطر کے روز عید گاہ پر فائرنگ کے بعد بھیاٹک قسم کا فساد پھوٹ پڑا تھا۔ برتنوں کے اس شہر میں جس کی معیشت پر مسلمانوں کا کنٹرول تھا تباہ کر دیا گیا۔ اس فساد میں 166 افراد مارے گئے جس میں 142 افراد مسلمان اور باقی ہندو تھے۔ اس فساد کی تحقیقات کے لئے سرکار نے جسٹس سکینہ کمیشن کی تقرری کی۔ تین سال تک کی تحقیقات کے بعد جب سرکار کو کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی تو اس کی سفارشات میں پولیس کے ساتھ ساتھ چند ہندو رضا کار تنظیموں کی بھی نشاندہی کی گئی لیکن سرکار نے اس رپورٹ کو بھی سرد خانے میں ڈال دیا۔

1979ء میں جمشید پور کے فسادات کی تحقیقات کرنے والے جسٹس جتیندر نرائن کی سربراہی میں قائم تین نفری کمیشن نے بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے اور فسادات کو کنٹرول کرنے کے لئے مناسب اقدامات نہ کرنے کی ذمہ داری انتظامیہ اور پولیس پر عائد کی۔ کیندر یہ اکھاڑ اسمیتی نامی ایک تنظیم کی طرف سے ایک کتابچہ شائع کیا گیا جو انتہائی اشتعال انگیز مواد پر مشتمل تھا۔ اس کتابچہ میں کہا گیا تھا کہ ایک سروے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ رام نومی پوجا کے سلسلے میں نکالے جانے والے جلوس کے موقع پر پولیس کا تمام عملہ اور ہوم گارڈ وغیرہ ان کو تعاون دینے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔ کمیشن نے اس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا کہ اس کتابچہ کی اشاعت سے پیدا ہونے والے خطرے کا اندازہ کرنے میں ضلع انتظامیہ قطعی طور پر ناکام ہو گئی۔ یہاں تک کہ 9 اپریل 1979ء کی میٹنگ میں جس میں

کمشنر نے شرکت کی تھی اور حالات کا جائزہ لیا گیا تھا اس کتابچہ کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ پولیس فائرنگ اور ہلاکتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کمیشن نے کہا کہ بتایا گیا ہے کہ بہار ملٹری پولیس نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ریکارڈ کے مطابق پولیس نے مختصر وقت میں تقریباً دو سو راؤنڈ گولیاں چلائیں۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اس نے مسلمانوں کے مشتعل ہجوم پر گولیاں چلائیں جب کہ فائرنگ میں ہلاک ہونے والے دو مسلمانوں میں سے ایک کی لاش ایک بیت الخلاء سے برآمد کی گئی تھی۔ کمیشن نے بغیر کسی پس و پیش کے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل غور ہے کہ مذکورہ کتابچے میں کئے گئے دعوے کی بہار ملٹری پولیس کے رویہ سے تصدیق ہو جاتی ہے۔

30 اپریل 1981ء کو بہار شریف میں بدترین فساد ہوا جس میں 47 افراد مارے گئے تھے 68 زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک اور زخمی ہونے والوں میں 80 فیصد مسلمان تھے۔ اسی طرح جلگاؤں میں بدترین فساد ہوا۔ 43 افراد مارے گئے اس میں 42 مسلمان تھے اور ایک ہندو، 34 لاکھ 94 ہزار 702 روپے کی املاک تباہ کی گئیں۔ اس میں 33 لاکھ 90 ہزار 977 روپے کی املاک صرف مسلمانوں کی تھی اور ہندوؤں کی ایک لاکھ 3 ہزار 725 روپے کی املاک تباہ ہوئیں۔ اس میں مسلمانوں کی گرفتاری بھی اندھا دھند ہوئی۔ 1982 میں مالیکاؤں میں فساد ہوا۔ جس پر کسی طرح قابو پایا گیا تو جون 1983 میں پھر فساد پھوٹ پڑا۔

1983ء میں ہی بڑودہ میں فساد ہوا تھا۔ 1984ء میں پھر بھیونڈی میں فساد پھوٹ پڑا لیکن اس پر بہت جلد قابو پایا گیا تھا۔ 1985ء میں چندی گڑھ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔

مئی 1987 کے نصف آخر میں میرٹھ اور اس کے نواحی قصبہ ملیانہ میں وحشت و بربریت کا جو برہنہ رقص اسٹیج کیا گیا تھا اس کی بازگشت نہ صرف یہ کہ دور

دور تک سنی گئی تھی بلکہ حکومت نہ چاہتے ہوئے بھی پولیس و پی اے سی اور دیگر سرکاری عملہ کے قابل اعتراض رول کی جانچ کرانے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے یکے بعد دیگرے دو کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں جن کے دائرہ کار میں دوسری چیزوں کے علاوہ 22 اور 23 مئی کو اتر پردیش پولیس اور پی اے سی کے مسلح جوانوں کے ہاتھوں ہاشم پورہ اور ملیانہ کے کچھ بے گناہ لوگوں کو قتل اور ان کی لاشیں ہنڈن ندی اور گنگ نہر میں بہا دینے کے واقعات تحقیقات میں شامل تھے۔ گیان پرکاش کمیٹی نے اپنی رپورٹ 30 اگست 1987ء کو حکومت کو پیش کر دی جس کے بعد جسٹس گروشن لال شری واستو کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی قائم کی گئی اور اس کمیٹی نے بھی اگست 1989ء میں اپنی رپورٹ باضابطہ طور پر حکومت کے حوالے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی تحقیقات کا سلسلہ ختم ہو گیا اور کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ان دونوں کمیٹیوں نے جو سفارشات کی تھیں ان پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟

24 اکتوبر 1989ء کا سیاہ دن بھاگل پور کے مسلمانوں کے لئے عملاً کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس دن رام شلا پوجن کو بہانہ بنا کر پہلے سے تیار شدہ ایک منصوبے کے تحت قتل و غارت کا جو سلسلہ شروع کیا گیا وہ مختلف مرحلوں میں ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ وحشت و بربریت کے اس برہنہ رقص نے شہر بھاگل پور کے علاوہ بہت سے دیہی علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بھاگل پور میں عام پولیس بھی تھی اور بہار ملٹری پولیس کے جوان بھی تھے لیکن یہ لوگ فساد کو روکنے میں قطعی طور پر ناکام رہے اور ان کی اس ناکامی کا سبب غالباً یہی تھا کہ ان کا اپنا رویہ بھی فساد کی آگ کو تیز سے تیز تر کرنے والا ہی رہا تھا۔

بھاگل پور کے انسانیت کش فسادات کی عدالتی تحقیقات کے لئے نومبر 1989ء میں جسٹس آراین پرساد (رام نندن پرساد) کی سربراہی میں ایک رکنی کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مسٹر پرساد کی ساکھ اس اعتبار سے کچھ اچھی نہیں

تھی کہ انہیں آرائیں ایس اور دوسری فرقہ پرست تنظیموں کے لئے نرم گوشہ رکھنے والا جج سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان عام طور پر ان کی قیادت میں ایک نفری کمیشن کی تشکیل سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ تحقیقات کا کام جتنا پیچیدہ ہے اور جتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت کے واقعات ہوئے ہیں اس کے پیش نظر ان کی تحقیقات کے لئے کسی ایک جج پر انحصار کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ یہ کام کسی ایک نفری کمیشن کے بس کا نہیں ہے۔ چنانچہ اقلیتی کمیشن نے حکومت کو مشورہ دیا کہ کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے مناسب ہوگا کہ اسے تین نفری کمیشن میں بدل دیا جائے۔ اس وقت اقلیتی کمیشن کے سامنے جمشید پور کے فرقہ وارانہ فساد کی تحقیقات کرنے والے جسٹس جیتندر رائے کی مثال بھی تھی جو مسٹرز رائے کے علاوہ سول اور پولیس انتظامیہ کے ایک ایک ریٹائرڈ افسر پر مشتمل تھا۔ حکومت نے اقلیتی کمیشن کی درخواست منظور کر لی اور بھاگلپور کمیشن میں دو ممبران کا اضافہ کر دیا گیا جن میں سے ایک مسٹر پڈانکر، ریٹائرڈ آئی جی تھے۔ بعد میں ان میں سے ایک نے نجی وجوہات کی بنا پر استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ مسٹر سلیم احمد ریٹائرڈ ایڈیشنل سکرٹری نے سنبھالی۔ یہ سہ رکنی کمیشن ابھی پوری طرح سے اپنا کام بھی شروع نہیں کر سکا تھا کہ اس کی ہیئت ترکیبی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا اور معاملہ بالآخر سپریم کورٹ تک جا پہنچا۔ سپریم کورٹ نے رولنگ دی کہ کمیشن میں سول اور پولیس افسروں کی جگہ جوڈیشیل افسر بحال کئے جائیں۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد جسٹس رام چندر پر سادسنا اور جسٹس سید شمس الحسن کو کمیشن کا ممبر نامزد کیا گیا اور اس طرح مختلف مراحل سے گزر کر کمیشن نے پورے پانچ سال میں تحقیقات کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ جو رپورٹ حکومت کو پیش کی گئی وہ اس کمیشن کے دو ججوں کی مشترک رپورٹ اور مسٹر آراین پرساد کی ایک لاگ رپورٹ پر مشتمل ہے۔ ادھر گجرات فسادات کی جانچ کے لیے ناناوتی شاہ کمیشن بنایا گیا۔ ابھی تک اس کی جانچ مکمل نہیں ہو سکی ہے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انکوائری کمیشنوں کی رپورٹوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور ان پر کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر خرچ کیا جانے والا عوامی سرمایہ ضائع چلا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف فسادات کی انکوائری کرنے والے کمیشنوں کا یہی حشر ہوتا ہو بلکہ دیگر کمیشنوں کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ مندرہ معاملے کی جانچ کرنے والے جسٹس ایم سی چھاگلہ کمیشن کو چھوڑ کر، جس کی رپورٹ پر اس وقت کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے ٹی ٹی کرشنا چاری سے استعفیٰ طلب کر لیا تھا، باقی کسی کمیشن پر ایسی کارروائی نہیں ہوئی۔

ایمرجنسی کے زمانے میں کی جانے والی زیادتیوں کی جانچ کرنے والے جے سی شاہ کمیشن، پرتاپ سنگھ کیروں کے سلوک کی جانچ کرنے والے ایس آر داس کمیشن، بخشی غلام محمد کے معاملے میں راج گوپال اینگر کمیشن، بہار کے وزراء کے سلسلے میں وینکٹ رما ایئر کمیشن، کیرالا کے وزراء کے بارے میں آنند نرائن ملا کمیشن اور اڑیسہ میں تیندو پتہ اسکیئنڈل کی جانچ کرنے والے جی کے متر کمیشن کا بھی تقریباً یہی حشر ہوا ہے اور ان پر خرچ کیا جانے والا وقت اور پیسہ دونوں برباد ہوا ہے۔



انکوائری کمیشن: اقسام اور صورتحال

رام پنیانی

(معروف قلم کار و سماجی کارکن)

لبر اہن کمیشن رپورٹ کے بحث کی میز پر آنے کے ساتھ ہی ہم نے ایک طرف اہمیت کی حامل عدالتی طور پر مصدقہ سچائی کو دیکھا، جو کچھ ہم نے جانا اس پر قانونی سمجھ کی ایک مہر بھی ثبت ہوئی۔ دوسری طرف اس نے تحقیقاتی کمیشنوں کے دو مفلوج پہلوؤں کی طرف دھیان بھی مرکوز کرایا۔ پہلا یہ کہ لبر اہن کمیشن جسے رپورٹ پیش کرنے کے لئے چھ مہینہ لینا تھا اس نے 17 برسوں کا لمبا عرصہ لے لیا۔ اس نے ایک یا دیگر عذر کے سہارے کئی بار توسیعی مدت حاصل کی۔ اس نے تاخیر کے لئے اپنے قانونی مشیر کارانو پم گپتا اور سیاسی لیڈروں کے عدم تعاون کا ڈھنڈورا پیٹا۔ یقینی طور پر جو وقت لبر اہن نے لیا اسکو جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا یا کسی بھی صورت میں وہ معافی کے لائق نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جج نے ملک کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ دوسرا یہ کہ بے داغ مشاہدات کے باوجود یہ کمیشن مناسب اور موزوں سفارشات کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے انہدام کے 68 بڑے قصورواروں کا نام لیا لیکن سزا کے تعلق سے اس نے کوئی سفارش نہیں کی۔ اس سے بالاتر وزارت داخلہ کی کارروائی رپورٹ (ATR) اور بھی مایوس کن ہے کیوں کہ یہ کمیشن کے مشاہدات پر کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔

اس کمیشن نے قومی خزانے سے کروڑوں روپے خرچ کئے لیکن ملک کی پالیسی

کے تعلق سے اس نے ملک کے طرز حکومت پر کوئی سنجیدہ بات پیش نہیں کی۔ لہذا یہ سوال اٹھتا ہے کہ تو پھر اس طرح کے کمیشنوں کا مطلب کیا ہے۔ یہ سوال اس وقت اور اہم ہو جاتا ہے جب دور حاضر کے کچھ دیگر بڑے کمیشنوں / رپورٹوں کو دیکھتے ہیں کہ یا تو کارروائی تکلیف دہ حد تک سست روی کا شکار ہے اور یا تو ناپید ہے۔ گوپال سنگھ کمیشن، رنگنا تھ مشرا کمیشن، سچر کمیٹی و دیگر نے ان سنجیدہ مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی جو ملک کو کھوکھلا بنا رہے ہیں۔ گوپال سنگھ کمیشن کی رپورٹ تو ٹھنڈے بستے میں پڑی ہوئی ہے اور سچر کمیٹی پر وزیراعظم کا پندرہ نکاتی پروگرام اب بھی اقدام کا محتاج ہے۔ لہذا اس سوال کا اٹھنا فطری بات ہے کہ تحقیقاتی کمیشن آخر کیوں؟

ہم مختلف معاملوں پر کمیشنوں کی ایک پوری سیریز دیکھ چکے ہیں۔ ان کمیشنوں اور کمیٹیوں کو چار خانوں میں رکھا جاسکتا ہے۔ پہلے وہ جنہیں ملک کی اہم شخصیات کے قتل کے بعد قائم کیا گیا۔ آزادی کے فوراً بعد بابائے قوم مہاتما گاندھی کا پونے میں ہندو مہاسبھا کے سکریٹری اور اگر نی عرف ہندو راشٹرنامی اخبار کے ایڈیٹر ناتھورام گوڈ سے کے ذریعہ قتل۔ جس کے بعد جے ایل کپور کمیشن کا قیام، جس نے حقیقی قصور وار کے طور پر گوڈ سے کا نام لیا۔ ہندو تو کا نظریہ پیش کرنے والے ساورکر کا نام بھی ملزمین میں شامل تھا لیکن باوثوق شہادت نہ ہونے کے سبب انہیں چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح سے اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے قتل کی تحقیق کے لئے قائم کمیشنوں کی جانچ پر بھی عملدرآمد میں کافی وقت لگا۔

دوسری قسم کے وہ کمیشن ہیں جو عام طور پر دلتوں کے مسائل کو لے کر قائم کئے گئے۔ کالیکٹر کمیشن اور منڈل کمیشن ان میں سے کافی اہم ہیں۔ 1955 میں کالیکٹر کمیشن نے دلت کمیونٹی کی ضروریات کی ایک حد قائم کر دی۔ لیکن اس کے تحت کی گئی کارروائی غیر معیاری اور غیر موثر رہی۔ منڈل کمیشن کا قیام جتنا حکومت کے ذریعہ

1977 میں کیا گیا تھا۔ 1990 تک یہ ٹھنڈے بستے میں پڑا رہا۔ وی پی سنگھ نے کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد کیا جس سے ہندوستان کے سیاسی بساط پر ہلچل مچ گئی۔ ان تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹ دلتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے تعلق سے مثبت رہی۔

تیسرے طرح کے کمیشن وہ ہیں جنہیں اقلیتوں کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات کی تحقیق کے لئے قائم کیا گیا۔ ان میں سے کچھ اہم ہیں، جگموہن ریڈی کمیشن (1969 احمد آباد)، جسٹس مدان کمیشن (بھیونڈی، مالیگاؤں 1970)، جسٹس جوزف وٹھیا تھیل کمیشن (تلی چیری 1971)، جمشید پور رپورٹ 1979، وینو گوپال کمیشن (کنیا کماری 1982)، ناناوتی کمیشن (1984 سکھ مخالف فساد)، جسٹس شری کرشنا کمیشن (ممبئی 93-1992 فسادات) بنرجی کمیشن (گودھرا ٹرین آتش زنی 2002)، ودھوا کمیشن (پیٹرا سٹینس قتل 1999)۔ گجرات فسادات کے تعلق سے قائم ناناوتی شاہ کمیشن نے ابھی تک اپنی رپورٹ پیش نہیں کی ہے۔ ان رپورٹوں میں جو چیز قدر مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کمیشن کچھ کو چھوڑ کر سبھی قصورواروں کی شناخت کرنے، انتظامیہ کی کوتاہی، سیاسی قیادت کی ناکامی اور سکھ مخالف فساد کو چھوڑ کر تقریباً سبھی میں ہندو نواز تنظیموں کے کردار کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کمیشنوں کے تعلق سے ایک قدر مشترک چیز یہ بھی رہی کہ اکثر کمیشنوں کی سفارشات پر کارروائی نہیں کی گئی اور قصورواروں کو سزا نہیں ملی۔

چوتھے قسم کے کمیشن وہ ہیں جنہیں مسلمانوں کی صورتحال کی تحقیق کے لئے قائم کیا گیا۔ دلت کمیشنوں کی طرح ان کمیشنوں نے بھی مسلمانوں کے اقتصادی و سماجی مسائل کو پیش کیا۔ ان رپورٹوں میں مسلم اقلیتوں کو حاشیہ پر لائے جانے اور ان کا استحصال کئے جانے کو بھی پیش کیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ دلتوں سے متعلق رپورٹوں پر عملدرآمد میں کافی وقت لگا لیکن جہاں تک مسلمانوں کی بات ہے اسے نافذ کرنا تو

دور حکومت بحث کرانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھ رہی ہے۔

ہمیں یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہئے کہ سماج کی سنگین تباہ کاریوں کی جانچ کے لئے شہریوں نے بھی اقدامات کئے ہیں۔ سٹیزنس فار جسٹس اینڈ پیس (گجرات فساد)، انڈیا پیپلز ٹریبونل (اڑیسہ میں عیسائیوں کے خلاف جرائم کی تحقیق اور ملک میں فرقہ پرستی کے اثرات کی تحقیق)، انہد (دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کے خلاف پولیس مظالم پر ٹریبونل) نے بھی ملک کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ سرکاری کمیشنوں کے ذریعہ تحقیق میں جو بڑی رکاوٹیں آتی ہیں ان میں زیادہ تر قانونی کارروائیوں کے سبب اور کبھی کبھار ججوں کا طرز عمل بھی روکاؤٹ کا سبب ہوتا ہے جیسا کہ لبر اہن کمیشن کے معاملہ میں دیکھنے کو ملا۔

لہذا کلی طور پر ہم ادارے اور ان کمیشنوں کے کام کی اہمیت کا اندازہ کس طرح کریں؟ پہلی چیز تو یہ کہ وسیع پیمانے پر ان کمیشنوں نے مختلف معاملات، لیڈروں کے قتل، قتل عام کے پیچھے کارفرما طاقتوں، کمیونٹی کی سماجی حیثیت کے تعلق سے سچائی کو اجاگر کیا۔ دوسری چیز ان کمیشنوں کی قانونی تصدیق نے تحریکوں کو اور حقوق انسانی کے لئے کام کرنے والے گروپوں اور متاثرین کے مطالبات کو قوت اور معتبریت بخشی۔

بہت سے کمیشنوں نے جانبدارانہ نتائج بھی اخذ کئے، جیسے کہ ودھوا کمیشن۔ ان میں سے زیادہ تر نے کافی شواہد ہونے کے باوجود قصور واروں کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ اکثر قصور واروں کے خلاف مناسب سزائیں تجویز کرنے میں ناکام رہے۔ سماجی صورتحال سے متعلق کمیشنوں نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا لیکن ان کے نفاذ کا دار و مدار سیاسی قیادت کی قوت ارادی پر ہوتا ہے۔

کمیشن کے تعلق سے متوازن تصور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سماجی پالیسیوں اور انصاف کے لئے مثبت تعاون پیش کرتے ہیں لیکن بالخصوص سیاسی قیادت نے سفارشات کے نفاذ میں موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متعلق کمیونٹی کو انصاف

سے دور رکھا۔ ججوں کا انتخاب بھی سیاست سے متاثر رہا۔ لہذا تحقیقاتی کمیشن ایکٹ میں کچھ چیزوں کو شامل کیا جانا چاہئے۔ پہلی چیز جس پر دھیان دینے کی ضرورت ہے، کمیشنوں کے کام کی نوعیت کے مطابق ان کی مدت طے ہو۔ ججوں کے ذہن میں یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ وقت مقررہ پر کام مکمل ہونا چاہئے۔ کمیشنوں کی قیادت ریٹائرڈ ججوں کے بجائے سٹنگ ججوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے۔ لبرالہن کمیشن جیسے معاملہ میں کچھ برسوں میں سربراہی کسی اور کو سونپ دینی چاہئے۔

تحقیقاتی کمیشن میں سب سے بڑی مشکل سیاسی اور نوکر شاہانہ قیادت ہے۔ اس سلسلے میں حقوق انسانی گروپوں اور سماجی تحریکوں کو حکومت کے قوت ارادی کی کمی اور سستی کے خلاف مستقل مہم چلانی چاہئے۔ کمیشن کے قیام کے وقت حکومت کو یہ عہد کرنا چاہئے کہ وہ قصور واروں کے خلاف سنجیدہ کارروائی کرے گی یا متاثرہ کمیونٹی کی بہتری کے لئے سفارشات پر عملدرآمد کرے گی۔ رپورٹ پر عملدرآمد کے تعلق سے حقوق انسانی کے گروپوں اور متعلق کمیونٹی کو اعتماد میں لینا چاہئے۔ جب وزارت کارروائی رپورٹ تیار کر لے تو اسے رائٹس گروپوں اور کمیونٹی کے لیڈروں سے لازماً گفتگو کرنی چاہئے اور ان کا تاثر حاصل کرنا چاہئے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمارے جمہوری معاشرے کی اس اہم چیز کو کافی سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے جیسا کہ موجودہ حکومت لے رہی ہے۔ مسئلہ کمیشن کے قیام کی بات کا نہیں ہے، مسئلہ ان کے انجام دہی کے طریقے اور نفاذ کا ہے اور ہمیں اس سلسلے میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔

انکوائری کمیشن سچائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں

پنج چتر ویدی

آزاد ہندوستان میں سب سے گھناؤنے جرائم میں سے ایک تھا اجودھیا میں تاریخی بابری مسجد کا انہدام لیکن اس واقعہ کی جانچ کے لیے قائم لبر اہن کمیشن سیاسی ڈرامے کا ایک اسٹیج بن گیا۔ ایک طرف سی بی آئی عدالت میں فرد جرم داخل کر چکی ہے۔ اس پر 30 کروڑ روپے سے زیادہ کا خرچہ ہو چکا ہے۔ ادھر لبر اہن رپورٹ لیک ہو جاتی ہے اور آنا فانا میں حکومت اسے پارلیمنٹ میں پیش کر دیتی ہے۔ لیکن ہنگامے کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔

چند سال قبل دفاعی سودوں میں بدعنوانی کا انکشاف تہلکہ کے کیمروں نے کیا تھا۔ اس سلسلے میں حقائق کا پتہ لگانے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس بارے میں تنازعات پیدا ہوئے، ترون تیج پال پر چو طرفہ حملے کئے گئے۔ جانچ کرنے والے جج فوراً تنازع میں گھر گئے۔ بہر حال بی جے پی حکومت چلی گئی اور یہ ڈرامہ ابھی تک جاری ہے۔ کب تک جاری رہے گا کچھ پتہ نہیں۔

بدعنوانی ہو یا فسادات۔ یا پھر لا پرواہی کے الزامات۔ ان میں جب اقتدار کی اعلیٰ کرسیوں پر فائز سیاستداں پھنستے ہیں تو سچائی پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک عدد جانچ کمیشن قائم کر دیا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ جانچ چل ہی رہی ہوتی ہے اور دوسری جانچ ایجنسیاں متوازی طور پر عدالتوں میں اپنی جانچ رپورٹ پیش کر کے مبینہ ملزموں کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دیتی ہیں۔ متعدد بار ایسا

بھی ہوا کہ عدالتی فیصلے آگئے اور جانچ کا کام ادھورا ہی رہا۔ بعد میں کمیشنوں کی سفارشات کو نظر انداز کرنا تو جیسے ایک عام دستور ہی بن گیا ہے۔ اس تسلسل میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد بھڑکے سکھ کش فسادات اور کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں سرکاری اور عدالتی کارروائی کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ادھر لوگ یہ فراموش کر گئے کہ رنگ ناتھ مشرا کمیشن بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کمیشن کے تعاون کے لیے چار کمیٹیاں بنائی گئی تھیں جن میں سے ایک جین بنرجی کمیشن کے جواز پر تو ہائی کورٹ نے ہی سوال کھڑا کر دیا تھا۔ کپور متل کمیٹی نے 72 پولیس والوں کے خلاف فسادات میں ملوث ہونے پر کارروائی کی سفارش کی تھی۔ باقی دو کمیٹیوں نے کیا کیا۔ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ملتا۔ البتہ کمیشن پر ایک کروڑ روپے ضرور خرچ ہوئے۔

یہ معاملہ یہیں نہیں رکتا۔ مرکز میں بی جے پی حکومت کی حلیف اکالی دل کو مطمئن کرنے کے لیے ناناوتی کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ 24 سال بیت گئے ہیں ایک نسل گزر چکی ہے اور سیاست کے بھنور میں پھنسی سچائی باہر آنے کے لیے آج بھی تڑپ رہی ہے۔

خیال رہے کہ آزادی کے بعد ہی یعنی 1952ء میں جانچ کمیشن آرڈیننس کو پارلیمنٹ نے اتفاق رائے سے منظور کیا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت ہی جانچ کمیشن قائم کئے جاتے ہیں۔ انہی دنوں میں ہری داس موندڑا پر 160 کروڑ روپے کے گھپلے کا الزام سامنے آیا تھا۔ اس کی جانچ کے لیے 1957 میں ایم سی چھاگلہ کی سربراہی میں ایک تین رکنی کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کی رپورٹ کی بنیاد پر موندڑا کے خلاف پونے دو سو مقدمات قائم کئے گئے اور اس وقت کے وزیر خزانہ کرشنا چاری کو عہدے سے برطرف کیا گیا۔

اس بات کا اظہار بہت ضروری نہیں ہے کہ اخلاقیات، ایثار و قربانی اور خدمت

جیسے الفاظ ہندوستانی سیاست میں اپنی اہمیت و معنویت کھوتے جا رہے ہیں۔ پہلے سیاست میں جرائم کی آمیزش پر لوگوں کو تشویش ہوا کرتی تھی۔ اب اس پر کسی کو شرم بھی نہیں آتی۔ ایسے حالات میں انکوائری کمیشن عوام کی آنکھوں پر گمراہی کا جال پھیلانے میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اب اندرا گاندھی کے قتل کے واقعہ ہی کو لے لیں، اس میں ایک ملزم کو پھانسی ہو گئی۔ لیکن وزیراعظم کے قتل کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے قائم کمیشن کی رپورٹ دبا دی گئی۔ جانچ کمیشن نے کانگریس لیڈر آر، کے، دھون ایک سابق وزیراعظم اور سی آئی اے پر شبہات کی انگلی اٹھائی تھی۔ کچھ دنوں تک ہنگامہ ہوا اور مبینہ داغدار لوگ پھر اپنی پوزیشنوں میں لوٹ آئے۔ راجیو گاندھی کے قتل کے معاملہ میں عدالتی فیصلہ آچکا ہے۔ ورنہ کمیشن اپنی رپورٹ دے چکا ہے۔ لیکن جین کمیشن کی کارروائی جاری ہے۔ کب تک جاری رہے گی کچھ پتہ نہیں۔

جانچ کمیشنوں کی آڑ میں عوامی غم و غصے کو دبانے کا کام مرکزی حکومت ہی نہیں کرتی، ریاستی حکومتوں کا بھی یہ ایک مقبول طریقہ کار رہا ہے۔ گجرات فسادات کی جانچ ناناوتی شاہ کمیشن کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ تیز رفتار عدالتوں سے مجرموں کے بری ہونے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ دعا دیتے سپریم کورٹ کو، جس کی مداخلت کے سبب کچھ بڑے سیاستدانوں کا رول جانچ کے دائرے میں آیا۔ ورنہ یہی لگنے لگا تھا کہ گجرات میں تین ہزار مسلمان کسی فساد میں نہیں مارے گئے بلکہ وہ خود ہی جل کر مر گئے تھے۔

تمل ناڈو میں بے لٹا اور کرونا ندھی کی آپسی چشمک میں آئے دن کمیشن قائم ہوتے رہتے ہیں۔ کیرالا میں ہاتھی کی موت سے لیکر یاگل کتے کے کاٹنے تک پر جانچ کمیشن کے قیام کا ریکارڈ ہے۔ آندھرا پردیش میں کبھی صحافی پیٹے گئے تو کبھی

وکیل اور کبھی فوج کے ہاتھوں پولیس والے بھی۔ اور بھی ایسے کمیشن قائم کر دیئے گئے۔ اتر پردیش اور بہار میں تو اب ایسے کمیشنوں کو عوام بھی سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ مہاراشٹر میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ جانچ کمیشن نے جن کو مجرم گردانا سیاستدانوں نے ان کی عزت افزائی کی۔ (سری کرشنا کمیشن رپورٹ کی روشنی میں صورتحال کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔) 1988 میں ممبئی کے جے جے اسپتال میں زہریلی گلبریں کی وجہ سے 14 مریضوں کی موت ہوئی تھی۔ اس کی جانچ کے لیے ایک کمیشن بنایا گیا تھا۔ کمیشن نے دواؤں کی خرید میں کئی افسروں اور وزرا کو رشوت لینے کا ملزم قرار دیا تھا۔ اس کی رپورٹ کی روشنی میں ایک وزیر بلرام ہرنے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ بہار میں تو ایسے مشتبہ لوگوں کو اعزاز دینے میں بھی کسی کو کوئی قباحہ نہیں ہوتی۔

جانچ کمیشنوں کی یہ درگت عام جنتا کے پیسے کا غلط استعمال تو ہے ہی، جمہوریت کے طاقتور کہے جانے والے ستون عدلیہ کی توہین بھی ہے۔ اس سے عوام کے دلوں میں جمہوری نظام کے تئیں شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔ کیا بدلتے وقت میں جانچ کمیشنوں کی اہمیت و معنویت کو جانچنے کے لیے بھی کسی کمیشن کا قیام ہوگا۔ بہر حال جانچ کمیشنوں کے قیام کی افادیت اور غیر افادیت پر غور کرنے کا یہی مناسب وقت ہے۔



کمیشن رپورٹ کو مسٹر دکر نے کا اختیار حکومت کو نہ دیا جائے

یوسف حاتم مچھالہ
(سینئر ایڈوکیٹ)

تحقیقاتی کمیشنوں کا قیام ہمیشہ سچائی اور حقیقت کی تلاش کے لئے ہوا کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عوام کے مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے خیر کے پہلو کو تلاش کرنے کے لئے اسے رو بہ عمل لایا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی واقعہ یا حادثہ کے نتیجہ میں جب عوام الناس میں شکوک و شبہات پھیل جاتے ہیں تو ان کا ازالہ لازمی قرار پاتا ہے اور کمیشن کی ضرورت آن پڑتی ہے۔ چونکہ انکوائری کمیشن ایک ادارہ ہوتا ہے اور اس کا قیام کمیشن آف انکوائری ایکٹ کے تحت کیا جاتا ہے لہذا اسے ووٹ بینک کی سیاست سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔

البتہ یہ دوسرا معاملہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں یا اسی طرح کے دوسرے ادارے ان چیزوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم سری کرشنا کمیشن کی روشنی میں ہی اس کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ بعض پارٹیوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن یہاں پر یہ بات بھی واضح رہے کہ سیاسی پارٹیاں نہ تو اس کی توثیق کر سکتی ہیں اور نہ ہی تردید۔ Recommend یا Reject کا اختیار سیاسی پارٹیوں کو حاصل نہیں ہے۔

کمیشن قانون و ضابطہ کو بنائے رکھنے کا کام انجام دیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ صرف ہدایات دیتے ہیں یا پھر کسی معاملے کی بہتری اور خرابی پر نقد و تبصرہ

کرتے ہیں اور یہیں پر آ کر ان کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ دراصل بہت سارے معاملات اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ان پر کارروائی کے لئے پولیس و انتظامیہ کا سہارا لیا جائے جبکہ بعض گتھیوں کو سلجھانے کے لئے مختلف ایجنسیوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب کمیشن آف انکوائری کے ساتھ پولیس و انتظامیہ کا تال میل نہیں بیٹھتا تو پھر مسائل پیدا ہوتے ہیں حالانکہ قانون میں اس بات کی بھرپور گنجائش ہونی چاہئے کہ اگر کوئی چاہے تو حکومتی مشینری کا استعمال کر کے آزادانہ طور پر اپنی تفتیش انجام دے سکے۔

عرف عام میں یہ بات رائج ہے کہ کمیشن آف انکوائری آزاد ہوتا ہے۔ عموماً عوام کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو ان چیزوں کی ذمہ داری دی جائے جن کا راست طور پر عدالت سے تعلق رہا ہو۔ لہذا جب ایک آزاد کمیشن کا قیام عمل میں آتا ہے تو ان لوگوں کو فوقیت دی جاتی ہے جو عدالتی نظام سے جڑے ہوئے ہوں لیکن اسی کے ساتھ ریاستی سطح پر ہائی کورٹ اور مرکزی سطح پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اس کی توثیق کرتے ہیں یعنی Chief Justice of اور Chief Justice of India کی توثیق کے بغیر اگر کوئی کمیشن قائم کیا جاتا ہے تو پھر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی نہ ہی وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ اپنے احساسات پیش کر سکے۔ مہاراشٹر کی روشنی میں ہی دیکھیں تو مدان کمیشن کی مثال دی جاسکتی ہے جسے ریاستی چیف جسٹس نے تشکیل دیا تھا۔ گجرات میں ناناوتی کمیشن اور جسٹس شاہ کمیشن کا قیام چیف جسٹس آف انڈیا کے زیر نگیں ہے۔ یہ دونوں افراد سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہیں۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کی تعیناتی کے وقت این ڈی اے کی سرکار تھی۔ لہذا اس نے زیندر مودی حکومت کی پشت پناہی کی۔

کمیٹی محکمہ جاتی ہوتی ہے جبکہ کمیشن کا قیام کمیشن آف انکوائری ایکٹ کے تحت ہوتا ہے۔ معاملات کے حل کے لئے دوسرے راستے بھی ہیں البتہ حقیقت کی

تلاش اسی کے ذریعہ ممکن ہے۔

در اصل جب جانچ میں تاخیر ہوتی ہے تو معاملہ طول پکڑتا جاتا ہے اور اس کی اہمیت ختم ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر کمیشن نے واضح ہدایات دی ہوں تو پھر اس کا نفاذ ضروری قرار پاتا ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر عوام کے ساتھ انتظامیہ میں بھی بے چینی پھیل جاتی ہے۔ لہذا ہونا تو یہ چاہئے کہ فوری طور پر رپورٹ پیش ہو اور اس پر فوری کارروائی بھی ہوتا کہ لوگوں کا اعتماد بحال رہے اور لوگ حکومت و انتظامیہ کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کر سکیں۔

کمیشن آف انکوائری ایکٹ میں تبدیلیاں کی جائیں تو بہتر ہے۔ حکومت کو اس بات کا اختیار نہ دیا جائے کہ وہ رپورٹ کو قبول کرے یا رد کر دے۔ حکومت اگر کمیشن آف انکوائری ایکٹ کے تحت رپورٹ قبول کرتی ہے تب تو ٹھیک ہے لیکن اگر اسے رد کر دیتی ہے تو پھر اس کے پاس رد کرنے کی مضبوط بنیادی وجوہات ہونی چاہئیں۔ تاکہ جب حکومت کسی رپورٹ کو رد کرے تو اس سے سوال و جواب کے بھر پور اختیارات ہوں اور اس کا بھرپور جائزہ لیا جاسکے، ساتھ ہی اس کے خلاف اپیل کے قانونی دروازے بھی کھلے ہوئے ہوں۔

کمیشن غلطیوں کا انکشاف ہی کیا کرتا ہے، سری کرشنا کمیشن رپورٹ کو ہی لیں تو محسوس ہوگا کہ شیو سینا بی جے پی کے ساتھ این سی پی کانگریس نے اسے نافذ نہیں کیا حالانکہ انہوں نے بنیادی چیزوں کی نشاندہی کی ہے۔ 1992-93 کے ممبئی فسادات پر انہوں نے بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے کچھ لوگوں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے محکمہ پولیس کو بھی کٹہرے میں کھڑا کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر بابر مسجد کی شہادت اور فساد نہیں ہوتا تو پھر بم دھماکے بھی نہیں ہوتے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں

نے بہتر معلومات فراہم کی ہیں۔ اگر کوئی شخص بھی گذشتہ 15 یا 16 سال کی تاریخ کا جائزہ لے تو اسے محسوس ہوگا کہ سری کرشنا کمیشن نے اپنی رپورٹ میں جن باتوں کی نشاندہی کی تھی وہ درست ثابت ہوئی ہے یا نہیں، کیونکہ مذکورہ واقعات کے بعد لوگوں کے مابین فاصلے بڑھے ہیں، لوگوں میں عدم اعتماد کا ماحول پیدا ہوا ہے۔ ایک دوسرے کا احترام اور بھائی چارہ کی فضا ختم ہوئی ہے۔ کمیشن نے ان تمام چیزوں کی نشاندہی کی ہے اور خاٹیوں کے خلاف کارروائی کی اپیل کی ہے۔ لیکن حکومت کی نااہلی کی بنا پر ان کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکی۔ بم دھماکوں کے مجرمین کو تو سزا ہو گئی لیکن جن لوگوں نے اس کے لئے ماحول بنایا اور فسادات میں پیش پیش رہے وہ کھلے عام گھوم رہے ہیں۔ لہذا عدم اطمینان کی فضا تو قائم ہوئی ہے۔

(ایک انٹرویو کی تلخیص)



کمیشنوں نے بڑی حد تک مجرموں کو بے نقاب کیا ہے

شبیم ہاشمی

(معروف سماجی کارکن)

اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے متعلق یا مسلم مخالف فسادات کی جانچ کے لئے جن کمیشنوں یا کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا وہ بلاشبہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہیں۔ کیونکہ ان کمیشنوں نے حالات کا جائزہ لینے اور اصل صورت حال کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور انہوں نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کمیشنوں نے بڑی حد تک مجرموں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کے خلاف کارروائی کی سفارش کی ہے۔ کمیشنوں کے قیام کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ہماری تاریخ مرتب ہوتی ہے اور مسلمانوں کی اصل صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔ کمیشن کی رپورٹیں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا میں کمیشنوں اور کمیٹیوں کے وجود پر انگلی نہیں اٹھاؤں گی۔ کمیشن کے قیام کا کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ملتا ہے کہ اس سے اصل مجرمین کا چہرہ سامنے آتا ہے انہیں ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔

رہا معاملہ کمیشن کی رپورٹ کے نفاذ اور اس پر عملدرآمد کا تو بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے لئے حکومت وقت پوری طرح سے ذمہ دار ہے۔ دراصل میرا ماننا ہے کہ کانگریس پارٹی میں نصف افراد اس کے تعلق سے مخلص ہیں جبکہ بقیہ نصف

افراد فرقہ وارانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ وہ بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اس طرح کے کمیشنوں کی رپورٹ پر عمل درآمد بہر حال نہ ہو۔ اب جبکہ لبر اہن کمیشن کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کر دی گئی ہے، مجھے نہیں لگتا کہ حکومت وقت رپورٹ میں نامزد مجرمین کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی اپنے اندر ہمت جٹاپائے گی۔ کیونکہ 2004 میں پہلی مرتبہ جب یو پی اے حکومت برسر اقتدار ہوئی تھی تو وزیراعظم منموہن سنگھ نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ "We don't want to be vindictive"۔ یعنی ہم بدلہ نہیں لینا چاہتے۔ وزیراعظم کے اس بیان کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ دوسرے اور کمیشنوں کی رپورٹوں کی طرح لبر اہن کمیشن کی یہ رپورٹ بھی سرد خانہ میں ڈال دی جائے گی۔

1992-93 میں ممبئی میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کی جانچ کے لئے سری کرشنا کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس نے ایک عرصہ بعد اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی۔ رپورٹ میں شیو سینا کے چند اہم لیڈروں کو ممبئی فسادات کا قصور وار قرار دیا گیا تھا۔ تاہم مذکورہ رپورٹ کا کیا اور کتنا نفاذ ہوا، یہ جگ ظاہر ہے۔ مجھے اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ کمیشنوں کا قیام محض ووٹ بینک کی سیاست ہے۔ میں واضح طور پر یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ ووٹ بینک کی سیاست کی اصطلاح سے مجھے پریشانی ہے اور میں اس اصطلاح کو ہرگز نہیں مانتی۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آج کا مسلمان باشعور اور بیدار ہو گیا ہے۔ وہ پہلے کے مقابلہ میں اب آنکھ بند کر کے ووٹ نہیں دیتا ہے۔ وہ اصل صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لیتا ہے اور بھلے اور برے امیدوار کے درمیان فرق و امتیاز کر کے ہی ووٹنگ کرتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال گزشتہ پارلیمانی انتخابات اور ملک کی چند ریاستوں میں ہوئے اسمبلی انتخابات میں مسلمانوں کی فیصلہ کن ووٹنگ ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو سرکاری بے رخی کا سامنا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب 2-3 فیصد ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں ان کا اپنا واجبی حق نہیں مل پا رہا ہے۔ ملک میں اب تک جتنے اقلیت مخالف فسادات ہوئے، اگر سرکار چاہتی تو ان فسادات پر زیادہ سے زیادہ 24 تا 48 گھنٹے میں قابو پالیتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ فسادات کرانے میں سرکار کا بھی ہاتھ رہتا ہے۔ اپنی تنظیم انہد کی مدد سے ایک لمبے عرصہ سے ہم فرقہ واریت کے خلاف لڑائی لڑ رہے ہیں اور ملک کی مختلف تہذیبوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے حتی المقدور گجرات کے فساد زدہ مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھے ہیں اور ان کے حقوق کے لئے ہم لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہم اپنی اس تنظیم کے ذریعہ گجرات کے 200 مسلم بچوں کی تعلیمی امداد کر رہے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ انہد سمیت مختلف غیر سرکاری تنظیمیں دنیا بدل تو نہیں سکتیں، تاہم ہم اتنے تو ضرور مطمئن ہیں کہ ان اداروں کو ملک کو صحیح ڈگر پر لانے میں کسی حد تک کامیابی بھی ضرور ملی ہے۔



انکوائری کمیشن ایک فریب، ایک دھوکہ

(بٹلہ ہاؤس انکوائنٹر کے تناظر میں ایک جائزہ)

وصی احمد نعمانی ایڈووکیٹ

انکوائری کمیشنوں کا قیام صرف ایک فریب ہے۔ وقت گزارنے اور معاملہ کو سرد خانے میں ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ کیونکہ انکوائری رپورٹ حکومتوں کے لئے صرف ایک اطلاع نامہ ہے اور بس۔ آئیے عدالتوں کے فیصلے اور حکم کی بنیاد پر کمیشن کی رپورٹوں کو آنکتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انکوائری حل نہیں بلکہ صرف عدالت حل ہے۔ مثلاً:

۱۔ ایم۔ وی۔ راجواڑے بنام ڈاکٹر ایس، ایم حسن۔ AIR- 1954 Nagpur-71 کے فیصلہ میں ناگپور ویزن بنچ نے کہا کہ: ”تفتیشی کمیشن تو صرف ایک Fact Finding (واقعات کا پتہ لگانے کی) کمیٹی ہے۔ جو متعلقہ حکومت کو اطلاع فراہم کرتی ہے۔ اور کمیشن کی رپورٹ کسی بھی طرح سے کوئی فیصلہ نہیں ہے۔“ اس فیصلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”حکومت اس بات کی کسی بھی طرح پابند نہیں ہے کہ وہ اپنا کوئی فیصلہ کمیشن کی رپورٹ پر منحصر ہو کر سنائے۔“ ناگپور ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ سپریم کورٹ کے فیصلوں کے ذریعہ کنفرم کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

۲۔ راما کرشنا ڈالمیا بنام جسٹس این۔ آر۔ تندولکر۔ S.C.R-279 1959 میں سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ ”لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ

کمیشن آف انکوائری کو کوئی جوڈیشیل اختیار نہیں ہے۔ اور اس کی رپورٹ صرف ایک ریکومنڈیشن ہے۔ اور اس رپورٹ کا خود بخود کوئی اثر نہیں لیا جاتا ہے۔ دفعہ ۶ کمیشن آف انکوائری ایکٹ 1952 کے تحت گواہوں کا دیا گیا بیان کوئی قانونی ثبوت نہیں ہے۔ INADMISSABLE IS WHOLLY کسی بھی قانونی اگلی کارروائی کے لئے نہ تو دیوانی عدالت کے لئے اور نہ فوجداری عدالت کے لئے یہ ثبوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کمیشن کی جانب سے کسی بھی عمل کے لئے کوئی ریکومنڈیشن یا کسی طرح کی کارروائی کے لئے بے سود ہے۔ اس کی بنیاد پر نہ تو کسی طرح کی مجرمین کو سزا دی جاسکتی ہے اور نہ معاملہ کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے..... اگر کسی کو سزا دینی ہے تو اس کے لئے صرف عدالت مجاز کو اختیار ہے۔ جو تمام گواہوں اور ثبوتوں کی بنیاد پر جو ان مجاز عدالتوں میں شواہد پیش کئے گئے ہیں سزا دی جاسکے گی۔ اور ان عدالت مجاز کو بغیر کسی فرد، ادارہ، اتھارٹی سے متاثر ہوئے بغیر کسی طرح سے دباؤ میں آئے بغیر فیصلہ کرنا ہوگا۔“

دیکھئے:- A.I.R.- 200 S.C.-2637 کا پیرا نمبر ”31“ صفحہ نمبر 265 T.T. Antony v. State- of Kerala سپریم کورٹ نے اس مقدمہ میں پانچ ججوں کی آئینی بنچ کے فیصلے کو بنیاد مانا ہے اور یہ فیصلہ پھر پانچ ججوں کے بعد سات ججوں کی بنچ نے مان کر اسے پوری طرح ایک مکمل حیثیت دے کر حتمی قانون بنا دیا ہے۔ اور آج تک یہی قانون نافذ ہے۔ یعنی انکوائری ثبوت نہیں صرف ایک اطلاع ہے۔

☆ مذکورہ بالا فیصلہ کے پیرا گراف ”34“ میں سپریم کورٹ نے ساتوں ججوں کے فیصلے کو بنیاد مان کر کہا ہے کہ ”ہماری نظر میں کوئی بھی دیوانی یا فوجداری عدالت انکوائری کمیشن کی رپورٹ یا نظریہ کو ماننے کی بالکل پابند نہیں ہے۔ کیونکہ عدالتیں اپنا فیصلہ قانون کے سامنے پیش کئے گئے ثبوت و دلیل جو خود ان کے ضابطہ اور اصول

کے مطابق ہوں، انہی کی بنیاد پر سناتی ہیں۔“

The courts, civil or Criminal, are not bound by the report or findings of the commission of Enquiry as they have to arrive at their own decision on the evidence placed before them in accordance with the law. The report and findings of the Commission of Enquiry are meant for information of the government, T.T. Antony v. State of Kerala, AIR 2001 Sc 2637.

کمیشن کی رپورٹ پر کسی بھی حکومت کو ہرگز سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں دیتی ہے۔
☆ یعنی مذکورہ بالا فیصلوں اور قانونی اصولوں کے مد نظر کسی بھی تفتیشی کمیشن کو کسی کو بھی سزا دینے، قانونی طور پر گرفت میں لانے کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔
کمیشن صرف متعلقہ حکومتوں کو کسی بھی واقعہ کے بارے میں اور اپنے دائرہ کار (Reference) میں رہ کر صرف گزرے ہوئے حالات و واقعات کی اطلاع دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کمیشن کی رپورٹ کو ”اپنے“ آدمیوں یا اپنی ایجنسی کے ذریعہ Reference یا حکومت کے مقاصد کو سامنے رکھ کر صرف ”اطلاع“ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور بس۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر نہ تو کسی کو سزا دی جاسکتی ہے، نہ کسی کو گرفتار کیا جاسکتا ہے، نہ مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، نہ اس کی بنیاد پر کسی واقعہ کی عدالتی سماعت ہو سکتی ہے۔

☆ میں قانون کے مبتدی کی حیثیت سے یہ بات نہایت زور ڈال کر کہوں گا کہ تفتیشی کمیشن کی کسی بھی رپورٹ کو FIR تک کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ جب کہ فوجداری قانون میں کسی مجرم کو ٹرائل کے بغیر سزا نہیں دی جائے گی۔ اور ٹرائل کی صرف دو بنیادیں ہیں۔ (۱) FIR (۲) استغاثہ (Complaint) جو عدالتوں

میں داخل کیا جاتا ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کو نہ تو FIR اور نہ استغاثہ کی ہی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے باوجود جس کارروائی کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ہم اپنی پوری طاقت اور حیثیت ایسی ہی کارروائی کے لئے کیوں ختم کر رہے ہیں۔ جہاں لڑائی لڑی جانی چاہئے اس سے ہم کیوں کتراتے ہیں۔

☆ بلاشبہ صحیح اور درست لڑائی لڑنی بہت ”جگرے“ کا کام ہے۔ جس میں نہایت تدبر اور ہوشیاری کے ساتھ بلا کی ذہانت درکار ہے۔ بے پناہ خرچ اور مضبوط منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی بھی جنگ کے کئی مورچے ہوتے ہیں مگر فتح ”زمینی“ جنگ ہی دیتی ہے۔ میں معافی کے ساتھ کہوں گا کہ پوری قوم مورچوں پر لڑ کر ”زمینی“ جنگ کا یقین کر لیتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مورچہ اور جنگ دونوں ہار جاتی ہے۔

☆ دیگر تمام قومی معاملوں کی طرح ہی بٹلہ ہاؤس کی جنگ بھی صرف مورچوں پر لڑی جا رہی ہے۔ ”زمین“ پر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھائے گئے تو گجرات کی جنگ کی طرح یہ بھی ہار جائیں گے۔ اور ناناوتی کمیشن کی طرح کوئی اور کمیشن اپنا کام کر دے گا۔ گجرات کی صرف وہ جنگیں ”زمینی“ ہیں۔ جن کی بنیاد جیالے شہریوں کے ذریعہ لکھوائی گئی رپورٹ پر ہے۔ لیکن اس لڑائی کے 6 مراحل میں سے ایک بھی کمزور ہوا تو یہ بھی ہار جائیں گے۔ کیونکہ کسی بھی قانونی اور عدالتی جنگ کے 6 مراحل ہیں۔ انہیں 6 مرحلوں میں سے ”بٹلہ ہاؤس“ کی جنگ کو بھی گزرنا ہی ہوگا ورنہ ہماری شکست میں ایک اور ہار ”جڑ“ جائے گی۔ جیت کے لئے مندرجہ ذیل اقدام ضروری ہیں۔

FIR-1 جامعہ پولس تھانہ میں مقتول اور بے گناہ نوجوان جس کو اٹھا کر لے جایا گیا کے والدین یا ان کے قریبی رشتہ داروں کی طرف سے درج کرایا جانا ضروری ہے۔

2- دفعہ 161 ضابطہ فوجداری کے تحت گواہوں کا بیان پولیس کے سامنے کرانا ضروری ہے۔

3-FIR اور 161 ضابطہ فوجداری کے تحت دئے گئے بیان میں کسی تضاد کے بغیر ایمانداری سے چارج شیٹ داخل کرنے کی جان لیوا کوشش، تدبیر، ترکیب کامیابی کے ساتھ کر لینا شامل ہے۔

4-FIR درج ہونے کے دن سے مقدمہ کے فیصلے تک تمام جیالے چشم دید گواہوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کی ترکیب، تدبیر اور انتظامات، بے جگری سے کرنا ضروری ہے۔

5- مدعی اور گواہوں کے خاندان اور قریبی رشتہ داروں کے جان و مال کی بھرپور نگرانی اور حفاظت کرنا جنگ کا نہایت اہم حصہ ہے۔ کیوں کہ یہی سب اس ”زمینی“ جنگ کی کامیابی کے لئے اثاثہ ہیں۔

6- نامور، منجھے ہوئے، ذہین، تجربہ کار، شروڈ، گھاگ، فوجداری کے وکلاء کے ذریعہ FIR، 161 کے بیان چارج شیٹ کی پوری صحت کے مطابق مقدمہ میں کامیابی سے جرح اور بحث کرالینا ضروری ہے۔ تب جا کر ”زمینی“ جنگ جیت سکیں گے۔ اور جنگ جیتنے کے لئے تو ”سب کچھ“ داؤ پر لگانا ہوتا ہے۔ تمام ذرائع کا استعمال کرنا ہوتا ہے، ہمیں بھی کرنا ہی ہوگا۔

میں بللہ ہاؤس انکاونٹر کے تناظر میں انصاف پسند افراد سے درخواست کروں گا کہ اپنے ذرائع اپنی حیثیت، اپنے سیاسی وقار و مراتب کو بروئے کار لا کر FIR درج کرانے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے، مقتول، مظلوم کے لواحقین کے ذریعہ پولیس تھانہ جامعہ نگر میں اپنی ”موجودگی“ درج کرائیں، انتظامیہ کا استعمال کر کے اصلی قانونی چارہ جوئی کریں۔ کیونکہ کوئی بھی تفتیش چاہے انتظامی ہو یا جوڈیشیل مسئلہ کا حل بالکل نہیں ہے۔ شری کرشنار پورٹ ہمارے سامنے ہے۔ مجرم کو مجرم

کمیشن نے تو کہہ دیا۔ مگر چونکہ عدالتی اور تھانہ کی کارروائی نہیں ہوئی اس لئے مجرم کو سزا نہیں دی گئی۔ اس طرح شری کرشنار پورٹ صرف کاغذ کا دفتر بن کر رہ گیا۔

☆ مان لیجئے کسی کمیشن نے ”بٹلہ ہاؤس“ کے واقعات کو یہ ثابت بھی کر دیا کہ پولیس نے ظلم کیا ہے، اور یہ لوگ قاتل نہیں، مقتول معصوم ہیں موقع سے اٹھایا گیا نو جوان بے گناہ ہے تو بھی ہمیں کیا ملے گا صرف ایک اور کمیشن کی رپورٹ اور بس مگر نہ کسی پولیس والے کو سزا ملے گی نہ جرمانہ کسی سے لیا جائے گا کیونکہ ”کمیشن“ عدالت نہیں ہے۔ اس کے سامنے دئے گئے بیانات عدالتی نہیں ہیں۔ اس لئے یہ سب کے سب صرف ”آنسو پونچھنے“ کی کارروائی ہو کر رہ جائیں گے۔ اور ہم سب ہمیشہ کی طرح خود تماشہ بن جائیں گے۔

☆ مجرمین کو سزا تو تب ملے گی جب FIR درج کیا جائے گا۔ اور پیروی کے تمام چھ مراحل پورے کئے جائیں گے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ بات ہے کہ پولیس FIR نہیں درج کرے گی تو میں یہ کہوں گا کہ اگر ہم FIR درج کرا کر، مقدمہ کی درست پیروی کی سکت، طاقت، ذرائع، تدبیر اور ترکیب کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں، تو معاف کیجئے، ہم سینہ کو بی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔ پھر گھروں میں بیٹھ کر ٹی۔وی پر بیان دینے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

☆ شروع شروع میں بیان، مباحثہ، سیمینار، ٹی۔وی پر تذکرے ضروری تھے۔ مگر اب سمت کو بدل کر اپنی طاقت و قوت اور ذرائع کا استعمال ٹھیک جگہ ٹھیک وقت اور ٹھیک سمت میں کرنا ہی ہوگا۔ کسی ”رٹ“ یا مقدمہ کے ذریعہ بھی عدالت FIR کا ہی حکم دیتی ہے۔ سیدھے طور پر عدالت بھی سزا نہیں دیتی ہے۔ اس لئے بغیر FIR درج کرائے سیدھے طور پر عدالت سے بھی رجوع کرتے ہیں تو بھی عدالت تمام گواہی اور بیانات کی بنیاد پر صرف FIR درج کر کے تفتیش کا حکم دے

سکتی ہے۔ تو پھر عدالت کا فیصلہ جو غیر یقینی ہے اس کا انتظار کر کے وقت ضائع کیوں کریں۔ کیونکہ جلد سے جلد کاؤنٹر FIR درج کرا کر جلد سے جلد عدالتی کارروائی پوری کرا کر مجرمین کو سزا دلائیں۔ اور ظلم و بربریت کے ”دانو“ کو لگام دینے کی کارروائی کریں۔

☆ خلاصہ یہ ہوا کہ اس طرح کے معاملات میں عدالتی چارہ جوئی کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ اور اس کے لئے متعلقہ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ کا اندراج ہی واحد راستہ ہے۔ ہمیں انصاف کے لئے اور ملک میں امن و قانون کی بحالی کے لئے یہ سب کرنا ہوگا۔ اور جس طرح بیانات، سیمینار، سمپوزیم کا ایک ”رواج“ بنا ہوا ہے۔ اسی طرح پورے ملک میں ایسے معاملات میں FIR درج کرانے کا ماحول پیدا کریں۔ بے جگری اور حوصلے کے ساتھ قانونی راستہ جو جہاں مناسب ہو اپنائیں۔

☆ ”انکوائری کمشین“ کی مانگ یا اس کی تشکیل یہاں تک کہ اس کی آخری رپورٹ بھی ہمارے کسی بھی کام کی نہیں ہے۔ کمیشن کی رپورٹ پر بھی FIR درج کرانا ہی ہوگا۔ پھر گواہوں کے بیانات، جرح اور بحث کرنی ہوگی تب جا کر عدالت مجاز کسی بھی مجرم کو سزا دے گی۔ اور ظلم و بربریت کا راکشس قابو میں آئے گا۔ ہر ایک شہری کو اپنے خلاف کئے گئے مظالم کا تدارک اور انصاف کے لئے دستوری اور قانونی حق حاصل ہے۔

یاد رکھئے قانون صرف اس کو انصاف دیتا ہے جو قانونی راستے پر چل کر انصاف کا طلب گار ہوتا ہے۔

تجربہ کرکام عمل ہونے تک ان کی رو کے والا نہیں ہے۔ بات میں انہوں
 نے ہر قسم کے تجربہ اور فکر کے بعد ہی عمل کی بات کی ہے۔ ان کا کام کیا
 ہے؟ ان کی کہانی ہے۔ اس کا پہلا نام ہے۔ اس کی کہانی کے
 بارے میں کہیں کوئی بات نہ ہو۔ اس کا نام ہے۔ اس کی کہانی کے
 بارے میں کہیں کوئی بات نہ ہو۔ اس کا نام ہے۔ اس کی کہانی کے

باب چہارم

انہدام کی دلخراش کہانی: عینی شاہدوں کی زبانی

انہدام کا جھوٹ اور سچ

پر بھاش جوشی

(پر بھاش جوشی ہندی کے ایک سرکردہ اور بے باک صحافی تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے بابر مسجد انہدام کے بعد آرائس ایس بلکہ پورے سنگھ پر یوار پر زبردست یلغار کر دی تھی اور روزنامہ جن ستہ میں جس کے وہ مدیر تھے قسط وار ادارے شائع کر کے سنگھی سازشوں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کے بعد وہ سنگھ پر یوار کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے تھے لیکن ان کا قلم آخر دم تک نہیں رکا۔ ہم یہاں 20 دسمبر 1992 کو روزنامہ جن ستہ میں شائع ان کا مضمون پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے ایک خفیہ ویڈیو دیکھ کر لکھا تھا۔ اس ویڈیو میں بابر مسجد انہدام کا پورا منظر قید ہے۔)

چھ دسمبر کو اجودھیا میں متنازع عمارت کے سامنے پردے سے ڈھکی کسی جالی دار کھڑکی سے صبح سوا چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک کھینچی گئی اس غیر ایڈٹ ویڈیو فلم کو دیکھنے کے بعد مجھے کوئی شک نہیں رہ گیا ہے۔ یہ سفید جھوٹ ہے کہ عمارت کا انہدام ہندو جذبات کا دھماکہ تھا۔ اور جو ہوا اپنے آپ ہوا تھا۔ دراصل عمارت کو توڑنے میں کہیں کوئی عجلت نہیں تھی۔ سر پر بھگوا پٹی باندھے اور گنبد پر چڑھے نوجوان بھلے ہی کا رسیوک رہے ہوں، لیکن عمارت کو توڑنے والے ماہر مزدور تھے۔ کیونکہ کسی عمارت کو کیسے توڑا جاتا ہے اس کی انہیں پوری معلومات تھی۔ توڑنے والوں کو جیسے یہ

یقین تھا کہ کام مکمل ہونے تک انہیں کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ رات میں تو انہوں نے باقاعدہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی کی روشنی میں اپنا کام کیا۔

صبح کوئی گیارہ چالیس پر کارسیوکوں کا ہر اول دستہ بغیر کسی روک ٹوک کے عمارت کے اندر پہنچ گیا تھا۔ توڑ پھوڑ کا کام شام کوئی سواپانچ بجے تک چلتا رہا۔ اس دوران عمارت پر نہ تو کوئی اچانک حملہ ہوا نہ بھگدڑ مچی۔ ایل کے اڈوانی کا اتنا کہنا تو سچ ہے کہ توڑ پھوڑ کرنے والے کوئی پانچ چھ سو لوگ رہے ہوں گے اور اس احاطے میں چند ہزار، لیکن جب کارسیوک گنبدوں پر چڑھ گئے اور بھگوا جھنڈا لہرانے لگے تو وہ کچھ سو سے زیادہ نہیں تھے۔ وہ بھی پولیس کی رکاوٹ توڑ کر مزاحمت کرتے ہوئے نہیں گئے تھے۔ انہیں سنگھ پر یوار کے کسی بھی لیڈر نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بھجن کیرتن اور سادھوی رتمبھرا کا بھاشن تو سنائی دے رہا تھا لیکن ایل کے اڈوانی یا جوشی وغیرہ کی کوئی اپیل نہیں سنائی دی۔ صبح سے ہی پولیس والے لاٹھی لیے بھیڑ میں گھومتے نظر آئے۔ پھر جب گنبد کو توڑا جا رہا تھا تو وہ سب قطار بنا کر دوسری طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ سردرات میں لاٹھیاں پٹکتے اور اوور کوٹ پہنے جلے کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ انہیں طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی اشک آور گیس چھوڑنے یا لاٹھی چارج کر کے توڑ پھوڑ کرنے والوں کو روکنے یا سمجھانے بجھانے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ پولیس والے جیسے کسی میت میں ڈیوٹی دینے آئے تھے۔ وہ خاموش تماشاخی ہی نہیں تھے بلکہ جو کچھ ہو رہا تھا اسے مزے سے دیکھ بھی رہے تھے۔

جب صبح کو عمارت توڑی جانے لگی تو کسی نے بھی اسے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ مرکزی حکومت نے نہ ریاستی حکومت نے۔ شروع میں پولیس کے ساتھ گھیرا بنا کر کھڑے کارسیوکوں نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد نہ توڑنے والے بھی خاکی پینٹ اور سیاہ ٹوپی لگائے ہوئے تھے۔ توڑ پھوڑ کے وقت ایک بھی

لیڈران کو روکنے وہاں نہیں آیا۔

اڈوانی نے سچ کہا تھا کہ کارسیوا گینتی پھاوڑے سے ہوگی، اس کے شروع ہونے سے قبل فلم میں اشوک سنگھل کے آنے اور موقع کا معائنہ کرنے کے مناظر ہیں۔ پھر اڈوانی اور جوشی کے آنے اور گھوم پھر کر انتظام دیکھنے کے بھی مناظر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اڈوانی کو کچھ غلط ہونے کی بھنک لگ گئی تھی۔ اور وہ بہت تناؤ میں تھے۔ لیکن چبوترے پر جاتے وقت اور احاطے میں گھومنے پھرنے کے دوران ان کی چال میں ذرا بھی لرزش نہیں ہے۔ کارسیوک ان سے نمستے کرتے تو وہ پیار سے جواب دیتے اور دیر تک ہاتھ ہلاتے۔ جوشی بھی ان کے ساتھ بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کے پیچھے سادھوی کہی جانے والی رتمبھرا بھی کھڑی دکھائی دی۔ وہ بھی خوش تھی۔ سنگھل کا موقع معائنہ کسی جنرل جیسا تھا۔ کوئی ہاتھ جوڑتا تو وہ جواب میں ہاتھ جوڑ دیتے۔ لیکن بالکل پروفیشنل انداز میں۔

انہدام کے وقت سارے لیڈر کہاں چلے گئے تھے، کیمرہ ان کو دکھاتا کیوں نہیں۔ سنگھ کے لیڈران کہتے ہیں کہ جوہو اس سے وہ حیرت زدہ ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ آرائس ایس، بی جے پی، شیو سینا اور بجرنگ دل کے لیڈروں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ عمارت گرانے کی ٹریننگ اور ریہرسل باقاعدہ اجودھیا میں چل رہی تھی، اور اس کی تصویریں بھی اخباروں میں چھپی ہیں۔

اب واچمنی کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں کہ عمارت کے گرنے سے اڈوانی تو اتنے دکھی تھے کہ رو پڑے۔ انہوں نے اپوزیشن لیڈر کے عہدے سے استعفا دیدیا۔ روئے تو نرسمہا راؤ بھی تھے، جنہیں اجودھیا سے منٹ منٹ کی خبر مل رہی تھی۔ لیکن اخباروں میں یہ بھی چھپا ہے کہ اڈوانی اپنے سامنے بیٹھے ایک لاکھ اسی ہزار کارسیوکوں سے کہتے رہے کہ اجودھیا میں نیم مسلح دستوں کو نہ گھسنے دیں۔ بہر حال اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ بابرہ مسجد کی عمارت کو منظم پلان اور تیاری کے

ساتھ گرایا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اجودھیا کا مقامی ایڈمنسٹریشن وزیر اعلیٰ کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہاں سنگھل اور کٹیار کی متوازی حکومت چل رہی تھی۔ کلیان سنگھ کی ذمہ داری تھی کہ عمارت نہ گرنے پائے لیکن وہ کارسیوا کو انتظامی اور آئینی تعاون دیتے رہے۔ عمارت منہدم ہونے کے بعد انہوں نے استعفا دیدیا۔ لیکن جب عمارت گر رہی تھی تو انہوں نے نہ تو مرکزی فورس کے جوانوں کو جانے دیا اور نہ ہی اپنی پولیس سے اسے روکنے کو کہا۔

کوئی سولہ سترہ گھنٹے کی فلم دیکھنے کے بعد دل میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ گیا کہ عمارت کو منظم پلان کے تحت گرایا گیا۔ اس اسکیم پر عمل ہو سکے اس کے لیے سپریم کورٹ میں جھوٹ بولا گیا۔ اجودھیا میں پوری تیاری کی گئی تھی کہ باہر سے پولیس یا فوج نہ پہنچ سکے۔ سڑکوں پر بلیوں کے علاوہ جلتے ٹائر بھی رکھے گئے تھے۔ سنگھ پر یوار نے یہ فیصلہ لے لیا تھا کہ اگر نرسمہا راؤ کوئی کارروائی نہ کریں تو عمارت کا نام و نشان مٹا دو اور اگر کارروائی کریں تو ایسی صورتحال پیدا کر دو کہ اجودھیا میں جو خون بہے اس سے پورے ملک میں خون خرابہ پیدا ہو جائے۔ بہر حال بابری مسجد انہدام کا جواز سنگھ پر یوار ہندو جذبات کے رد عمل کے طور پر پیش کر سکتا ہے۔ سنگھ پر یوار کے پاس مذہب، قوم، جمہوریت اور جدید نظام کا کوئی بنیادی فلسفہ نہیں ہے۔ وہ مغرب اور اسلام کے رد عمل میں کھڑے کئے گئے دلائل کے ڈھانچے ہیں۔ ہندو کا ٹھپہ لگا دیا جائے تو مغربی فاشزم کو قبول کرنے میں آرائس ایس کو کوئی دشواری نہیں ہوگئی۔

بہر حال سنگھ پر یوار کو جو کرنا تھا اس نے کر لیا۔ اس کا کوئی لیڈر خواہ کتنا ہی دکھ ظاہر کرے اسے کتنا ہی افسوسناک قرار دے، ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ بابری مسجد کی عمارت کو منہدم کرنے میں آرائس ایس ایک طرح سے ہندو تو کی بالادستی دیکھتا ہے۔ اشوک سنگھل کو اجودھیا تنازعہ کا کوئی پرامن حل کبھی منظور نہیں ہوا، کیونکہ

اس سے نہ تو وہ مسلمانوں کو سبق سکھا سکتے تھے نہ ہندوؤں کو بہادر بنا سکتے تھے۔ ہندو سماج دنیا کا سب سے قدیم اور مہذب سماج ہے اور اس میں اشوک سنگھل اور سنگھ پر یوار کے ہندو تو کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے اس پر پابندی لگانے کے بجائے اس کے نظریات کا مقابلہ نظریات سے کرنا چاہئے۔ آریس ایس نے ایک حملہ کر کے ابھی تو اجودھیا میں ایک جنگ کا آغاز کیا ہے۔ مہابھارت کا آخری اشوک لکھا جانا ابھی باقی ہے۔



آنکھوں دیکھا چھ دسمبر

(انہدام سے قبل کی مشق اور عارضی مندر کی تعمیر تک کے

واقعات کا چشم دید بیان)

پیش ترپاٹھی

پانچ دسمبر، ہفتے کا دن۔ لکھنؤ کے قیصر باغ بس اڈے پر فیض آباد جانے کو تیار
بس پر بیٹھتے ہی کنڈکٹر کا سوال ”کہاں جائے گا؟“ ”فیض آباد جواب سنتے ہی وہ
قریب آیا اور بولا ”تو پھر اپنی داڑھی پوری طرح بنوا لیجئے۔ میں ابھی بس روکے
رہوں گا۔“ مگر کیوں بنوالوں داڑھی؟ ہمارے ساتھی صحافی نے اپنی پیار سے تراشی
ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کنڈکٹر سے سوال کیا۔ کنڈکٹر کا جواب۔ بھیا جی!
جو میں کہتا ہوں وہی کرو۔ آپ لوگوں کو کچھ نہیں معلوم۔ ضد نہ کیجئے۔ جلدی کیجئے۔
جائیے بنوا کر آئیے۔ وہ پھسپھسانے کے انداز میں بولا۔ ورنہ مت جائیے آج کل
فیض آباد۔ وہاں اس داڑھی کی وجہ سے بھگتو گے۔

اس کی درخواست نہیں بلکہ اس کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے ہم لوگوں نے
اپنے ساتھی صحافی کی داڑھی صاف کروادی۔ شام چھ بجے بس فیض آباد پہنچی، چونکہ
ہمیں اجودھیا جانا تھا اس لیے قصبے کے اندر بڑھے۔ آگے بڑھتے ہی بزرگ کنڈکٹر
کا مشورہ اب بہت مفید نظر آنے لگا تھا۔ کیونکہ سڑکوں پر نظر آنے لگی تھی وہ بھیڑ۔
بلکہ ایک سیلاب۔ عوامی سیلاب۔ عجیب سا اشتعال۔ چہروں پر غصہ۔ مٹھیاں بھینچی
ہوئی اور زعفرانی کپڑا۔ یا تو شانے پر یا پیشانی پر۔ وہ عوامی سیلاب کدھر جا رہا تھا، کہنا

مشکل تھا۔ کیونکہ چاروں طرف سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ پھر اگر کوئی داڑھی والا نظر آ جائے تو وہ لوگ اس سے گہری پوچھ تاچھ کرنے لگتے۔ بالکل ٹرینڈ کمانڈوز کی مانند۔ داڑھی والا اگر ہندو ہے تو چھوڑ دیتے اگر بات چیت سے یہ اندازہ لگ گیا کہ وہ ایک خاص فرقے (مسلمان) سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی جم کر پٹائی ہوتی۔ کھلے عام۔ ان لوگوں کو کارسیوک کہا جا رہا تھا۔ ہر ریاست کی الگ الگ ٹولیاں فیض آباد سے اجودھیا تک کے پانچ کلومیٹر کے راستے پر۔ عوامی سیلاب ہی سیلاب۔ مقامی گاڑی والے کارسیوکوں کو مفت میں لے جا رہے تھے اور گھما رہے تھے۔ بالکل جنگ سے پہلے کی ہلچل تھی اور سرکاری سوری تھیں۔ اگر بات چیت یا علیے سے کوئی مسلمان نظر آتا تو کارسیوکوں کی بھیڑ جھٹک کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیتی اور کپڑے اتار دیتی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں ختنہ تو نہیں ہوا ہے۔ نہ ہونے پر اس سے جے شری رام کے نعرے لگواتے۔ ختنہ ہونے کی صورت میں وہ شخص بھیڑ کے ہاتھوں کہاں غائب ہو جاتا کسی کو نہیں معلوم۔ سب کچھ منظم تھا اور تربیت یافتہ انداز میں تھا۔ متنازع عمارت کے احاطے میں تو صرف کارسیوکوں کی بھیڑ ہی نظر آتی تھی۔ صدر دروازے سے متصل دیوار اور اس میں لگے دروازے کی تعمیر پر کارسیوک آنے لگے اور دس منٹ کے اندر پانچ سو کارسیوکوں نے اس تعمیر کو گرا دیا۔ وہاں راجیو گاندھی نے ہندوؤں کے جذبات مطمئن کرنے کے لیے شیلا نیاس کروایا تھا۔ پانچ دسمبر کو اس تعمیر کے گرتے ہی یہ یقین ہو گیا تھا کہ کل تو اس متنازع عمارت کا اللہ ہی مالک ہے۔

لوگوں کے ارادے واضح تھے۔ ہم کارسیوک پورم پہنچ گئے۔ اسے قصبہ کہنا مناسب ہوگا، وسیع عارضی بستی۔ پانی، بجلی، جنریٹر، بیڈروم، باتھ روم، کانفرنس ہال۔ یکمپ بہت قرینے سے بنایا گیا تھا۔ ہر قسم کی دوکانیں جگہ جگہ کھانا بن رہا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں کمبل اور رضائیاں، جگہ جگہ الاؤ اور بھجن کیرتن کرتے لوگ۔ بھیڑ

اتنی کہ چلنا مشکل۔

ہم لوگ کارسیوک پورم سے سول اسپتال تک گھومتے رہے، جس کسی سے بات کرو یہی جواب کہ ہم لوگ یہاں سر جوندی سے بالولے کر رام مندر میں ڈالنے نہیں آئے ہیں۔ کل اس ڈھانچے کو گرا کر ہی رہیں گے۔ کچھ بھی ہو جائے، جان لینی پڑے یا دینی پڑے، اس کے علاوہ اجودھیا کے ہر گھر میں چاہے وہ امیر کا ہو یا غریب کا، چوپالوں پر، مٹھوں، چبوتروں اور فٹ پاتھوں پر کارسیوک ہی کارسیوک ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہر گھر میں بھنڈا راتھا اور سب کے لیے کھانے پینے اور چائے ناشتے کا انتظام۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور مزاروں و درگاہوں پر بھی ان کے قبضے تھے۔

پانچ دسمبر کی رات گہری ہو گئی۔ تقریباً گیارہ بجے متنازع عمارت کی داہنی طرف مجوزہ لکشمی مندر کے قریب خالی میدان کے نیچے گہرے نالے سے تین سو کارسیوکوں کا جتھہ پچاس پچاس کی تعداد میں اوپر چڑھتا نظر آیا۔ سب کے کندھوں پر کوہ پیماؤں کی مانند موٹے موٹے رستے، ہاتھوں میں کدال، سبل، پھاوڑا، چھنی، ہتھوڑی۔ سب کچھ، سبھی خاموشی کے ساتھ متنازع عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک سیٹی بجی اور نالے سے لے کر عمارت کے نیچے تک دونوں طرف ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے کارسیوکوں کی ایک قطار دو منٹ کے اندر بن گئی۔ درمیان میں خالی جگہ سے جتھوں نے دوڑ لگائی۔ احاطے کے نیچے آئے اور پھر اسی رفتار سے واپس جا کر ہتھیاروں کو رکھ دیا۔ یہ تھی کل یعنی چھ دسمبر کو ہونے والی کارروائی کی مشق۔ عمارت کی پشت کی طرف چار پائی لاکر ڈالی جانے لگی۔ ساتھ ہی دائیں طرف آنا فانا میں سیکڑوں بوری سیمنٹ، مٹی اور مورنگ کا ڈھیر لگ گیا۔ لکڑی کی بلیاں ڈال دی گئیں۔

اس پوری کارروائی کو سیکورٹی فورسز نے بھی دیکھا۔ مگر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

رات میں دو بجے ان جتھوں نے مسلمانوں کے گھروں اور املاک کو نشانہ بنانا اور انہیں نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ چار بجے علی الصباح یعنی چھ دسمبر کی صبح کا آغاز۔ دریائے سرجو کی جانب لوگوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ وہاں لوگ رفع حاجت کے لیے جارہے ہیں گندگی کا ڈھیر لگ گیا۔

ادھر چھ دسمبر کا سورج اب اونچائی پر آ گیا۔ دھوپ تو صرف ہلکی سی گرماہٹ پیدا کر رہی تھی لیکن اجودھیا کی زمین سلگنے لگی تھی۔ گھنٹوں اور گھڑیالوں کی تیز آواز شروع ہو گئی۔ یہ تھا اعلان جنگ۔ مانس بھون کی چھت پر جانے کے لیے صحافیوں کے لیے سامنے کی بلڈنگ میں کارسیوک پاس بنا رہے تھے۔ ہم اس چکر میں جب نظر بچا کر کچھ اور اندر چلے گئے تو اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک ہزار کے قریب پرائیویٹ اسلحہ بردار انقلابی، ہندو قیس، ریوالور، کٹے اور طمنچے لیے کھڑے تھے۔ کچھ تیار ہو رہے تھے اور کچھ تیار ہو کر کھانا کھانے گئے تھے۔ جیسے ہی اجنبی پر نظر پڑی، ہمیں دھکا مار کر باہر کر دیا گیا۔ یہ سوال اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے کہ یہ اسلحہ بردار کہاں سے اکٹھا ہو گئے تھے۔ اس کے بعد صبح آٹھ بجے سے لیکر گیارہ بجے تک بھیڑ اکٹھا ہوتی رہی۔ گیارہ بجکر پانچ منٹ پر متنازع عمارت پر چاروں طرف سے یلغار بول دی گئی۔ سب کچھ منظم۔ کون کارسیوک کہاں سے چڑھے گا، کون صحافیوں کو پیٹے گا۔ کون پتھراؤ کرے گا، کون سیکورٹی فورسز کا راستہ روکے گا، کون لوگ انسانی زنجیر بنائیں گے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جو کچھ اس دن کیا گیا بالکل منظم تھا اور کاغذ پر پوری کارروائی تحریر کر دی گئی تھی۔ بہت سے لوگ ہاتھوں میں کاغذ لے کر اسکو پڑھتے اور پھر ہدایت دیتے۔

جوں ہی رات میں مشق کرنے والے جتھے دوڑ کر عمارت کی طرف بڑھتے اوپر کھڑے سیکورٹی جوانوں پر نیچے کھڑے کارسیوک پتھراؤ کرنے لگے۔ ایس ایس پی ڈی بی رائے اپنا ہلمیٹ آگے کر کے دو منٹ تک تو بچتے رہے، پھر بھاگ کھڑے

ہوئے، کہاں چلے گئے کسی نے نہیں دیکھا۔ باقی افسران سیتا رسوئی میں بنے کنٹرول روم میں بیٹھ کر اپنے پیغامات نشر کرتے رہے۔

پہلا شخص جو کدال لیکر پہلے گنبد پر پہنچا تھا۔ ریوالور نکالی اور دھائیں دھائیں چھ راؤنڈ فائر کر دیے۔ یہ اشارہ تھا۔ اس کے بعد باقی لوگ پشت کی طرف سے چڑھنے لگے۔ اور بہت سے گر کر زخمی ہونے لگے۔ اس وقت وہاں رات میں لا کر رکھی گئی چار پائیوں کا راز سمجھ میں آ گیا۔ تربیت یافتہ کارسیوک زخمیوں کو ان پر لادتے اور اسپتالوں میں پہنچا دیتے۔

دوپہر میں بارہ بجکر دس منٹ پر میں وہاں سے نکلتا کہ اپنے دفتر فون کر سکوں۔ اجودھیا میں تو پی سی او بند تھے۔ ایک ٹیمو میں بیٹھ کر فیض آباد آیا، بس اڈے پر جیسے ہی ایک پی سی او سے فون کرنا چاہا وہاں بیٹھے شخص نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ آج نہ تو کہیں فون جائے گا نہ آئے گا۔ اس وقت چاروں طرف نعرے لگنے لگے، 'جے شری رام ہو گیا کام' پھر واپس آیا تو ایک ایڈیشنل ایس پی جو میرے متعارف تھے، بیٹھے امرود کھا رہے تھے، ادھر کارسیوکوں نے عمارت کی طرف جانے والے راستے پر لکڑی ڈال کر راستہ بند کر دیا تھا۔ وہ وہیں پیٹرول لے کر کھڑے تھے، سیکورٹی فورسز کی کوئی گاڑی پہنچی تو وہ آنا فانا میں وہاں آگ لگا دیتے۔ البتہ کارسیوکوں کو لے کر جانے والی گاڑیاں آرام سے نکل رہی تھیں۔ سب کچھ اس قدر منظم تھا کہ جو بھی سیکورٹی والے عمارت کی طرف جاتے ان کو کارسیوک اپنے گھیرے میں لے لیتے۔ جوان سے تعداد میں کہیں زیادہ تھے۔ بعد میں سیکورٹی جوانوں نے بتایا کہ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک افسر نے بڑا زبردست تبصرہ کیا کہ اگر یہی سب کرنا تھا اور ہمیں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنا تھا تو پھر سیکورٹی فورس کیوں بلائی گئی تھی۔ پوری کی پوری فورس کارسیوکوں کی ریغمال بلکہ غلام بنادی گئی تھی۔

ادھر میرے ساتھی مہیندر دویدی مجھے تلاش کر رہے تھے۔ اور میں ان کو۔ تین بجے شام ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں چونکہ چلتے رہے ہیں اس لیے بیچ گئے تھے۔ اور عمارت منہدم کی جا رہی تھی اور اس کی ایک ایک اینٹ یا کوئی ٹکڑا اٹھیلوں میں لے کر لوگوں نے لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ تمام سیاسی منظر نامہ بدل گیا تھا۔ سرجو میں جانے کتنا پانی بہہ گیا، اور اس میں دونوں فرقوں کا جانے کتنا خون بہہ گیا، اب وہاں عمارت نہیں ہے، شام ہوتے ہوتے اس مقام پر نئی تعمیر شروع ہو گئی۔ دوسو راج مستری، اور دو ہزار مزدور، کہاں سے آئے تھے یہ سب۔ ہم لوگ آٹھ دسمبر تک وہاں ٹھہرے رہے۔ اجودھیا کے باشندوں کو ٹوٹا تو اس نتیجے پر پہنچ کہ لوگ آئے، ان کے جھگڑے سے تنگ آ گئے تھے۔

مگر میں پھر یہ کہوں گا کہ چھ دسمبر 92 کو اجودھیا میں جو ہوا وہ خود بخود اور اچانک پیدا اشتعال اور غصے کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ ایک ایک چیز کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ سب کچھ منظم تھا۔ بلیو پرنٹ بنا کر باقاعدہ سازش تیار کر کے۔
اف یہ تھا چھ دسمبر!



بی بی سی کے نمائندے مارک ٹلی کا

سفر نامہ اجودھیا

(یہ سفر نامہ بابری مسجد انہدام کے دوران سنگھ پر یوار کی
غنڈہ گردی اور مابعد انہدام اجودھیا کے شب و روز پر
روشنی ڈالتا ہے)

وہ چھ دسمبر کا دن تھا، میں اور گیلی ایک ایسی بلڈنگ کی چھت پر کھڑے تھے جہاں سے ہمیں مغلیہ دور میں تعمیر شدہ وہ مسجد بالکل واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی جو اجودھیا میں واقع تھی۔ ایودھیا انڈیا کے شمال میں واقع ایک قصبہ ہے جہاں ہندو زائرین اس لیے پہنچتے ہیں کہ یہ ان کے نزدیک ”رام“ کی جائے پیدائش ہے۔ اس روز دائیں بازو کی سیاسی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی ایک طرح سے ذیلی تنظیم وشو ہندو پریشد یعنی ورلڈ ہندو کونسل کی چھ سالہ مہم اپنی انتہا پر تھی۔ یہ مہم نفرت کی بنیاد پر اس نعرے پر چلائی جا رہی تھی کہ مغلیہ دور میں تعمیر کردہ یہ مسجد رام کی جائے پیدائش پر بنائی گئی تھی اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مسجد کو مسمار کر کے وہاں رام کے نام پر مندر تعمیر کریں گے۔

میں نے بعد میں ہونے والے واقعات کی وجہ سے ”انتہا“ کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ چھ برس کی مسلسل مہم کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی سمیت اس مہم کی حمایت کرنے والی تنظیمیں اس قابل ہو گئی تھیں کہ وہ وہاں رام مندر کی تعمیر کا آغاز کرنے والی تھیں لیکن لوگوں کو اس نعرے میں ”رام مندر“ کی تعمیر

کے آغاز پر جمع کرنے سے پہلے انہوں نے حکومت اور عدالت کو یہ تحریری یقین دہانی بھی کروائی تھی کہ تعمیر کے کام کے آغاز سے ان کی مراد صرف ایک مذہبی تقریب ہے اور یہ کہ مسجد کو کسی بھی انداز میں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا بلکہ مسجد کو چھوا تک نہیں جائے گا۔

ہم جس چھت پر موجود تھے، اس کے نیچے کچھ فاصلے پر وہ اسٹیج تھا جہاں سے اس تقریب کو کنٹرول کرنا تھا اور اس اسٹیج پر جگہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان بھر سے آئے ہوئے خود کو تارک الدنیا کہنے والے سادھو اپنے مخصوص ڈریس میں ایک دوسرے کو دھکا دینے بلکہ کچلنے میں مصروف تھے۔ دنیا اور دنیا کے ہر کام سے صبح و شام نفرت کا اظہار کرنے والے ان سادھوؤں سے نمٹنے کے لیے نو جوان رضا کاروں کا ایک گروپ اسٹیج کے چاروں جانب موجود تھا، یہ نو جوان ہر اس شخص کو دھکیلنے بلکہ اٹھا کر پھینکنے کے لیے تیار تھے جس کی جگہ ان کے خیال میں اسٹیج پر نہیں بنتی تھی جبکہ خاکی رنگ کی وردیوں میں ملبوس پولیس ان سب سے کچھ دور بانس سے بنی ہوئی ایک باڑھ کے پیچھے موجود تھی کیونکہ وہاں موجود ان کے افسروں کو اتر پردیش پولیس کے ایک سابق سربراہ نے، جس نے پولیس سے ریٹائر ہونے کے بعد ہندو دھرم کے سیوک کاروپ دھار لیا تھا، خبردار کیا تھا کہ وہ مجمع سے دور رہیں اور ان افسروں نے اس حکم پر اسی طرح عمل کیا تھا جس طرح وہ ان صاحب کی ملازمت کے دوران میں کرتے تھے جب وہ سرکاری طور پر انہیں احکامات دیتے تھے۔ پولیس مجمع سے دور تھی لیکن مسجد کے قریب تھی اور ان کے خیال میں یہ فاصلہ بھی اتنا تھا کہ وہ آگے بڑھنے والوں کو آسانی سے کنٹرول کر کے مسجد تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

مذہبی تقریب کے نام پر ہونے والی تقریب کا آغاز ہی ایسی تقریروں سے ہوا جن میں نفرت اور اشتعال کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور مجمع جو ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گیا تھا، اس کا بھرپور جواب دے رہا تھا، اور یہی وہ لوگ تھے جو اسٹیج سے ہونے والی اشتعال

انگریز باتوں مثلاً اس طرح کی باتوں پر کہ وہ اس عمارت کو زمیں بوس کر دیں گے، زیادہ گرم جوشی سے جواب دے رہے تھے۔

معززین کے لیے جو اسٹیج بنایا گیا تھا اس پر بیٹھے ہوئے افراد کے تاثرات بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ مثلاً گوالیار کی سابقہ مہارانی وجے راجے سندھیا جو بیوہ کی روایتی سفید ساڑھی میں تھیں، انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ بجائی تھیں، جب ایک مقرر نے مسجد کو غلامی کے دور کی نشانی قرار دیتے ہوئے اسے ہندو ازم کے لیے بے عزتی قرار دیا تھا۔

مہارانی گوالیار کے ساتھ ہی لال کرشن اڈوانی بیٹھے تھے۔ یہ وہ سیاست داں تھے جن کے ذہن کی پیداوار صرف یہ مہم ہی نہیں تھی بلکہ وہ تمام افراد اور گروہوں کو اکٹھا کرنے والے بھی سمجھے جاتے تھے لیکن وہ ان تقریروں پر اس طرح سے خاموش تھے جیسے ان کا اس پورے معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

ہنگامے کا آغاز اس وقت ہوا جب ہماری بلڈنگ کے نیچے کچھ جوشیلے نوجوان، جو خالص ہندوانہ زرد رنگ کی پٹیاں ماتھے پر باندھے ہوئے تھے، ان رکاوٹوں کو عبور کر گئے جو مجمع کو مسجد سے دور رکھے ہوئے تھیں۔ پولیس کا رد عمل اس پر خاموش تماشائی کا تھا لیکن منتظمین کی جانب سے متعین کردہ رضا کاروں نے کچھ مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ رضا کار بھی ان بلوائیوں میں شامل ہو گئے اور انہوں نے بھی ٹیلی ویژن کے نمائندوں کو مارنا شروع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کیمروں کو توڑنا اور ان کے ٹیپ ریکارڈوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

اس ”پہلی فتح“ سے ان ہزاروں افراد کا حوصلہ بھی بلند ہو گیا جواب تک خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے، اب وہ جے شری رام کے نعرے لگاتے ہوئے پولیس کے اس حفاظتی حصار کی جانب بڑھے جو مسجد کی حفاظت پر مامور تھے۔

ہزاروں افراد کے ایک ساتھ آگے بڑھنے سے گرد کا ایک طوفان سا اٹھا تھا اور

اس میں کوئی چیز واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی لیکن ”غلامی کی نشانی کو برداشت نہیں کریں گے اور ہم یہاں مندر بنائیں گے“ نعروں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز نعروں میں شدت آ گئی تھی، پھر کچھ ہی دیر میں یہ ظاہر ہو گیا کہ پولیس کا بیرونی حصار ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ہم نے دیکھا کہ کچھ نوجوان درختوں پر چڑھ گئے اور گھنے پیڑوں کی شاخوں پر سے ہوتے ہوئے آخری حصار بھی عبور کر کے مسجد کی جانب بھاگ رہے تھے۔ جذبات بھڑکانے والے نفرت انگیز نعروں کے دوران میں ہم نے بی بی جے پی کے ایک رہنما کو مائیکروفون پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ ”پولیس دخل اندازی نہ کرے، پولیس دخل اندازی نہ کرے“ وہ بار بار یہ دہرا رہا تھا لیکن ہمارے خیال میں وہ خواہ مخواہ میں ہی پریشان ہو رہا تھا، پولیس کا ایسا کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پولیس کے بنائے ہوئے آخری حفاظتی دائرے نے مسجد سے پسپا ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ پولیس کے جوانوں نے ڈھال نما حفاظتی شیلڈ کو پتھروں سے بچنے کے لیے سر پر رکھ لیا اور مسجد کی حفاظت کا خیال چھوڑ کر اپنی حفاظت شروع کر دی۔ وہیں سے ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ایک افسر اپنے جوانوں کو دھکے دیتا ہوا اس طرح آگے بڑھ رہا تھا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنی جان کی اتنی فکر تھی تو وہ مسجد کی حفاظت کیا کرتا، اسے تو اپنے ماتحتوں کی بھی کوئی فکر نہیں تھی۔

پولیس کے پیچھے ہٹنے کی دیر تھی کہ ہم نے دیکھا کہ دو جوان تیزی سے مسجد کے مرکزی گنبد پر چڑھ گئے، انہوں نے پہلے مخصوص گیر واجھنڈا وہاں نصب کیا اور اس کے ساتھ مسجد کو توڑنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

یہ آخری موقع تھا جب ہم نے اس مسجد کو دیکھا تھا، جو بابر کی مسجد کے نام سے پہچانی جاتی تھی اور جس کے بارے میں وہ تمام تاریخی شواہد موجود تھے کہ اس مسجد کو مغلیہ سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر نے تعمیر کروایا تھا۔

اجودھیا سے باقی دنیا کے رابطے ختم ہو گئے تھے۔ (مسجد پر حملہ کرنے سے پہلے بی جے پی کے بہادروں نے ٹیلی فون ایکسچینج پر قبضہ کر لیا تھا اور صرف مخصوص افراد کو ہی فون کرنے کی اجازت تھی۔ ”غیر ضروری“ تمام فون کے تار کاٹ دیے گئے تھے) میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا کہ میں فیض آباد جاؤں جو اجودھیا سے تقریباً دس میل دور تھا۔ اور وہاں سے لندن فون کر کے اپنی رپورٹ جمع کرواؤں لیکن ابھی میں نے اپنا سفر شروع ہی کیا تھا کہ مجھے ایک پر جوش مجمع نے گھیر لیا، وہ مجھے چاروں جانب سے گھیرے ہوئے تھے اور انتہائی پر جوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ کہ ”بیرونی صحافی۔ سی آئی اے ایجنٹ!“

پر جوش اور مخالف نوجوانوں میں گھرنے کا یہ میرا پہلا اتفاق نہیں تھا لیکن ترشول کے ذریعے کچو کے کھانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ ترشول کے نوک والا حصہ میرے جسم کو چبھوتے ہوئے وہ میرے مذہب کو بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر ان میں سے کچھ کے حوصلے مزید بڑھے تو انہوں نے مجھے مار ڈالنے کی باتیں کرنی شروع کر دیں لیکن اس موقع پر ایک نوجوان سادھوان کے آڑے آ گیا۔ اس نے اپنے لوگوں کو سمجھایا اور بالآخر وہ سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ مجھے قریب کے ایک مندر میں عارضی طور پر بند کر دیا جائے اور بعد میں میرا فیصلہ کیا جائے (اس طرح سے شاید وہ اپنے بڑوں کی رضا مندی بھی چاہتے تھے) لیکن ابھی مجھے قید ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میرے بہت سے بھارتی صحافی بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے وہاں سے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ جب تک مجھے رہا نہیں کیا جاتا، ان میں سے کوئی بھی وہاں سے ایک قدم نہیں ہلے گا جبکہ مجھے قید کرنے والوں کا اصرار تھا کہ بھارتی صحافیوں کو ان کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے وہاں سے چلے جانا چاہئے۔

ہماری رہائی آخر کار اس وقت عمل میں آئی جب مقامی انتظامیہ کے افراد

اجودھیا کے مشہور مندر کے بڑے پجاری کے ساتھ ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور اس کے بعد ہمیں ایک پولیس کی لاری میں کچھ ان صحافیوں کے ساتھ سوار کر دیا گیا جنہیں خود کو مجمع سے بچنے کے لیے پولیس کی پناہ لینا پڑی تھی، لیکن اس وقت تک مسجد کا نام و نشان مٹا کر اسے ایک ڈھیر میں بدل دیا گیا تھا۔

بی جے پی دراصل راشٹریہ سیوک سنگھ یا نیشنل والنٹیئر کور کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آرائس ایس کے نزدیک انڈیا کی تاریخ صرف باہر سے آنے والے حکمرانوں کے ذریعے بے عزتی کی کہانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اجودھیا کے مسئلے کو چھ سال تک مرکزی حیثیت سے زندہ رکھنے والی بی جے پی تھی۔ انہوں نے پورے انڈیا میں یہ پرچار کیا کہ ہندوؤں کو رام مندر کی تعمیر کے لیے مقدس اینٹیں دینی چاہئیں اور پھر کئی ٹرکوں میں بھر کر یہ مقدس اینٹیں اجودھیا پہنچی بھی تھیں۔

اس بھرپور مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیکولر راجیو گاندھی کو بھی 1989ء کے انتخابات سے پہلے رام مندر کا سنگ بنیاد رکھنے کی اجازت دینی پڑی تاکہ بی جے پی کی اس مہم کے غبارے سے ہوا نکل جائے جس کے ذریعے وہ ہندو ورو کروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔

راجیو کو اپنی اس حکمت عملی میں منہ کی کھانی پڑی، کیونکہ اس سے ان کے نہ صرف حوصلے بڑھے بلکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اقتدار تک پہنچنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

راجیو کے اس فیصلے کے ایک برس کے اندر ہی لال کرشن اڈوانی نے انڈیا کے مغربی ساحل سے شروع ہونے والی ایک دس ہزار کلومیٹر یا ترا کا اعلان کر دیا۔ دس ہزار کلومیٹر کے اس سفر کے لیے ایک ایسی سواری بنائی گئی تھی جو اس رتھ کی طرح تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بھگوان رام اس رتھ میں سفر کرتے تھے۔ اڈوانی اس طویل سفر میں جہاں بھی رکتے، وہاں وہ مسجد کے بارے میں نفرت انگیز باتیں

کرتے تھے۔

اڈوانی کو اجودھیا میں داخل ہونے سے پہلے گرفتار کر لیا گیا لیکن بی جے پی کے ہزاروں کارکن اس کے باوجود اجودھیا میں داخل ہونے والے اس پل تک پہنچ گئے جو متبرک دریائے سر جو پر بنایا گیا ہے۔ پولیس نے پل کو گھیرا ہوا تھا لیکن ایک مادر زاد ننگے سادھو نے ایک بس کے ذریعے ان رکاوٹوں کو توڑ دیا، وہ پولیس کی رکاوٹوں کو گراتا ہوا پل عبور کر گیا اور اس کے پیچھے ہزاروں کارکن اجودھیا کی تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے مسجد کے گیٹ تک پہنچ گئے اور پھر اس مجمع میں سے ایک شخص نے مسجد کے ایک گنبد کی طرف خصوصی پرچم لگا کر ہندو مذہب کی فتح کا اعلان کیا لیکن اس موقع پر پولیس نے فائر کھول دیا جس میں سرکار کے مطابق چھ اور بی جے پی کے دعویٰ کے مطابق پچاس افراد مارے گئے۔ اس کے اگلے روز یہی سین ایک بار پھر دہرایا گیا اور اس بار پولیس کے مطابق پندرہ اور بی جے پی کے مطابق انسٹھ افراد مارے گئے تھے۔

اس سیاسی پس منظر کے ساتھ 1992ء یعنی پرانے واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد جب اجودھیا میں بی جے پی اجتماع کر رہی تھی تو ہر شخص پر واضح تھا کہ اس مسئلہ میں کس قدر جان ہے۔ مرکز میں برسر اقتدار کانگریس کے وزیراعظم نرسمہا راؤ ایک اقلیتی حکومت چلا رہے تھے اور وہ پارلیمنٹ میں اس مسئلے کو اٹھانے سے ڈر رہے تھے۔ انہوں نے مرکز کی جانب سے نیم فوجی دستوں کی ۱۹۵ کمپنیاں اجودھیا کے قریبی شہر فیض آباد تو بھیج دیں لیکن انہیں وہاں سے اجودھیا جانے کا حکم اس ڈر کے مارے نہیں دیا کہ کہیں وہ مسجد کو بچانے کے لیے ایک بار پھر فائر کھول کر بی جے پی کو ”شہید“ مہیا نہ کر دیں۔

اس کے باوجود کہ مسجد کو تباہ کرنے کی پوری مہم بی جے پی نے چلائی تھی لیکن لال کرشن اڈوانی ایک مایوس فرد ہی رہے۔ انڈین صحافیوں کے سرعمومی طور پر شرم

سے جھکے ہوئے تھے۔ ایک تبصرہ نگار نے کہا ”آج ”مہاتما“ کو دوسری بار قتل کیا گیا ہے“ اسی طرح ”قومی شرمندگی“ کی ایک اور نمائندگی ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹوریل کی سرخی تھی جس کے مطابق اسے ایک ”جمہوری غنڈہ گردی“ کہا گیا تھا۔ اس واقعے کے رد عمل کے طور پر پورے انڈیا میں جگہ جگہ فسادات شروع ہو گئے۔ ممبئی جسے اس زمانے میں بمبئی کہا جاتا تھا، وہاں فسادات نے یہ شکل اختیار کی کہ پولیس نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے لیکن جیسا کہ آزادی کے بعد سے ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ آہستہ آہستہ سارے طوفان سمندر کا رخ کر لیتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ فسادات خود بخود شروع ہوئے اور اپنی موت آپ مر گئے۔ انڈیا جونیوں کے آگے بھی نہیں جھکا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اصل میں مذہبی منافرت کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

اجودھیا کو انڈین سیاست میں مرکزی حیثیت حاصل ہونے سے پہلے یہ کبھی بھی ہندو یاتریوں کے لیے خصوصی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ کہ رام کو ہندو خداؤں کے خاندان میں اہم حیثیت حاصل ہے لیکن اجودھیا ایک چھوٹا سا قصبہ ہی رہا تھا جہاں پرانے طرز کی عمارتیں اور اسی طرح کے مندر اور ریٹ ہاؤس تھے لیکن یہ سب دراصل نشانیاں تھیں اس وقت کی جب یہ قصبہ مسلمان بادشاہت کا دارالخلافہ ہوتا تھا۔ یہاں کی تنگ گلیوں میں ٹریفک جام کرنے کے لیے سائیکل رکشا ہی کافی تھے کیونکہ کاریں تو یہاں تھی ہی نہیں۔ اس قصبے میں نہ تو کوئی رہائشی ہوٹل تھا اور نہ ہی اس میں قیام کرنے والے ٹورسٹ تھے کیونکہ جو تھوڑے بہت یاتری یہاں آتے تھے وہ معاشی طور پر اسی قابل ہوتے تھے کہ وہ مندروں کے ساتھ موجود مسافر خانوں میں قیام کر سکیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان ہی کی ہوتی تھی جو آس پاس کے دیہاتوں اور قصبوں سے آتے تھے۔

(درمیان میں) دوسری یا تراسات برس بعد

اپنی آنکھوں سے بابر کی مسجد کی تباہی دیکھنے کے سات برس بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ایک بار پھر اجودھیا جا کر دیکھنا چاہئے کہ وی ایچ پی ایک ہندو ہیڈ کوارٹر کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں عام ہندو کو ”رام“ کی جانب متوجہ کرنے میں اور چھوٹے سے قصبے کو ہندوؤں کی ایک متبرک زیارت گاہ میں بدلنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہے اور اس کے لیے ہم نے پری کرما کے تہوار کو منتخب کیا جب یا تری رام کے شہر کا طواف کرتے ہیں۔

ہم اتر پردیش کے دارالخلافہ لکھنؤ پہنچے تو پہلا ہی احساس ہمیں یہ ہوا کہ بی جے پی نے اجودھیا کی مذہبی حیثیت کو قائم کرنے کے لیے چاہے کچھ بھی کیا ہو لیکن اجودھیا تک پہنچنے کے لیے انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ (اس پورے دور میں اتر پردیش میں بی جے پی کی حکومت رہی تھی)۔

اٹر پورٹ کا تصور تک نہیں تھا۔ دن میں البتہ کچھ سست رفتار ٹرینیں تھیں لیکن جب ہم نے شام میں جانے کی بات کی تو ریلوے انکوائری والوں نے مشورہ دیا کہ ”آپ بس سے چلے جائیں۔“

بسیں اگرچہ ٹرینوں کے مقابلے میں آسانی سے مل جاتی ہیں لیکن ان کی رفتار ٹرینوں سے کم ہوتی ہے۔ ہم رات ہونے سے پہلے اجودھیا پہنچنا چاہتے تھے کیونکہ اخبارات کی اطلاعات یہ تھیں کہ رات ہونے تک قصبے میں ٹریفک کا داخلہ روک دیا جائے گا تا کہ یا تریوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان حالات میں ہم نے ٹیکسی سے جانے کا فیصلہ کیا لیکن ابھی ہم راستے میں ہی تھے کہ تاریکی بڑھنے لگی اور اسی لیے ہمارے قصبہ پہنچ کے ساتھ ہی ہمیں پولیس والوں سے الجھنا پڑا تھا۔

سرکاری طور پر صرف بڑی گاڑیوں اور بسوں وغیرہ کو روکنے کے لیے کہا گیا تھا

لیکن وہاں صورت حال مختلف تھی۔ بڑی گاڑیاں کچھ اس انداز میں سڑک کے بیچ میں لگائی گئی تھیں کہ ان کے درمیان میں سے گزرنا ناممکن تھا۔ جب میں نے پولیس کے ایک افسر سے پوچھا کہ ”ان لاریوں کو سڑک کے درمیان کیوں پارک کر دیا گیا ہے؟“ تو اس نے جواب میں کہا کہ ”ہم نے پارک نہیں کروائی ہیں بلکہ انہوں نے خود روک دی ہیں۔“

”میں مانتا ہوں کہ انہوں نے خود ہی روکی ہیں لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے تھا کہ انہیں سڑک کے کنارے رکوایا جاتا؟“ میں نے کہا اور پولیس والے نے پہلے مجھے غور سے دیکھا پھر کہا۔

”ہاں، ہو تو سکتا تھا“ اس نے یہ کہا اور بے پروائی سے آگے بڑھ گیا اور تمام بڑی گاڑیاں اسی طرح کھڑی رہیں۔

ایک بار ہم نے سوچا کہ ان گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بنا کر ہمیں آگے بڑھنا چاہئے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ہر قدم پر پولیس سے الجھنا پڑے گا ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں فیض آباد میں رکنا چاہیے۔

ہم نے شام اودھ نامی ہوٹل میں کمرالیا جو فائیو اسٹار ہوٹل تو نہیں تھا لیکن وہاں کا ماحول کافی دوستانہ تھا۔ سات برس پہلے جب مسجد والا واقعہ ہوا تھا تو یہی ہوٹل دنیا بھر کے صحافیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا ہوا تھا۔

اگلی صبح پولیس کے ساتھ کچھ مزید تلخ کلامیوں کے بعد ہم اس واحد پل تک پہنچ ہی گئے جو دریائے سر جو پر بنا ہوا تھا۔ پولیس والوں سے ہماری جھڑپوں کی بنیاد یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم آخری کلومیٹر ٹیکسی میں جانے کے بجائے پیدل سفر کریں اور ہم اس کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب اجودھیا کا قصبہ ہمارے سامنے تھا۔ دریا کے ساتھ بنے ہوئے مندروں کے میناروں کے درمیان میں سے ایک مسجد کا مینار اب بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ

واحد مینار مندروں کے جنگل میں علیحدہ سے اس لیے دکھائی دے رہا تھا کہ وہ سب سے بلند تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ یہاں بھی ہر مندر کا مینار الگ طرح کا تھا۔ کوئی ترچھا، کوئی تکیوں اور کوئی گول لیکن مسجد کا مینار بالکل اسی طرح کا تھا جس طرح ہر جگہ ہوتا ہے۔

اجودھیا کو خوبصورت بنانے کے لیے جو کام بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ واحد کام جو حکومت نے یہاں کیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ دریا کے کنارے واقع مندروں پر اس طرح کا رنگ کر دیا تھا کہ تمام مندر گلابی مٹی کی اینٹوں سے تعمیر کیے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

پری کرما کا تہوار شروع ہو چکا تھا۔ یاتریوں کا ایک گروہ سڑک کے ذریعے شہر میں داخل ہو چکا تھا اور ان پر نظر رکھنے کے لیے جگہ جگہ بلند ٹاور بنائے گئے تھے جن پر موجود پولیس والے یاتریوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

انسانوں کا وہ نہ ختم ہونے والا ہجوم ایودھیا کی بڑی سڑک سے ہوتا ہوا ان چھوٹی گلیوں میں داخل ہو گیا تھا جس کے دونوں جانب مندر تھے۔ ہم یہاں پر ایک چھوٹی سی دکان کے باہر بیٹھ گئے اور اس جلوس کو اپنے سامنے سے گزرتا ہوا دیکھتے رہے۔ اس جلوس میں وہ نوجوان مائیں بھی تھیں جن کی گود میں چھوٹے بچے تھے اور وہ باپ بھی تھے جن کے بچے ان کے کندھوں پر سوار تھے۔ ہر عمر کے گرد آلود کپڑوں میں ملبوس وہ دیہاتی بھی تھے جو اپنے کھانے پینے کی چیزیں برتنوں سمیت سروں پر اٹھائے ہوئے تھے اور عمدہ کپڑوں میں ملبوس مڈل کلاس خاندان بھی تھے اور یہ سب ایک ہی منزل کی جانب گامزن تھے۔

ہم ایک بار پھر یاتریوں کے ساتھ شامل ہوئے جو اپنے چکر مکمل کرنے کے لیے پورے خلوص کے ساتھ چل رہے تھے یہاں تک کہ ان میں بہت کم ایسے تھے جو ان مندروں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھ بھی لیتے تھے جن کے پاس سے وہ گزرتے

تھے۔ چلتے چلتے ہم وی ایچ پی کے ہیڈ کوارٹر تک آ گئے۔ ہیڈ کوارٹر میں واقع خوبصورت باغ کے گیٹ بند تھے جبکہ لیڈر شپ میں سے چند ایک درخت کے نیچے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، انہیں نہ تو یاتریوں سے کوئی غرض تھی اور نہ ہی اس روایتی تہوار میں ان کی کوئی دلچسپی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تو شاید مختلف عقیدوں کے مندروں کے درمیان بیٹھ کر ایک مندر اور ایک رام کا پرچار کرنے کی حکمت عملی تیار کر رہے تھے۔ یاتری بھی وہاں سے سیدھے گزرتے چلے جاتے تھے، انہیں بھی ان اینٹوں اور ان پتھروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو وہاں رکھے ہوئے تھے کہ جو نہی مندر کی تعمیر شروع ہوگی، انہیں استعمال کیا جائے گا۔

ہم دو ایسے بچوں کے پاس سے بھی گزرے جو رام اور اس کی بیوی کا روپ دھارے ہوئے تھے۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنے ہاتھ اس انداز میں بلند کر رکھے تھے جیسے آشیر داد دے رہے ہوں۔ وہ دونوں یاتریوں کے لیے دلچسپی کی چیز تھے اور ان میں سے کچھ یاتری ان کے سامنے رکھے کشلول میں سکے ڈال رہے تھے۔ اجودھیا آنے والے یاتریوں میں بھیک کے طور پر سکے دینے کا ہی رواج ہے: وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ یاتری نوٹ دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم یاتریوں سے الگ ہو کر اس جگہ آ گئے جہاں کبھی مسجد ہوتی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہاں تک آنے والے صرف ہم دو ہی تھے لیکن پولیس نے ہمیں اس سخت حفاظتی باڑھ سے آگے نہیں جانے دیا جو رام اور سیتا کی شبیہ کے ارد گرد لگائی گئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ہمارے پاس پاسپورٹ نہیں ہیں اس لیے وہ ہمیں آگے جانے نہیں دے سکتے حالانکہ وہ گیلی کے اس سوال سے لطف اندوز بھی ہوئے جب اس نے ان سے پوچھا کہ ”کیا بھگوان کو دیکھنے کے لیے پاسپورٹ ضروری ہے؟“

پورا دن یاتریوں کے درمیان گزارنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مندر کی تعمیر میں کسی کی دلچسپی نہیں ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ

یادریوں کے ذہن میں یہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے، ان کے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ روایتوں پر عمل کرتے رہیں اور پرانی لکیر پٹیتے رہیں۔

ہر جانب سے فارغ ہو کر ہم اجودھیا کے مرکز میں واپس آ گئے جہاں کنک بھون تھا۔ یہ وہ مندر تھا جہاں ہمیں رات بسر کرنی تھی۔ آ رچا کے مہاراجا مدھو کر شاہ اس مندر کے ٹرسٹ کے چیئر مین ہیں اور انہوں نے ہی ہمارے لیے اس رہائش کا انتظام کیا تھا۔

آ رالیں ایس مسلسل صدیوں کے بیرونی راج کے زخموں پر نمک چھڑکتی رہی ہے لیکن ہوا یہ کہ اس سے ہندوؤں کا یہ تصور ابھر کر سامنے آیا کہ وہ ایک ایسی ڈرپوک اور بزدل نسل ہیں جو اپنے اوپر حکمرانی کروانے میں عار محسوس نہیں کرتے اگرچہ اصل کہانی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔

ایک نوجوان پرکاش کا کہنا تھا کہ ہندو اب بھی کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہیں جب وہ اس ملک میں مسلمانوں کو برداشت کرتے ہیں کیونکہ مسلمان اس ملک کے غدار ہیں اس لیے کہ اسی وقت خوشی کا اظہار کرتے ہیں جب پاکستان ٹیسٹ میچ جیتتا ہے۔ اس کے مطابق مسلمان جان بوجھ کر زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ ہندو آبادی کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے الفاظ کے مطابق ”ان کی وفاداریاں ملک سے باہر ہیں اور یہی کیفیت کرپشن کی بھی ہے۔“

جب میں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس کے نظریات تو مذہبی منافرت کے فروغ کا ذریعہ بن رہے ہیں تو وہ غصے میں آ گیا۔

”ہم وہ عمل کیوں نہ دکھائیں، ہمارے ساتھ مسلمانوں نے کیا، کیا ہے“ وہ غصے کی حالت میں بول رہا تھا۔

”انہوں نے ہم پر حکومت کی، انہوں نے ہمارے مندروں کو تباہ کیا۔ وہ ہمیں تباہ کرتے ہیں اور آج بھی وہ اپنا رد عمل اس موضوع پر بھی ظاہر کرتے ہیں جن سے

ان کا تعلق نہیں ہوتا ہے۔ سلمان رشدی نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے لیکن وہ اسے برداشت نہیں کر سکے اور اس کا گلا کاٹنا چاہتے ہیں۔“

میرے لیے اس کے آخری الفاظ اسے گھیرنے کا سبب بن گئے۔ میں نے سوال کیا ”کیا آپ اس پر فخر محسوس نہیں کرتے کہ ہندو ازم میں اسلام اور کرپچن مذاہب سے زیادہ قوت برداشت ہے کیونکہ یہی دعویٰ میں آپ کے اکثر ہندوؤں کی زبانی سنتا رہا ہوں“ میں نے سوال کیا۔

”یہ بات صحیح ہے کہ ہم میں قوت برداشت ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمارے ہر طرح کے بھگوان ہیں، ہم کسی ایک بھگوان کو نہیں مانتے ہیں بلکہ اس میں کسی بھگوان کو ماننا بھی ضروری نہیں ہے۔ ہمارے پاس صرف رام ہی نہیں، یہ اسلام کی طرح نہیں ہے کہ جہاں آپ ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے تو پھر آپ کے لیے تلوار ہے۔ ہم نے کوئی لائبریری نہیں جلائی البتہ ہماری جلائی جاتی رہی ہیں۔“

”لیکن آپ نے مسجد تو گرائی؟“ میں نے کہا۔

”اور مسجد گراتے ہوئے آپ نے مسلمانوں کے خلاف بے ہودہ اور گالیوں بھرے نعرے بھی لگائے“ میں نے نشاندہی کی۔

”ہماری عزت نفس کو برباد کیا جاتا رہا ہے“ اس نے جواب دینا شروع کیا تھا۔

”آپ کیسا محسوس کریں گے۔ اگر آپ کے مذہب کی کوئی توہین کرے اور

آپ کی مادر وطن کی بے عزتی کرے لیکن اس کے باوجود بھی یہ صرف نوجوان تھے

جنہوں نے اس طرح کے نعرے لگائے، بڑی عمر کے لوگوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

ویسے بھی جب آپ غصے میں ہوتے ہیں تو زبان پر اس طرح کی کچھ باتیں آ جاتی

ہیں۔ ہمارے لیڈروں نے نوجوانوں کو اس سے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن نوجوان

نہیں مانے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟“ پرکاش نے کہا تھا۔

اجودھیا تضادات اور حیرتوں کا شہر ہے جہاں ایک دوسرے کے بدترین دشمن

بہترین دوست ہیں۔ بھگوان رام کچھ لوگوں کے لیے محبت اور کچھ کے لیے نفرت کی علامت ہیں۔ یہ ہندوؤں کا ایک متبرک شہر ہے جس نے اپنا بہترین دور مسلم حکمرانوں کے دور حکومت میں دیکھا۔ یہ تمام انتہا پسند مذہبی تحریکوں کا مرکز نگاہ ہے لیکن یہاں سے ممبر پارلیمنٹ ایک ایسا شخص منتخب ہوتا ہے جو کبھی کمیونسٹ تھا لیکن اب بھی کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ جہاں ہزاروں مذہبی معززین کا گھر ہے وہیں جرائم پیشہ افراد کی پناہ گاہ بھی ہے۔

اجودھیا میں اپنے قیام کے آخری دن ہم کچھ جلدی بیدار ہو گئے۔ ہم اس تہوار کا اختتام دیکھنا چاہتے تھے۔ یاتری دریا میں ڈبکیاں لگا رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی لکڑی کے ان تختوں سے آگے نہیں جا رہا تھا جو دریا کے تیز بہاؤ کی نشانی کے طور پر لگائے گئے تھے۔ سیڑھیوں کے ساتھ پانڈا بیٹھے ہوئے تھے تاکہ یاتریوں کی خدمت کر سکیں۔ وہ ان کے کپڑوں کی حفاظت کر رہے تھے اور جب وہ نہا کر باہر نکلتے تو انہیں آئینہ اور کنگھا بھی مہیا کرتے تھے ساتھ ہی ان کے ماتھے پر سرخ رنگ کا نشان بھی لگاتے تھے، ان کے ساتھ نیم بھو کی گائیں بھی تھیں اور یہ سب کچھ وہ اس لیے کر رہے تھے کہ وہ یاتریوں کو گودان پر آمادہ کر سکیں یعنی یاتری بھو کی گائے کے لیے تحفہ دیں لیکن جو کچھ ملتا تھا، وہ پانڈوں کے اپنے پیٹ کے لیے کافی نہیں ہوتا تھا۔ اکثر پانڈوں کو تو یہ شکایت ہوتی ہے کہ انہیں اتنا بھی نہیں ملتا کہ وہ سیڑھیوں پر بیٹھنے کی فیس ہی ادا کر سکیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مالدار افراد اس جانب نہیں آتے ہیں۔

ہندوستانی معیار کے مطابق یہ ایک چھوٹا تہوار تھا اور گیارہ بجے تک دریا کے کنارے ویران ہو گئے اور وہاں صرف کاغذ اور پلاسٹک کی تھیلیاں رہ گئی تھیں لیکن ایک پانڈا ہماری واپسی تک کسی دیر سے آنے والے یاتری کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ایک پرامن تہوار تھا جس میں کوئی بھی ذہنی دباؤ نہیں تھا۔ مسلم کمیونٹی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پولیس کے لیے بھی کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ والدین سے بچھڑنے والے بچوں کو ان کے والدین کے پاس پہنچاتے رہیں۔

ہم رخصت ہونے سے پہلے کنک بھون میں اپنا آخری چائے کا کپ پی رہے تھے کہ اچے برداشت کے موضوع پر آگیا جو یقیناً اسے پرکاش سے گفتگو کے بعد سے پریشان کر رہا تھا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں نے ایک بائبل اور قرآن خریدا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ کوئی بھی مذہب تشدد کی تعلیم نہیں دیتا ہے لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ ہندوؤں کی پرامن فطرت کا جنونیوں نے کچھ زیادہ ہی استحصال کیا ہے۔“

میں اس کے ساتھ اس موقع پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ اسے یہ بات یاد دلاتا کہ یہ ہندو ہی تھے جنہوں نے اپنے جنگجورام کے ساتھ اجودھیا کا سکون تباہ کیا تھا۔ اچے سے زیادہ امن کا خواہاں شاید ہی کوئی ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ اس رام سے متاثر ہو گیا تھا جو انتقام چاہتا تھا۔

اس تہوار نے ہمارے اس یقین کو مزید پختہ کر دیا کہ مسجد کو تباہ کرنے کے باوجود اور پہلی بار بی جے پی کے دہلی میں سرکار بنانے کے باوجود ہندو بنیاد پرستی کو ملک میں فروغ حاصل نہیں ہو رہا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ احساس بھی ہو گیا کہ بدلہ لینے کا جذبہ بیدار کرنا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔

اجودھیا میں تین دن

ایس پی سنگھ

سابق ایڈیٹر نو بھارت ٹائمز اور نیوز چینل آج تک کے بانی مدیر

ہم 5 دسمبر کی دوپہر لکھنؤ کے راستے سے اجودھیا پہنچے تھے اور اسی دن لکھنؤ میں اٹل بھاری واجپئی کی تقریر تھی۔ اتفاق سے وہ بھی صبح کی ٹرین سے اسی دن لکھنؤ پہنچے تھے۔ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں اپنے حمایتیوں سے صلاح و مشورہ کر رہے تھے۔ اٹل بھاری واجپئی سے وہاں موجود صحافی یہ دریافت کر رہے تھے کہ کارسیوا کے لئے آپ اجودھیا کیوں نہیں جا رہے؟ واجپئی جی کہہ رہے تھے کہ انہیں وہاں نہ جانے کا حکم ہے کیونکہ ان کی ضرورت اجودھیا کے باہر رہے گی۔ ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا آپ کو یہ اعتماد ہے کہ اجودھیا میں سب کچھ امن و امان سے ہوگا، واجپئی نے جواب دیا کہ امید ہے۔ پھر تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کہا کہ شک بھی ہے اور خاموش ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سلسلے میں مزید تفصیل بتاتے۔ اجودھیا معاملے کے نگراں وزیر لال جی ٹنڈن اور اتر پردیش بھاجپا کے صدر کلراج مشرا بات چیت میں کود پڑے اور کہنے لگے کہ کارسیوک کتنے امن کے خواہاں اور منظم ہیں۔

جب انہیں یہ بتایا گیا کہ اجودھیا میں مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے اور کچھ مزاریں توڑنے کی خبریں موصول ہوئی ہیں تو ان لیڈروں نے کہا کہ یہ غلط فہمی کے سبب ہوا ہے۔ کارسیوکوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ منہدم شدہ مزاریں ہیں۔ وہ تو او بڑ کھا بڑ زمین اور ٹیلوں کی صفائی کر رہے تھے کہ وہاں قبریں بھی نکل آئیں لیکن جیسے

ہی مزاریں ہونے کا انکشاف ہوا فوراً کام روک دیا گیا اور کارسیوک اپنے خیموں میں چلے گئے۔ واجپئی جی نے کہا کہ دیکھئے، اسی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کارسیوک ڈسپلن کے کتنے بڑے پابند ہیں۔ حکم کے خلاف جا کر یہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ آپ اجودھیا میں دیکھئے گا۔

لکھنؤ سے فیض آباد کے راستے پر یہ احساس یقین میں بدلنے لگا تھا کہ حقیقت میں اس مرتبہ نہ صرف اطاعت شعار لوگ آئے ہیں بلکہ وہی آرہے ہیں جنہیں آنے کی اجازت دی گئی ہے۔ فیض آباد پہنچ کر ابھی سامان ہی رکھا تھا کہ ادھر سے بی بی سی کے مارک ٹلی آ پہنچے۔ وہ مارگ درشک منڈل کی میٹنگ کا فیصلہ سن کر آئے تھے۔ جس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ لوگ سرجو کا پانی اور مٹھی بھر ریت لے کر جنم استھان کے چبوترے کی صفائی کریں گے۔ مارگ درشک منڈل کا یہ فیصلہ اسی شام کارسیوکوں کی ایک عام سبھا میں سنایا جانا تھا۔

رام کتھانگنج کا میدان کارسیوکوں سے کھچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ کتھانگنج دفتر کی چھت ہی اسٹیج کا کام کر رہی تھی۔ منظم کارسیوک اپنے نام اور پتہ کی پٹیاں سر پر باندھے بڑے صبر و تحمل سے لیڈروں کی تقریریں سن رہے تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ تقریروں کی زبان مارگ درشک منڈل کی تجویز سے بالکل مختلف تھی۔ وہی منافرت پھیلانے والی پرانی تقریریں تھیں۔ صحافی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کب اس تجویز کا عام اعلان ہوتا ہے اور وہ خبریں روانہ کرنے کے لئے فیض آباد کا رخ کریں۔ کافی انتظار کے بعد آچار یہ دھرمیندر اس تجویز کا اعلان کرنے کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریر کے انداز اور زبان میں بھی کہیں کوئی نرمی نہیں تھی اور کافی دیر بعد انہوں نے اس تجویز کو کسی طرح کارسیوکوں کے سامنے پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ کارسیوک صرف یہی کرنے سے مطمئن ہونے والے نہیں ہیں۔ آخر کئی سالوں سے انہیں جس نفرت کی آگ میں بھڑکایا

جار ہا تھا وہ آگ چلو بھر پانی سے اور بھڑکنے ہی والی تھی۔ کارسیوکوں کی بے چینی کا پیمانہ لبریز ہوا۔ اسی وقت اشوک سنگھل اٹھے اور ان جوشیلے کارسیوکوں کا دل بہلانے کے لئے یہ کہنا شروع کیا کہ اخبار والے کیسے جھوٹ پھیلا رہے ہیں اس کا خاطر خواہ جواب انہیں ملنا چاہئے۔

شام ہو رہی تھی، کچھ صحافی یہ سوچ رہے تھے کہ کیوں نہ کارسیوکوں کے الگ الگ کیمپوں میں جا کر ان سے بات چیت کی جائے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟ میں کچھ صحافیوں کے ساتھ کارسیوک پورم پہنچا۔ رام جنم بھومی نرمان نیاس کی طرف سے جاری شناختی کارڈ کے باوجود ہمیشہ کچھ کارسیوک ساتھ لگے رہے اور کسی سے بھی بات کی کوشش کو ناکام کرتے رہے۔ ناکام ہو کر ہم فیض آباد لوٹ آئے۔ وہاں اس بات کا پتہ چلا کہ جرمن ٹیلی ویژن کے عملے کو کارسیوکوں نے بری طرح زد و کوب کیا ہے۔ ان کے کیمرے وغیرہ توڑ ڈالے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اگر مفاہمت نہ کی ہوتی تو انہیں جان سے مار دیا گیا ہوتا۔ زد و کوب کرنے والے کہہ رہے تھے کہ یہ بی بی سی والے ہیں انہیں مار ڈالو۔ سنگھل جی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ انہیں سبق سکھانا بہت ضروری ہے۔

صحافیوں کی ٹیم ابھی اس صدمے سے باہر نکل آنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ کوئی دوڑا دوڑا آ کر یہ خبر دیتا ہے کہ ایک خاتون صحافی کو رام کتھا گنج کے کیمپ میں کارسیوکوں نے بند کر کے رکھا ہے اور اس کے ساتھ نازیبا حرکت کی جا رہی ہے۔ کچھ صحافی دوست فوراً اجودھیا روانہ ہو گئے۔ کافی دیر بعد جب سب لوٹے تو انکشاف ہوا کہ واقعی اس کیمپ کو بہت محفوظ جگہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ وہاں کسی بھی اجنبی شخص کو گھسنے نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس خاتون صحافی کو اندازہ نہیں تھا کہ نادانستہ طور پر اس متنازعہ جگہ وہ کیسے پہنچ گئی تھی جہاں کارسیوک ریہرسل کر رہے تھے۔ ریہرسل اس طرح ہو رہی تھی کہ بڑی بڑی رسیاں اور کانٹے اونچائی کی پہاڑیوں پر پھینکے

جاتے تھے۔ انہیں اوپر پھنسا کر کارسیوک الٹے لٹکتے ہوئے چوٹی پر چڑھتے تھے۔ پھر بڑی بڑی چٹانوں کو رسیوں سے باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ کارسیوکوں کے علم کے بغیر کچھ فوٹو گرافروں نے ریہرسل کے اس منظر کو اپنے کیمروں میں قید کیا تھا جن میں سے ایک تصویر اتوار کے دن دہلی کے ایک اخبار میں شائع بھی ہوئی تھی۔ ہم تمام صحافی آپس میں گفت و شنید کر کے اس راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسی وقت کسی نے اطلاع دی کہ صحافی بھائی کل ذرا سنبھل کر جائے آپ کے لئے وہاں کچھ مخصوص انتظام کیا جا رہا ہے۔ جن صحافیوں کے پاس رام جنم بھومی نیاس کی طرف سے جاری شناختی کارڈ نہیں تھا وہ حقیقت میں فکر مند ہوئے اور دیر رات تک پاس کا انتظام کرنے میں لگے رہے۔

تب تک میرے پاس بھی شناختی کارڈ نہ تھا ایک با اثر مقامی صحافی کو ساتھ لے کر آدھی رات کو ہم پاس بنوانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ رات گیارہ بجے کے قریب پاس دیا گیا تو سوچا کہ کیوں نہ ایک بار متنازعہ احاطہ میں بھی ہو آئیں۔ وہاں پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ بجرنگ دل کے چیف وٹنے کٹیار کسی سے صلاح مشورے میں مصروف ہیں۔ جیسے کہ صحافیوں کی عادت ہوتی ہے ہم کٹیار کی طرف لپکے۔ ہم چار لوگ تھے اور کٹیار سے پہلے ہی سے واقف تھے اس لئے اس وقت ان سے بات کرنے کی کوشش کرنا ہمیں کچھ غیر معمولی نہیں لگ رہا تھا۔ ہم ابھی ان کی طرف دو قدم ہی بڑھے تھے کہ کچھ طاقتور بازوؤں نے ہمیں پکڑ کر باہر کی طرف پھینک دیا۔ وہ سنگھ کے ورکر تھے۔ خاکی ہاف پینٹ پہنے ان دو افراد کے چاروں طرف آر ایس ایس کے ورکروں کی زبردست بھیڑ تھی۔ وہ بات چیت کرتے ہوئے چل بھی رہے تھے پورا مجمع بھی ان کے ساتھ ہی چلتا تھا اور راستے میں جو بھی بیچ میں آتا انہیں طاقت کے زور سے دور پھینک دیا جاتا تھا۔ ایک مقامی صحافی نے بتایا کہ وٹنے کٹیار بڑے احترام کے ساتھ جس شخص سے بات کر رہے ہیں وہ چمپت رائے ہیں

جوسنگھ کے بہت ہی اہم رکن ہیں اور پوری کارروائی کے انچارج بھی ہیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ کارسیوکوں کی بے اطمینانی دور کرنے کے لیے یہ متنازعہ حلقے سے باہر کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں تعمیری کام بھی شروع کر سکیں تاکہ ان کا جوش کم کیا جائے۔ دوسرے روز صبح جب بی بی سی نے مجھ سے پوچھا کہ وہاں کی حالت کیسی ہے تو میں نے کہا کہ کل رات کٹیار اور چمپت رائے ایک ایسا کنارہ ڈھونڈ آئے ہیں جہاں کام شروع کر کے انہیں یقین کہ کارسیوکوں کو بھڑکنے سے روک لیں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ بھی اس اعلان سے متاثر ہو گئے تھے کہ اس مرتبہ کارسیوکوں میں کوئی ایسی ویسی بھیڑ نہیں ہے وہ سگھ کے پرانے لوگ ہیں اور حکم کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کر سکتے اس لئے ونے کٹیار اور چمپت رائے کی سرگرمیوں پر ہمیں شک و شبہ نہیں ہوا۔ اس بات کا انکشاف تو ابھی ہو رہا ہے کہ حقیقت میں دیر رات تک وہ وہاں کیا کر رہے تھے اور ان کا حقیقی حکم کیا تھا۔

دوسرے دن صبح سات سے پہلے ہی ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ چبوترے پر ایک چھوٹا سا بھگوا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ قریب ہی ایک پوجا کا مقام بنا تھا۔ اس وقت تک کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ وہاں کچھ کارسیوک زور زور سے پولیس والوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ مراٹھی انداز میں ہندی بولنے والا ایک نوجوان پولس کو لٹکا رہا تھا ”کیا سمجھتا تم لوگ، ہم لوگ خالی جھاڑو پونچھا کے واسطے آیا۔ ہر چھ مہینے پر ہم لوگ ادھر نہیں آئے گا۔ آج اس کا خلاص کر کے جائے گا۔“ اس کارسیوک کی انگلی کا اشارہ باہری مسجد کی طرف تھا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ یہ بہت جوشیلے کارسیوک ہیں اور باقی ماندہ یقینی طور پر منظم کارسیوک ہوں گے۔ برہم نوجوان مہاتما گاندھی اور راجن سنگھ دونوں کو ایک ہی انداز میں گالیاں دے رہا تھا۔ ہم احاطہ کے چاروں طرف چکر لگا کر لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کرتے

رہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس جوشیلے نوجوان کی زبان بولنے والے وہاں اور بھی دیگر کاریوک تھے۔ وہ تمام اس خاردار باڑھ کے ارد گرد ہی گھوم رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن کاریو شروع کرنے کا کوئی خاص جوش کسی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ زیادہ تر صحافی چبوترے پر جمع ہو گئے تھے، وہاں ہمیں بہار کے ایک اہم لیڈر ملے انہوں نے بتایا کہ بھاری بھیڑ کے سبب سارا پروگرام تہس نہس ہو گیا ہے۔ اب سرجو سے پانی اور ریت لانے کا کام آج بھی نہیں ہوگا۔ شاید کل کریں۔ سوا بارہ بجے کا مہورت بھی بدل گیا ہے۔ ستاروں کی گردش کے مطابق واسد یوجی نے نئی گنتی کی ہے اور اب کبھ کے بجائے کاریو اتولہ لگن میں شروع ہوگی۔

اسی درمیان سنگھ پر یوار کے لیڈران اس چبوترے کے پاس آتے رہے۔ غیر ضروری طور پر ادھر ادھر گھوم کر پھر غائب ہو جاتے تھے۔ سنگھ کے سیوکوں نے چبوترے کے چاروں طرف ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ سانشی گوپال مندر کی طرف سے ایک جنونی بھیڑ بار بار رکاوٹ کو توڑ کر اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پولیس اور دوسرے کاریوک طاقت سے انہیں روک رہے تھے۔ اسی درمیان ایک بھیڑ دوسری طرف سے اندر داخل ہونے لگی۔ ہاتھ میں ننگی تلواریں اور بندوق لے کر گولیاں چلا رہے تھے۔ کسی باخبر نے بتایا کہ یہ ”شیوسینک“ ہیں۔ مائک پر اعلان کر کے ایک کے بعد دوسرے لیڈر کو اس حلقے سے باہر بلایا جاتا رہا۔ یہ پروگرام گھنٹوں تک چلا۔ لیکن کاریوکوں کی کوئی تیاری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور ان پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک سوئم سیوکوں کی بھاری بھیڑ نظر آئی جن کے ماتھے پر بھگوا پٹیاں نہیں تھیں۔ سر پر پہلی پٹی باندھے یہ نوجوان اجودھیا میں پہلی مرتبہ نظر آئے تھے۔ مائک پر اعلان ہو رہا تھا کہ بہت ہو چکا، بھرتنگ دل کے یہ نوجوان چبوترے کو غیر ضروری لوگوں سے خالی کرادیں، اب آپ طاقت کا استعمال کریں۔ تمام نوجوان ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ یہ منظر تقریباً دس منٹ تک چلتا رہا اور پھر انہیں مائک سے حکم ملا کہ

آپ واپس آ کر اسٹیج کے بائیں طرف بیٹھ جائیں۔ جس رفتار سے یہ اسٹیج سے آئے تھے اسی رفتار سے واپس لوٹ بھی گئے۔ تمام سینئر لیڈران پہلے ہی دور ہو چکے تھے۔ ان سب کے الگ ہوتے ہی اچانک چاروں طرف سے بھیڑ اندر ٹوٹ پڑی۔ اور ہم اس منظر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک شخص گنبد پر کھڑا نظر آیا اس کے بعد دوسرا بھی۔ اس کے ہاتھ میں بھگوا جھنڈا تھا۔ اور پلک جھپکتے ہی پتھروں کی برسات شروع ہوئی۔ ہزاروں لوگ اوپر چڑھ گئے۔ پولیس دومنٹ میں ہی غائب ہو گئی اور مسجد کو سمار کرنے کا کام شروع ہوا۔

رسیاں باندھ دی گئیں، ہتھوڑے، پھاوڑے، کدال وغیرہ نکل آئے۔ نئے سوئم سیوکوں کا ایک جتھہ وہاں آیا۔ سیٹی بجا کر نیچے سے انہیں اشارے سے احکامات دے رہے تھے۔ مائیک پر اعلان کی زبان بدل گئی، گھنٹے، شکھ بجنے لگے، آس پاس کے نلوں میں پانی آنے لگا۔ مواصلاتی نظام درہم برہم ہو گیا۔ صحافیوں پر ایک ساتھ حملے ہوئے۔ شناخت کے لئے ان کے پاس ان کے سینوں پر لال پاس لٹکا ہوا تھا لیکن پھر بھی ان کی پٹائی ہوئی۔ لیڈران دوسری طرف اسٹیج سے کچھ بول رہے تھے۔ وہ نہیں جس کا دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ بلکہ وہ جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ کام گھنٹوں چلتا رہا، اجودھیا آنے کے چاروں راستوں کو بند کر دیا گیا۔ ایسبولنس گلیوں میں حاضر تھی۔ لوگ اسٹریچر لے کر پہنچ گئے۔

صحافیوں کی پٹائی اور مسجد کی انہدامی کارروائی کا کام زوروں پر تھا۔ پانچ بجے تک تینوں گنبد گر چکے تھے۔ صحافیوں کو یہی کارسیوک بہلا پھسلا کر کہہ رہے تھے کہ اب بھاگ لیجئے، اندھیرا ہونے کے بعد آپ کے ساتھ کیا ہوگا اس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ ہم چار صحافی ایک ساتھ نکلے۔ تمام گاڑیاں غائب تھیں صرف ایک گاڑی تھی۔ ابھی گاڑی چلی بھی نہیں تھی کہ کچھ کارسیوک چاروں طرف سے آئے اور گاڑی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے ان کے ساتھ ایک زخمی کارسیوک تھا جسے وہ لوگ گاڑی میں ڈال

رہے تھے۔ ہم اسے بٹھا کر وہاں سے نکلے۔ فیض آباد کے راستے میں کئی رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں، لیکن اتنی رکاوٹیں نہیں تھیں کہ ہمیں منزل تک پہنچنے میں دشواری ہوتی، اگر ہم اکیلے ہوتے تو شاید راستوں کو پار کرنا مشکل ہوتا۔ لیکن زخمی کارسیوک کی وجہ سے راستے صاف ہوتے گئے اور ہم فیض آباد اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں سابق وزیر صحت ہریش چندر شریواستو کی قیادت میں سوئم سیوکوں کا ایک جتھا زخموں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شریواستو جی اسپتال میں صبح سے ہی موجود تھے اور بارہ بجے سے بے چین ہو کر اپنے ہاتھ کی گھڑی کو دیکھ رہے تھے کہ کوئی زخمی ابھی تک آیا نہیں؟

فیض آباد پہنچنے کے بعد ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ مرکزی سیکورٹی فورسز نے اجودھیا میں جانے کی کوشش کی یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ صرف ایک بار کچھ سپاہی نکل پڑے تھے لیکن راستے میں پہلی رکاوٹ کو دیکھ کر واپس لوٹ آئے۔ پوری رات ہم اس راستے کے ہی آس پاس تھے لیکن کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہاں پہنچنے کی کوئی کوشش ہو رہی ہے۔ آدھی رات تک حالت یہی تھی۔ کہ صبحانی پھر بھی وہاں پہنچ رہے تھے۔ رات ایک بجے کچھ صحافیوں نے لوٹ کر بتایا تھا کہ مسجد پوری طرح سے مسمار ہو چکی ہے۔ اسے زمین بوس کر کے رام للا کی مورتی رکھ دی گئی ہے۔ پوجا پاٹھ جاری ہے اور دیوار بنانے کا کام بھی چل رہا ہے۔ صبح سات بجے تین صحافی پھر اجودھیا کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں رکاوٹیں اب بھی تھیں لیکن اتنی نہیں کہ ہمیں اجودھیا پہنچنے میں تکلیف ہوتی۔ ہماری گاڑی تقریباً دو سو گز دور رک گئی کیوں کہ اس سے آگے لے جانا ممکن نہیں تھا اور ہم پیدل اس طرف چل پڑے۔ راستے میں کئی مقام جلتے نظر آئے۔ ایک مسجد باقی تھی۔ صبح اسے پھر سے جلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سڑک پر آگ جل رہی تھی۔ اور پولیس کے جوان اپنی ہتھیلیاں سینک رہے تھے۔

متنازعہ مقام پر پر امن طریقے سے کام ہو رہا تھا۔ ایک جتھا بلے کی صفائی کر رہا تھا، دوسرا مندر کی تعمیر میں مصروف تھا۔ درگاواہنی کی خاتون ممبران گیت گاتے ہوئے احاطے میں داخل ہو رہی تھیں۔ پولس کے ہزاروں نوجوان ہنستے مسکراتے ٹہل رہے تھے۔ آج صحافیوں کو کم خطرہ تھا کیوں کہ سوئم سیوکوں کو بھی یہ حکم دیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی پٹیاں اتار لیں۔ بھیڑ میں کون کیا ہے پہچاننا مشکل تھا۔

ہم دوپہر فیض آباد لوٹ آئے۔ صدر راج نافذ کے اٹھارہ گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔ لیکن کسی طرح کی کوئی نئی کوشش ہوتی نظر نہیں آئی۔ فیض آباد سے لکھنؤ کے راستے پر پولیس کا ایک ٹرک بھی اس طرف جاتا نظر نہیں آیا۔ لکھنؤ میں راج بھون کے سامنے سناٹا تھا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں گورنر کے مشیر آئے ہیں اور انتظامیہ وہیں سے کام کر رہا ہے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مشیر اندر کمرے میں ہیں آس پاس کوئی نہیں ہے۔ بھاجپا کے صدر مرلی منوہر جوشی مسکراہٹ کے ساتھ صحافیوں سے کچھ ضروری باتیں کرتے نظر آئے۔

دہلی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ دہلی میں یہ سب اطلاع آتی رہی کہ مرکزی سیکورٹی فورس چھ تارخ سے وہاں پہنچنے کی بہت کوشش کرتی رہی ہے۔ (روی فیچرز)



صحافیوں نے 6 دسمبر کو کیا دیکھا اور ان پر کیا بتی

نو صحافیوں کے ایک گروپ نے جو کہ 6 دسمبر کو اجودھیا میں تھا، دہلی میں جنوری 1993 میں منعقد سٹیزنس ٹریوٹل میں جو بیان دیا وہ انتہائی دلہوز ہے۔ یہاں ہم اسکی تلخیص پیش کر رہے ہیں:

صحافیوں نے اپنے بیان میں اس بات پر زور دیا کہ ریاستی انتظامیہ سنگھ پر یوار کے اشارے پر کام کر رہا تھا۔ سریش بافتا (نئی دنیا ہندی) نے دعوا کیا ہے کہ سیکورٹی انتظامات بھی وشو ہندو پریشد کی ہدایات کے مرہون منت تھے۔ ضلع مجسٹریٹ روزانہ بی جے پی ایم پی و نے کٹیار کے گھر حاضری دیا کرتے تھے۔ وہ وہاں روزانہ دو تین گھنٹے پریشد کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ مشورہ کیا کرتے تھے۔ وشو ہندو پریشد کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ ریاستی پولیس فورس کو جہاں چاہے تعینات کرے۔

پر بھا جگن ناتھن (ڈکن کرانیکل) نے ضلع انتظامیہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ان کا رویہ مسلمانوں کے تئیں ٹھیک نہیں تھا جو کہ کارسیوکوں کی آمد سے بہت خوفزدہ تھے اور پولیس انتظامیہ سے مدد کی اپیل کر رہے تھے۔ 150 مسلمانوں کی جانب سے حاجی محبوب نے ڈی ایم سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سی آر پی ایف تعینات کر دیں۔ انہوں نے مرکزی وزیر کمار منگلیم کو بھی مدد کے لیے فون کیا۔ پانچ دسمبر کو ڈی ایم پی نے اے سی بھیجی مگر اسے مین روڈ تک محدود کر دیا گیا۔ کسی ایک بھی مسلمان کے گھر کو تحفظ فراہم نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ ہاشم انصاری

کے گھر کو بھی نہیں جہاں تین دسمبر کو حملہ کیا گیا تھا۔

جب جگن ناتھن نے ڈی ایم سے پوچھا کہ یہاں مسلمانوں کو لاحق خطرات کے پیش نظر وہ کارسیوکوں کو یہاں آنے سے روک کیوں نہیں رہے ہیں۔ تو ڈی ایم نے کہا کہ عدالت نے ہدایت دی ہے کہ انتظامیہ کسی کو بھی درشن کرنے سے نہیں روک سکتی۔ لیکن وینکٹیش راما کرشنن (فرنٹ لائن) کا دعوا ہے کہ ڈی ایم نے لکھنؤ میں ریاستی انتظامیہ کو خبردار کیا تھا کہ ایک لاکھ کارسیوک اجودھیا میں آچکے ہیں اور وہ صورتحال کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔

مارک ٹٹلی (بی بی سی) کے مطابق 6 دسمبر کو ہزاروں لوگوں کو مسجد کے قریب آنے کی اجازت دیدی گئی۔ یہ حیرت انگیز تھا کہ ہزاروں لوگ مسجد کے آس پاس چہل قدمی کر رہے تھے۔ پولیس کا بندوبست بھی تھا لیکن ناکافی۔ میرے خیال میں وہاں جو بھی بندوبست تھا وہ مسجد کے خلاف تھا۔ سی آر پی ایف جوانوں نے ان سے کہا کہ جتنے پولس والوں کا انتظام کیا گیا ہے وہ مسجد کا تحفظ کرنے میں ناکام رہیں گے۔

6 دسمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ کچھ بھیانک ہونے والا ہے کیونکہ کارسیوک راستے کی رکاوٹوں کو توڑ رہے تھے۔ مدھو کرپادھیائے (یونی وارتا) کے مطابق بابر مسجد پر حملے سے چند منٹ قبل پولیس کا قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا ضلع افسران اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر چلتے بنے۔ ضلع افسران انہدام شروع ہونے کے ایک گھنٹے بعد پھر آئے۔ مانس بھون کی چھت پر جو صحافی تھے انہوں نے ضلع افسران سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

سمن چٹوپادھیائے (آنند بازار پتریکا) کے مطابق وہ رام کتھانج کی چھت پر تھے وہاں سنگھ پر یوار کے لیڈران بھی تھے اور پولیس والے بھی۔ وہ لوگ اڈوانی

سے بات کرنے آئے تھے کہ ان کے لیے ان کی کیا ہدایات ہیں۔

تین بج کر دس منٹ پر اطراف میں دھواں اٹھتا دکھائی دینے لگا۔ مانس بھون کی چھت پر اے ڈی ایم مسٹر دو بے سے پر بھا جگن ناتھن کی ملاقات ہوئی۔ ان کے گلے میں ایک ہار تھا۔ سر پر پھولوں کی پنکھڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور پیشانی پر ٹیکہ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے ان سے کہا کہ مسلمانوں کے گھروں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ وہ سی آر پی ایف کو کیوں نہیں بلاتے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جب میں نے کہا کہ آپ یہاں رہتے ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہئے، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں یہاں قید کر دیا گیا ہوں بالکل آپ کی طرح۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

ایک شخص جس کے ہاتھ میں کنٹرول تھا۔ یو پی کے وزیر صحت ہریش چندرا تھے۔ نو بھارت کے ایس پی سنگھ کے مطابق انہوں نے خود کو فیض آباد کے اسپتال میں قید کر لیا تھا اور 6 دسمبر کو جو بھی زخمی کارسیوک آتے وہ ان کے علاج معالجے میں لگے رہے۔

صحافیوں کے مطابق وہاں پورے ایک ہفتے تک پولیس والوں کا نام و نشان نہیں تھا جو لوگ تھے بھی وہ کارسیوکوں کی ہدایت پر کام کرتے تھے۔ وہ بھی بے شری رام کے نعرے لگاتے۔ کیونکہ یہ لفظ اجودھیا میں ”پاس ورڈ“ بن گیا تھا۔ کارسیوکوں کو کسی بھی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا اور پولیس والوں سے ان کی دوستی تھی۔ اسٹیج سے بار بار وشو ہندو پریشد کے لیڈران کارسیوکوں کا حوصلہ بڑھاتے اور کہتے رہے کہ پولس والے ان کے بھائی ہیں 1990 کی مانند اس بار بھی ان کی مدد کریں گے۔

ایک صحافی بنجے کاؤ کارسیوک کا بھیس بنا کر گئے تھے۔ اسٹیٹمنٹس وابستہ اس صحافی نے بتایا کہ وہاں پولیس اور کارسیوکوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ سب ایک ہی بھاشا بول رہے تھے۔ انہوں نے جن پولیس والوں سے بات کی وہ سب یہی کہہ

رہے تھے کہ آج بابر مسجد گرا دی جائے گی۔

ایس پی سنگھ کے مطابق 6 دسمبر کو بابر مسجد کی پشت پر تعینات آٹھ پولیس والے چند نو جوانوں سے بات کر رہے تھے جو کہ راجیو گاندھی اور ارجن سنگھ کو گالیاں بک رہے تھے اور اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ عمارت کو گرا کر ہی دم لیں گے۔ پولیس والے ان سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ پیچھے ہی سے چند نو جوان پہلے دیوار پر چڑھے اور پھر گنبد پر چڑھ گئے۔

بابر مسجد کے تحفظ پر مامور پی ای سی والے بہت آرام سے تھے اور انہیں لگ رہا تھا جیسے اس وقت وہاں ان کا کوئی کام نہیں ہے جو کچھ کرنا ہے کارسیوکوں کو کرنا ہے۔ جب مسجد پر حملہ ہوا تو وہ وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ مارک ٹلی کا کہنا ہے کہ کارسیوک پلاٹون کی مانند مارچ کر رہے تھے اور ان کو کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔

ایس پی سنگھ کہتے ہیں کہ انہوں نے چار پانچ وردی دھاریوں کو دیکھا کہ وہ بھی عمارت کو منہدم کرنے میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ پولیس والے مسجد کے چاروں طرف لگائی گئی تاروں کی باڑ بٹا رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی وردیوں سے اپنے ناموں کی پٹی بٹادی ہے۔

سمن چٹوپادھیائے کا کہنا ہے کہ جس وقت تیسرا گنبد گرا ہے تمام پولیس والے خوشی میں رقص کرنے لگے۔ ایک پولیس والا ان کے پاس آیا اور بولا، اس وقت کیا ٹائم ہو رہا ہے تم اسے نوٹ کرو، کیونکہ تم ایک تاریخ بننے کے شاہد اور گواہ بن رہے ہیں۔ اڈوانی کی حفاظت میں تعینات این ایس جی گارڈ صحافیوں کی پیشانی پر تلک لگا رہے تھے۔ روچرا گپتا (بزنس انڈیا) کے مطابق ایک پولس والے نے ان سے کہا کہ اس کے پاس جو پتھر کی سہلے اس کے ساتھ اس کی تصویر اتارے کیونکہ اس پتھر پر پالی زبان میں لکھا ہوا ہے جس سے کارسیوکوں کی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رام مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی۔

صحافیوں نے بتایا کہ جب مسلمانوں کے گھروں اور مسجدوں کو آگ لگا دی گئی تو اس وقت بھی پولیس والے خاموش رہے البتہ رام کتھا کنج کے ایس ایچ او اور ان کی جو نیرافرا بخو گیتا نے متعدد مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اور ان کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ چھ اور سات دسمبر کو مسلمانوں کے گھروں دکانوں اور مسجدوں کو آگ لگائی جاتی رہی اور ایس آر پی ایف والے تماشہ دیکھتے رہے۔ وینکٹیش کے مطابق ونے کٹیار سات دسمبر تک وہاں موجود تھے اور انہوں نے اس کام کے مکمل کرنے میں ریاستی انتظامیہ اور پی اے سی کی مدد پر ان کا شکریہ ادا کیا۔



ہم نے چھ دسمبر کو اجودھیا میں کیا کچھ دیکھا سٹیزنس ٹریبونل میں دی گئی گواہیوں کی تلخیص

6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں بابری مسجد انہدام کے فوراً بعد بعض شخصیات اور حقوق انسانی کی تنظیموں کو آئین میں دیئے گئے انسانی حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں زبردست تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے بابری مسجد انہدام اور اس کے بعد رونما ہونے والے اہم واقعات کی جانچ اور چھان بین کے لئے سٹیزنس ٹریبونل قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس سوچ کے تحت کیا گیا کہ مرکز کی اس حکومت کے ذریعہ تشکیل دیا گیا انکوائری کمیشن سچائی کو بے نقاب نہیں کر سکے گا جو اجودھیا واقعات کے لئے خود ہی ذمہ دار ہے۔ کیونکہ یہ حکومت انہدام سے قبل کے کشیدہ ایام، انہدام کی گھناؤنی حرکت اور غنڈہ گردی اور انہدام کے بعد بھڑکے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں قدم اٹھانے میں ناکام رہی ہے۔

اس لئے باشعور شہریوں پر مشتمل ایک غیر سرکاری متوازی انکوائری کمیشن کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی گئی۔ تین سرکردہ سابق ججوں سے رابطہ قائم کیا گیا اور وہ سٹیزنس ٹریبونل میں اپنی خدمات پیش کرنے پر راضی ہو گئے۔ یہ تھے جسٹس او۔ چپار ریڈی، جسٹس ڈی اے ڈیاسی (دونوں سپریم کورٹ کے سابق جج) اور جسٹس ڈی ایس تیوتیا (سابق جج کلکتہ ہائی کورٹ)

جج حضرات نے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا۔ جس کے چیئرمین بہار حکومت کے سابق چیف سکریٹری کملا پرساد تھے۔ کنوینز کمل مترا چٹائے کو بنایا گیا۔ ان کے علاوہ جو ممبران تھے ان کے نام ہیں: کیرتی سنگھ، دیش موہن، سگاری چھا بڑا

اور سریش شکلا۔ انکوائری کمیشن نے 9 فروری سے 11 فروری 93ء تک اجودھیا اور فیض آباد کا دورہ کیا۔ اس نے 8، 12 اور 13 فروری کو لکھنؤ کا بھی دورہ کیا۔ کمیشن نے بابر مسجد انہدام سے متعلق تمام پہلوؤں کی جانچ کے لئے اجودھیا، فیض آباد اور لکھنؤ میں اساتذہ، وکلاء، صحافیوں، مذہبی رہنماؤں اور سیاسی پارٹیوں کے بعض عہدیداروں سے ملاقات کی اور ان کے خیالات جانے اور ثبوتوں کو اکٹھا کیا۔ کمیشن کے ممبران نے لکھنؤ اور فیض آباد میں ریاستی حکومت کے بعض اہم عہدیداروں سے بھی ملاقات کی۔ اس نے لکھنؤ اور دہلی میں عدالتی کیسوں سے بھی اطلاعات حاصل کیں۔ کمیشن کے ممبران نے 5 اور 6 دسمبر سے متعلق بعض انتہائی اہم ویڈیو کیسٹ دیکھے اور آڈیو کیسٹ سنے۔ ان میں سے بعض کیسٹ تو ایسے تھے جن تک عوام کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ ممبران نے اخباروں میں شائع تصاویر کی بھی چھان بین کی۔

کمیشن نے ریاستی اور مرکزی حکومت سے بھی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت کی مرکزی وزارت داخلہ نے یہ کہہ کر کوئی بھی اطلاع فراہم کرنے سے معذوری ظاہر کر دی کہ حکومت نے کمیشن آف انکوائری ایکٹ کے تحت جانچ کمیشن قائم کر دیا ہے۔ کمیشن نے گورنر، سابق وزیر اعلیٰ اور ریاستی حکومت کے دیگر عہدیداروں سے بھی حقائق معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کمیشن نے 9 ابواب پر مشتمل 133 صفحات کی اپنی رپورٹ تیار کی جو دہلی میں قائم ہونے والی سٹیزنس ٹریبونل کو پیش کی گئی۔ یہ ٹریبونل دہلی کے کانسی ٹیوشن کلب میں 6 سے 13 جولائی 93ء تک منعقد ہوئی تھی۔ جس میں شروع میں ذکر کئے گئے تین ججوں کے پینل کی معاونت کے جی کنا برن، اے جی نورانی اور لوتیکا سرکار نے کی۔ سکرٹریٹ کے ممبران تھے انورا دھا چنائے، اچن ونا نک، ای دین

دیالین، گوتم نولکھا، راجوڈ ملے، سونتر بنرجی اور تین بوس۔ ٹریبونل میں 63 شخصیات نے اپنی گواہیاں پیش کیں۔ جن میں بعض وہ صحافی بھی شامل تھے جن کو 6 دسمبر کو اجودھیا میں کارسیوکوں کی وحشت و بربریت کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ بعد میں ٹریبونل کی رپورٹ اور انکوائری کمیشن کی رپورٹ کو ایک ساتھ 327 صفحات پر مشتمل انگریزی میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

سٹیزنس ٹریبونل میں دی گئی گواہیوں کی تلخیص

”بی جے پی کے لیڈر ایل کے اڈوانی نے 6 دسمبر 92ء کو دن میں ڈھائی بجے بذریعہ ٹیلی فون اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ اپنے عہدے سے اس وقت تک مستعفی نہ ہوں جب تک کہ بابر مسجد مکمل طور پر منہدم نہ ہو جائے۔“ (شیلا سنگھ، ایڈیٹر جن مورچہ)

”مرکزی حکومت اس تلخ حقیقت سے آگاہ تھی کہ ۶ دسمبر کو بابر مسجد منہدم کر دی جائے گی اس کے باوجود اس نے کوئی احتیاطی قدم نہیں اٹھایا۔ مرکز کی غلط پالیسی کے نتیجے ہی میں بابر مسجد شہید ہوئی۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ بی جے پی اور کانگریس میں کوئی فرق نہیں ہے“ (حاجی محبوب احمد صدر انجمن محافظ مساجد و مقابر اجودھیا و فیض آباد)

”بابر مسجد کا انہدام پہلے سے طے شدہ ایک منصوبے کا حصہ تھا کیونکہ وشو ہندو پریشد کا ایک بااثر دھڑا یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مرکز، سپریم کورٹ یا کوئی بھی ادارہ ان کو ان کے مقاصد کی حصولیابی سے نہیں روک سکتا۔“ (سمن گپتا سینئر صحافی)

”مرکز نے کوئی قدم اٹھایا ہوتا تو مسجد نہیں ٹوٹی۔ مرکز تو وہی کر رہا تھا جو بی جے پی اس سے کروانا چاہتی تھی۔ صدر راج کے نفاذ کے بعد بھی ۶ اور ۷ دسمبر کو اجودھیا میں مسلمانوں کے مکانات لوٹے اور جلائے جاتے رہے۔“ (عبدالرؤف

اجودھیا کی ایک سرکردہ شخصیت)

”بابری مسجد انہدام کے لئے ایک طرف اگر سنگھ پر یوار ذمہ دار ہے تو دوسری طرف مرکزی حکومت اور قومی اخبارات بھی ذمہ دار ہیں۔“ (ایس پی سنگھ سینئر ہندی صحافی)

133 صفحات پر مشتمل انکوائری کمیشن کی رپورٹ میں بابری مسجد کے انہدام کے لئے مرکزی حکومت، ریاستی حکومت، بی جے پی صدر ایل کے اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، سادھوی رتمبھرا، وشو ہندو پریشد، اکھل بھارتیہ ودیار تھی پریشد، بجرنگ دل، اس وقت کے وزیراعظم نرسمہا راؤ، اس وقت کے یو پی کے گورنر ستیہ نرائن ریڈی، اجودھیا کے ضلع مجسٹریٹ اور قومی اخبارات تک کو ذمہ دار قرار دیا گیا اور واضح الفاظ میں کہا گیا کہ 6 دسمبر کو بابری مسجد اور مقامی مسلمانوں پر حملہ کے لئے منصوبہ بندی کے واضح شواہد موجود ہیں۔ یہاں تک کہ مقامی پولیس نے کئی دن پہلے 28 نومبر کو ہی اس قسم کے حملوں کے سلسلے میں خبردار کر دیا تھا۔ عوامی عدالت میں اجودھیا اور فیض آباد کے 38 افراد نے مسلسل دو دن تک اپنے بیانات دیئے۔

حاجی محبوب احمد نے جن کے والد بابری مسجد کے متولی تھے، عوامی عدالت میں پیش ہو کر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی بخنیہ ادھیڑ دی۔ انہوں نے سنگھ پر یوار اور پولیس فورس کی بھی نقاب کشائی کی اور ان کی مسلم دشمن سرگرمیوں کا کچا چٹھا پیش کیا۔ انہوں نے بیان میں کہا کہ بابری مسجد کے انہدام کے وقت وہ اجودھیا ہی میں تھے۔

انہوں نے جب صبح دس بجے وزیراعظم کو فون کر کے بابری مسجد کے متوقع انہدام سے باخبر کیا تو ان سے کہا گیا کہ وزیراعظم مصروف ہیں آپ موہن کمار منگلیم سے بات کریں۔ میں نے کمار منگلیم سے بذریعہ فون بات کی اور صورت حال سے

آگاہ کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ کچھ نہیں ہوگا مگر پونے بارہ بجے کارسیوکوں نے بابرئ مسجد کو منہدم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کارسیوکوں نے بابرئ مسجد کے علاوہ مزید 26 مسجدیں شہید کیں۔ ان کی فہرست بھی عدالت میں پیش کی گئی۔ دوسرے عینی شاہد عبدالرؤف نے کہا کہ بابرئ مسجد کے انہدام کے وقت اشوک سنگھل اور اوما بھارتی جیسے لیڈر انتہائی زہریلی اور اشتعال انگیز تقریریں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈھائی سو گز کی دوری پر واقع اپنے گھر سے میں نے یہ تقریریں سنی تھیں۔ بابرئ مسجد کا انہدام پونے بارہ بجے شروع ہوا اور پانچ بجے مسجد مکمل طور پر منہدم ہو گئی۔ وہاں پولیس بھی موجود تھی لیکن اس نے کارسیوکوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مسجد وہیں تعمیر کی جائے جہاں پہلے تھی۔

تیسرے گواہ عبدالعلیم نے بتایا کہ ۶ اور ۷ دسمبر کو اجودھیا کی صورت حال اتنی خراب تھی کہ وہاں کے مسلمانوں کے لیے اپنی جان بچا کر بھاگنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

چوتھے گواہ علاؤ الدین نے جو کہ چار قتل کا عینی شاہد تھا بتایا کہ پولیس فورس سے مسلمانوں کے تحفظ کی بہت فریاد کی گئی لیکن پولیس اور انتظامیہ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے بتایا کہ 6 اور ۷ دسمبر کو مسلمانوں کے 267 مکانات لوٹے اور جلائے گئے۔ ان کے علاوہ بھی کئی مسلمانوں نے گواہیاں پیش کیں ان میں ایسے بھی تھے جنہوں نے فرقہ پرستوں کے حملوں سے خود کو بڑی مشکل سے بچایا تھا۔ ان مسلمانوں نے بتایا کہ اس وقت بھی اجودھیا میں کشیدگی ہے اور عارضی رام مندر کے نزدیک واقع ایک مسجد میں اذان دینے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو اجودھیا پولیس نے ممنوع قرار دیدیا ہے۔ پولس نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس سے دوسروں کو پریشانی ہوتی ہے۔ اس پر مسلمانوں نے کہا کہ قریب کے غیر مسلموں سے دریافت کر لیں کیا واقعی انہیں پریشانی ہوتی ہے تو اس پر پولیس والوں نے کہا کہ انہیں اوپر

سے اس کا حکم ملا ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ آج بھی ان کی شکایات نہیں سنی جا رہی ہیں۔ گذشتہ 27 جون کو اس وقت کے گورنر موتی لال وورا نے اجودھیا کا دورہ کیا تھا، اس موقع پر انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر پابندی کی شکایت پر غور کیا جائے گا مگر ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے۔ اس کے ساتھ مسجدوں، درگاہوں اور مسلمانوں کے مکانوں کی مرمت پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ انہیں نقشہ پاس کرنے کا بہانہ بنا کر تعمیرات سے روک دیا گیا ہے۔ ان کے پٹوں کی تجدید بھی نہیں کی جا رہی ہے اور بہت سے مسلمانوں کی زمینیں ان ہندوؤں کو بطور معاوضہ دیدی گئی ہیں جن کی زمین حکومت نے تحویل میں لے لی ہے۔ ان مسلمانوں نے یہ بھی بتایا کہ کئی بار تو اجودھیا قصبہ کے ایک پرانے قبرستان میں مسلمانوں کو اپنے مردوں کی تدفین کے لئے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ ”زمین جھگڑے میں ہے۔“ اکرام اور رضوان نے بتایا کہ حکومت اور انتظامیہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ اجودھیا چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ بہت سے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مکانوں کی نشاندہی کی اور کارسیوکوں نے انہیں لوٹ کر پھونک دیا لیکن ایسی بھی مثالیں ہیں کہ کئی ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں اور انہیں کارسیوکوں کے حملوں سے بچایا۔

فیض آباد سے شائع ہونے والے ہندی اخبار ”جن مور چہ“ کے ایڈیٹر شیلا سنگھ نے اپنے بیان سے بی جے پی اور اس کے لیڈروں کی منصوبہ بندی پر روشنی ڈالی۔ ان کے اس بیان پر بی جے پی میں زبردست بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی کہ اڈوانی نے کلیان سنگھ سے کہا تھا کہ جب تک بابر مسجد پوری طرح گرنے جائے وہ مستعفی نہ ہوں۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ ٹیلی فونک گفتگو ایک ٹیلی فون آپریٹر نے سنی تھی۔

پجاری لال داس نے اپنی گواہی میں کارسیوکوں کی ہنگامہ آرائی کا تذکرہ

کرتے ہوئے کہا کہ 6 دسمبر کی صبح اشوک سنگھل کے حکم سے رام مندر میں رکھا خزانہ، سونے چاندی کے زیورات، سنگھاسن اور 64 مورتیاں چرائی گئیں، مرکزی وزیر داخلہ نے جھوٹا بیان دے کر وشو ہندو پریشد کے لیڈروں کو بچایا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ لوٹ مار کے وقت کارسیوکوں نے سر پر بندھا ہوا بھگواپٹہ ہٹا دیا تھا۔ اجودھیا سے آئے ہوئے اتم شرما اسٹنٹ ایڈیٹر رام جنم بھومی، جنگل کشور شاستری ایڈیٹر رام جنم بھومی، مہنت رام چندر آچاریہ، مینواروڑار پورٹر گانڈیو اور مدھوریماشرا ایڈوکیٹ اور سوشل ورکر نے عوامی عدالت کے سامنے بیانات دیئے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ 6 دسمبر کو کارسیوک دو حصوں میں منقسم ہو گئے تھے: ایک حصہ نے بابر مسجد کو منہدم کرنے کا کام کیا اور دوسرا مسلمانوں کے مکانوں کو لوٹنے اور تباہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

اجودھیا میں کارسیوکوں کے ہاتھوں پٹنے والے ہندی اور انگریزی کے صحافیوں نے بھی گواہیاں پیش کیں۔ ان میں معروف ہندی صحافی اور نو بھارت ٹائمز کے سابق ایگزیکٹو ایڈیٹر ایس پی سنگھ، فری لانسر شکھاتر ویدی، بزنس انڈیا کی نمائندہ روچرا گپتا، بزنس انڈیا کے فوٹو گرافر دیون مہرا، سنڈے آبزور کی نمائندہ ریتا منچندا، پانیئر کے فوٹو گرافر پروین جین، بی بی سی لندن کے نمائندے مارک ٹلی اور ہندی صحافی منی مالانے بھی شہادتیں پیش کیں۔ مارک ٹلی نے اس پر روشنی ڈالی کہ کس طرح بابر مسجد منہدم کی گئی تھی اور کس طرح صحافیوں کو مار مارا بھگایا جا رہا تھا۔

آٹھ دن تک چلنے والی عوامی عدالت میں جہاں حکومت کی نااہلی اور پولیس فورس کی فرقہ واریت پر کھل کر بحث ہوئی وہیں قومی اخبارات خصوصاً ہندی کے اخبارات کی فرقہ پرستی بھی واضح طور پر سامنے آئی۔ ایس پی سنگھ اور منی مالانے ہندی اخبارات کی فرقہ پرستی کو اس طرح بے نقاب کیا کہ حج حضرات بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔

روحہ اگپتا اور شکھاتر ویدی نے بتایا کہ 5 دسمبر کو بی جے پی کے ممبر پارلیمنٹ بی۔ ایل شرما پریم کی سرکردگی میں بابر مسجد کے انہدام کی ریسرسل کی گئی جو ہتھیار اور اوزار اس میں استعمال کئے گئے تھے وہی اگلے دن بابر مسجد کے انہدام میں استعمال ہوئے۔ ان دونوں نے یہ بھی بتایا کہ پولیس والے سامنے تماشہ دیکھتے رہے لیکن کارسیوکوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

ان کے علاوہ معروف قانون داں اور انگریزی کالم نویس اے۔ جی نورانی، اقبال مسعود، بی ایس ایف کے ریٹائرڈ افسر پدم روشا، ممبر پارلیمنٹ اندرجیت گپتا، پلاننگ کمیشن کے سابق رکن پروفیسر رجنی کوٹھاری، ساپر دایکٹا ورودی آندولن کی محترمہ تندنی بکسر، امور خارجہ کے ماہر اے، کے دامودرن، مجلس لیگل سینٹر ممبئی کی محترمہ نیرا ادھر کر، سماجی تنظیموں سے وابستہ جی۔ چودھری اور خواتین کی تنظیم ”سہیلی“ کی نمائندہ محترمہ کلپنا کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے فرقہ واریت، اس کے پھیلاؤ اور اس کے سدباب پر روشنی ڈالی۔

سیٹرنس ٹریوئل کی جانب سے مرکزی حکومت بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل وغیرہ کو بھی حاضر ہونے کا نوٹس دیا گیا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔



رام کی جے بولنے والوں نے رام کے آدرشوں پر کالکھ پوت دی

رام کی جے بولنے والے دھوکے باز انہدام کاروں نے مریدا پور شوم رام کے رگھوکل کی ریت پر اجودھیا میں کالکھ پوت دی۔

ہندو عقیدہ میں یقین رکھنے والے لوگوں کا دل آج دکھ سے بھرا اور سر شرم سے جھکا ہوا ہے۔ اجودھیا میں جو لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہیں وہ بابر کی مسجد کی متنازع عمارت کو ڈھانا ہندو جذبات کا دھماکہ بتا رہے ہیں وہ اگرچہ خود کو سادھو سادھوی، سنت مہاتما اور ہندو مفادات کا محافظ کہتے ہوں، ان میں اور اندرا گاندھی کے قتل کی خبر پر برطانیہ میں تلوار نکال کر خوشی سے رقص کرنے والے لوگوں کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک غیر مسلح خاتون کے اپنے محافظوں کے ذریعے قتل پر رقص فتح جتنا راکش ہے اس سے کم لائق مذمت، شرمناک اور غیر مذہبی کام ایک عبادت گاہ کو منہدم کرنا نہیں ہے۔ وہ مذہبی مقام بابر کی مسجد بھی تھا اور رام کا مندر بھی۔ ایسی عمارت کو دھواں گھات سے گرا کر جو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ رام کا مندر بنائیں گے وہ دراصل رام کو نہ مانتے ہیں نہ جانتے ہیں اور نہ ہی سمجھتے ہیں۔

رام کے خاندان کی ریت ہے۔ پران جانی پروچن نہ جانی۔ اتر پردیش کی بی جے پی حکومت، بی جے پی، دھو ہندو پریشد اور آریس ایس نے سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور ملک کے عوام کو وچن دیا تھا ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ متنازع عمارت کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔ لیکن کل اجودھیا میں سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور ملک کو دھوکہ

دیا گیا۔ یہ کہنا کہ یہ ہندو جذبات کا دھماکہ اور ابھارتھا، دروغ گوئی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس طرح عمارت کو منہدم کیا گیا وہ جذبات کے اچانک پھوٹ پڑنے کا نہیں سوچ سمجھ کر سازش کا ثبوت ہے۔ وہاں بی جے پی ہی کے نہیں آ رالیں ایس کے لیڈران بھی موجود تھے۔ وہ سادھو مہاتما بھی وہاں تھے جنہیں مارگ در شک منڈل (سچی راہ دکھانے والا طبقہ) کہا جاتا ہے۔ ہندو پریشد، بی جے پی اور آ رالیں ایس کو اپنے نظم و ضبط کے پابند کار سیوکوں اور سویم سیوکوں پر بہت فخر ہے۔ لیکن وہ سب دیکھتے رہے اور عمارت کو منہدم کر دیا گیا۔ انہدام کے وقت وہاں سے رام کی مورتیوں کو ہٹانا اور پھر لا کر وہاں نصب کر دینا بھی اس کا ثبوت ہے کہ جو ہوا وہ اسکیم کے مطابق ہوا ہے۔ بی جے پی حکومت کی انتظامیہ اور پولیس کا کچھ بھی نہ کرنا کلیان حکومت کا اس سازش میں شامل ہونے کا ثبوت ہے۔

کلیان سنگھ نے پہلے استعفا دیا پھر مرکزی حکومت نے انہیں برطرف کر کے یوپی میں صدر راج نافذ کر دیا۔ بی جے پی کی ایک حکومت نے بتا دیا کہ وہ عوامی مینڈیٹ پر کیسے عمل کرتی ہے۔ اس میں نہ اصولی اخلاص ہے اور نہ ہی آئین و انتظامی ذمے داری نبھانے کی طاقت۔ وہ انتہا پسندوں کے ہاتھوں کا کھلونہ بن گئی تھی اور سازش رچنے والوں نے اس کا استعمال عمارت کے انہدام تک کیا۔ وہ ڈیڑھ سال سے کلیان حکومت کو مندر تعمیر کی راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔

مرکزی حکومت نے صدر راج ضرور لگا دیا لیکن اتنے مہینوں سے وہ یوپی حکومت اور بی جے پی پر اس کی ذمے داری ڈالنے کے سیاسی کھیل میں مصروف تھی۔ اب ایسے حالات اس کے سامنے ہیں کہ اجودھیا میں دو تین لاکھ لوگ یکجا ہیں۔ پولس اور مسلح دلتوں کو وہاں تک رسائی میں رکاوٹیں ہیں۔ جو ٹکراؤ کو ٹالنا چاہتی ہے اب اس میں گلے گلے تک ڈوب گئی ہے۔ عمارت کے تحفظ اور ایک اور سپریم

کورٹ کے حکم کے احترام کی مرکزی حکومت کی بھی اتنی ہی ذمہ داری تھی جتنی کہ یوپی حکومت کی۔ کیا مرکز نے ایک ریاست کی منتخب حکومت پر اعتماد کر کے غلطی نہیں کی۔ کیا اسے آئین کے تحفظ کے لیے غیر آئینی قدم اٹھانے چاہئیں تھے، ان سوالوں کے جواب آسان نہیں ہوں گے۔ لیکن تاریخ میں وہ کوئی موثر حکومت نہیں مانی جائے گی۔ ملک کے عوام اب مرکزی حکومت کو بھی نہیں بخشیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ تمام سیاسی پارٹیوں نے اجودھیا معاملے کو الجھایا ہے سبھی نے اس کا استعمال کیا ہے اور کل جو کچھ ہوا اس میں اس سیاست کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن رام مندر کی تعمیر کی تحریک و شوہندو پریشد چلا رہی تھی۔ سنگھ پر یوار اس بات کو جانتا ہے کہ بھرتنگ دل اور شیو سینا کے لوگ کیا کر سکتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا اور انہیں بڑی تعداد میں اجودھیا میں اکٹھا کیا سیاسی پارٹیوں کے کھیل تو سب جانتے ہیں۔ آپ کانگریس اور بی جے پی کو سیاسی پارٹیوں کی طرح برا بھلا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن سنگھ پر یوار کو کیا کہیں گے جس نے دھرم اور سماج کے لیے یہ شرمناک اور سیاہ دن آنے دیا۔ ملک کا وسیع ہندو سماج آرائیں ایس اور ہندو پریشد کے کارکنوں سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ وہ سماج اجودھیا میں جو ہوا اس پر شرمندہ ہے اور کس کو کیسے بچانا ہے یہ اسے پتا ہے۔ وہ ہندو سماج پوچھے گا کہ رام کا مندر رام کا وچن توڑ کر، دھوکہ فریب اور انتقام کی بنیاد پر تعمیر کرو گے؟ اور جو کہے گا کہ ہاں، تو اس سے یہ سماج پوچھے گا کہ کیا یہی ہندو دھرم ہے۔

یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کارسیوا کے نام پر عمارت اس لیے منہدم ہوئی کہ اچانک بھڑکے جذبات کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔ ملائم سنگھ کی مانند اجودھیا جانے پر کسی نے پابندی نہیں لگائی تھی۔ سپریم کورٹ نے کارسیوا کی اجازت دی تھی۔ جس الہ آباد ہائی کورٹ پر فیصلے کو معلق رکھنے کا الزام ہے وہ پانچ روز بعد تحویل شدہ زمین پر فیصلہ سنانے والا تھا۔ اس وقت تک کارسیوا ٹھیک طرح سے چلے، اس بات کو یقینی بنانے

کی کوئی کوشش مرکز نے نہیں کی۔ یوپی حکومت نے پولیس کی تعیناتی اتنی کم کر دی تھی کہ اسے دیکھ کر کسی کے مشتعل ہونے کا امکان نہیں تھا۔ کارسیوا کی راہ میں جن رکاوٹوں کی بات بی جے پی اور ہندو پریشد والے کرتے تھے انہیں پوری طرح ہٹا دیا گیا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ 'غلامی کی اس علامت' کو ان لوگوں نے پہلی بار دیکھا تھا اور ایک دم بھڑک اٹھے۔ وہ عمارت وہاں ساڑھے چار سو سال سے موجود تھی اور اس میں 43 سال سے رام کی مورتی موجود تھی اور وہاں پوجا وغیرہ پر پابندی نہیں تھی۔ پھر اسے گرانے اور اس طرح گرانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں مرکز نے ٹکراؤ مول لیا ہو۔ لوگوں کو بھڑکایا ہو۔ لیکن مرکز کل دہلی میں سات گھنٹے تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا اور نام نہاد کارسیوا کوں نے اپنے لیڈروں کی موجودگی میں انتہا پسندانہ کام کر ڈالا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہیں مشتعل کیا گیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ جذبات کا اچانک دھماکہ تھا۔ دراصل وہ زبردستی اور سوچ سمجھ کر کیا گیا پاپ ہے۔ اس میں جو دھوکہ اور فریب ہے، اس سے صرف جمہوریت اور آئین کو ہی چیلنج نہیں کیا گیا، سنگھ پر یو آر کو فیشن اسیبل سیکولرزم کی فکر نہ بھی ہو تو کم از کم اس سماج کی روایات، وعدے کی پابندی اور معتبریت کی فکر تو کرنی ہی چاہئے جسے وہ دنیا کا سب سے بڑا مہذب اور ترقی یافتہ سماج کہتا ہے۔ اس کے بعد ہم سکھ دہشت گردوں کا، مذہب کی آڑ میں چلتے خالصتان اور جموں و کشمیر میں مسلم دہشت گردوں کے آزادی کے جہاد کا کیا جواب دیں گے۔ جو مانتے ہیں کہ عمارت کو منہدم کر کے وہ ہندو تو کی بنیاد رکھ رہے ہیں، وہ جلد ہی دیکھیں گے کہ ہندو سماج انہیں کہاں پہنچاتا ہے۔ انتقام کے جذبے سے لرزتے رد عمل میں یقین رکھنے والے بزدلوں کے علاوہ کسی ہندو دل و دماغ نے کیا اس انہدام کی حمایت کی ہے؟

(پر بھاش جوشی)

7 دسمبر 92 کو ہندی روزنامہ جن ستہ میں شائع ادارہ (

انہدام کے بعد اس وقت کے وزیر داخلہ کی دروغ بیانی

ہریندر بویجہ

بابری مسجد کے انہدام پر وزیراعظم اور مرکزی وزیر داخلہ ایس بی چوان بار بار کہہ رہے تھے کہ بی جے پی و شوہندو پریشن اور آرائس ایس نے ہمیں اور ملک کو دھوکہ دیا ہے، فریب دیا ہے۔ بابری مسجد کے تحفظ کا وعدہ کرتے رہے اور مسجد گرا دی گئی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وزیراعظم اور وزیر داخلہ نے ملک کو اور مسلمانوں کو فریب دیا ہے، دھوکہ دیا ہے۔ انڈیا ٹوڈے کے نمائندہ ہریندر بویجہ کا کہنا ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کے اصل ذمہ دار ایس، بی چوان ہیں۔ پیش ہے ان کا مضمون)

ملک کے انتہائی اہم سیاسی وزیر نے ۵ دسمبر کو اپنی رہائش گاہ جانے سے قبل اپنے دفتر کے سینئر افسران سے کہا تھا کہ ”کل ایودھیا میں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے بی جے پی کے بھجن گانے کا انتظام کر دیا ہے۔“ دوسرے دن جب بابری مسجد مسمار کی جارہی تھی تو چوان صاحب اپنی رہائش گاہ کے پوجا گھر میں مقید تھے۔ سینئر پولیس افسران اور وزارت کے افسران اس انتظار میں تھے کہ اب منسٹر صاحب ان لوگوں کو بلائیں گے اور حالات پر تبادلہ خیال کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کے ۳۶ گھنٹے کے بعد فیض آباد اور ایودھیا میں نیم مسلح دستوں کی ۱۹ کمپنیاں کارسیوکوں کو ہٹانے کے لئے تعینات کی گئیں۔ حالانکہ ابھی چند دنوں پیشتر وزیر داخلہ نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا تھا کہ فیض آباد میں تعینات ریپڈ ایکشن فورس کو ۸ منٹ کی

نوٹس پر بلایا جاسکتا ہے اور حالات کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

بابری مسجد، انہدام کے اگلے دن ایس، بی چوان نے کہا کہ ”یہ تو آپسی اعتماد کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ہمیں بی جے پی، پریشد اور آ ر ایس ایس نے دھوکا دیا ہے۔“ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایس بی چوان وہ شخص ہیں جنہوں نے ملک اور خفیہ ایجنسیوں کو فریب دیا ہے۔ اپنی تمام رپورٹوں میں خفیہ ایجنسیوں نے لکھا تھا کہ کارسیوک انتہائی خونخوار موڈ میں ہیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ مسجد کو مسمار کر دیں گے کیوں کہ وہ اس کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ لیکن چوان یو پی حکومت کی عدالت کو دی گئی یقین دہانی پر مطمئن رہے۔ ایودھیا معاملے کو غلط طریقے سے ڈیل کرنے کی وجہ سے اگر یہ کہا جائے کہ ایس بی چوان ایک غلط آدمی ہیں اور غلط جگہ پر پہنچ گئے ہیں، تو بیجا نہ ہوگا۔

خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں کو نظر انداز کرنا چوان صاحب کا بہت بڑا جرم ہے اب وہ کہہ رہے ہیں کہ رپورٹوں میں اس کی قیاس آرائی بھی نہیں کی گئی تھی کہ بابری مسجد کو گرایا جاسکتا ہے۔ لیکن وزارت داخلہ کے ایک افسر کا کہنا ہے کہ ”انہدام کی رپورٹ دینے والی رپورٹوں پر چوان کوئی ایکشن نہیں لینا چاہتے تھے۔“ پارلیمنٹ میں اس یقین دہانی کے باوجود کہ اگر ضرورت پڑی تو دفعہ ۳۵۵ کا استعمال کرتے ہوئے یو پی حکومت سے مشورہ کئے بغیر نیم مسلح دستوں سے کام لیا جائے گا، انھوں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا اور جب اشد ضرورت تھی تب بھی سرد مہری سے کام لیا۔ جب حزب اختلاف کے لیڈروں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ تو ان کا جواب تھا کہ معاملہ بہت واضح ہے اسے حکومت پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ معاملے کو مناسب انداز میں طے کرے۔

وزیراعظم نرسمہا راؤ کی مانند وزیر داخلہ چوان بھی اس کے قصور وار ہیں کہ انھوں نے فورس کا استعمال کیوں نہیں کیا۔ جب راجیہ سبھا میں ممبران پارلیمنٹ نے

چوان سے کہا کہ اڈوانی کہہ رہے ہیں کہ کارسیوا اینٹ اور گینتی سے کی جائے گی تو ان کا جواب تھا کہ میں نے اس مسئلے پر اڈوانی سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ میں لوگوں کے بیانوں پر انحصار کر کے کوئی ایکشن لینا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ایسی صورت میں ایک ذمہ دار حکومت کی حیثیت سے ہم اپنی حدود سے تجاوز کر جائیں گے۔

”ذمہ دار وزیر“ نے اس سلسلے میں صرف ایک کام کیا کہ کلیان سنگھ کے نام احتجاجی خطوط روانہ کئے۔ ایک طرف وہ یہ کہتے رہے کہ رپورٹوں میں انہدام کی کوئی قیاس آرائی نہیں کی گئی تھی۔ دوسری طرف آخری خط سے جو دور درشن پر نشر کیا گیا یہ واضح ہوتا تھا کہ مسجد کے انہدام کے امکانات تھے۔ کلیان سنگھ سے انہوں نے کہا تھا کہ بہت سے کارسیوک حملہ کرنے کے لئے ترشول خرید رہے ہیں اس لئے وہ سیکورٹی کے انتظامات خود دیکھیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کارسیوک بابر مسجد کے آس پاس جمع ہو رہے ہیں اور انہوں نے حفاظتی باڑ کو توڑ دیا ہے۔ وزارت کے سینئر افسران نے مسجد کے بارے میں چوان کے جھوٹ کی قلعی کھولی اور مندروں کے بارے میں بھی ان کی دروغ گوئی کا پردہ فاش کیا اور کہا کہ انہوں نے یہ غلط بیانی بھی کی کہ کہیں بھی کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچا ہے جب کہ اخبارات میں ایسی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔

ان حادثات کے بعد پریشان حال چوان نے اخبار والوں سے ملنے سے انکار کر دیا اور حزب اختلاف کے لیڈروں کے اس مطالبے کو مسترد کر دیا کہ چوان استعفیٰ دے دیں۔ بہر حال اس وقت چوان بہت مطمئن ہیں اور انہیں یہ اندازہ ہے کہ نرسمہا راؤ انہیں برطرف نہیں کر سکتے کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اس سے ان کی ناکامی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایسی صورت حال میں چوان کو کرسی پر رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

باب پنجم

تاریخ کی گواہی

بابری مسجد کا قضیہ تاریخ کے آئینے میں

1517 عیسوی: بابر کی ہندوستان آمد، لیکن اس کے تاریخی ثبوت نہیں ملتے کہ وہ کبھی اجودھیا گیا تھا۔

1528ء: بابر کے ایک سپہ سالار میر باقی نے ایک ایسے مقام پر مسجد تعمیر کی جو ہندوؤں کے مطابق رام کی جائے پیدائش تھی۔ مگر قدیم اور عہد وسطیٰ کے تاریخی ناقد اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

1534 تا 1623ء: تلسی داس نے رام چتر مانس لکھی جس میں رام چندر جی کی منقبت ملتی ہے، مگر اس میں بھی بابری مسجد کو جنم بھومی نہیں بتایا گیا ہے۔
1759-60ء: راج چتر من نے چہار گلشن میں پہلی مرتبہ موجودہ اجودھیا کو رام چندر جی کی ممکنہ جائے پیدائش لکھا ہے تاہم انھوں نے بھی بابری مسجد سے اس کے رشتے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

1788 عیسوی میں پہلی مرتبہ ایک 'عیسائی پادری' جوزف تفن تھلر نے یہ شوشہ چھوڑا کہ رام چندر جی کی جائے پیدائش اسی مقام پر ہو سکتی ہے جہاں اس وقت بابری مسجد کھڑی ہے لیکن اس کی طرف سے اس کے حق میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔

1853ء: اجودھیا کے پہلے مذہبی فسادات۔

1859ء: برطانوی نوآبادیاتی حکومت کی جانب سے عبادت کی جگہ کی تقسیم کردی

گئی۔

1949ء: مسجد کے اندر سے رام کی مورتی نصب کر دی گئی حکومت نے متنازعہ مقام قرار دے کر مسجد بند کروادی۔

1950ء: ضلع فیض آباد کے مجسٹریٹ کے کے نار نے فوجداری کی دفعہ 145 کے تحت مسجد بند کر دی اور اجودھیا میونسپل کارپوریشن کو اس کا ریسور بنا دیا۔

1984ء: وشو ہندو پریشد کی جانب سے 'رام' کی جائے پیدائش کو آزاد کروانے کے لئے تحریک کا اعلان۔ بی جے پی کے رہنما لال کرشن اڈوانی نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی۔

1986ء: ضلعی عدالت کی جانب سے ہندوؤں کو متنازعہ مقام پر پوجا کی اجازت۔ مسلمانوں کی جانب سے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا قیام۔

1989ء: وشو ہندو پریشد نے مسجد سے ملحقہ زمین پر رام مندر کی بنیاد رکھی دی۔

1990ء: وشو ہندو پریشد کے حامیوں نے مسجد کو جزوی طور پر نقصان پہنچایا وزیراعظم کی جانب سے مسئلے کے حل کی کوشش۔

1991ء: ریاست اتر پردیش میں بی جے پی حکومت کا قیام۔

15 اگست 1992ء: وزیراعظم نرسمہا راؤ نے لال قلعہ دہلی سے اعلان کیا کہ بابری مسجد کو نقصان پہنچائے بغیر ہم رام مندر کی تعمیر کے حق میں ہیں۔

3 اکتوبر 1992ء: وشو ہندو پریشد اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں مذاکرات کا دوبارہ آغاز ہوا، وشو ہندو پریشد کے دھرم سند نے 6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں کارسیوا کرنے کا اعلان کیا۔

8 نومبر 1992ء: بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے درمیان بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

23 نومبر 1992ء: قومی یک جہتی کونسل نے قرارداد پاس کر کے وزیراعظم کو ہر

ضروری قدم قانون کے وقار و بالادستی کے لئے اٹھانے کا اختیار دے دیا۔

27 نومبر 1992ء: اجودھیا میں مرکزی فورس بھیجی گئی۔

28 نومبر 1992ء: سپریم کورٹ نے یو پی سرکار کی اس یقین دہانی کو تسلیم کر لیا کہ متنازعہ جگہ پر کوئی تعمیراتی کام نہیں ہوگا۔

28 نومبر 1992ء: اسی دن بی، جے، پی کے لیڈ رائل کے اڈوانی نے زور دیا کہ سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود مندر کی تعمیر کا کام جاری رہے گا۔

29 نومبر 1992ء: سپریم کورٹ کی ہدایت پر مراد آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اجودھیا میں مشاہد (Observer) مقرر کیا گیا۔

4 دسمبر 1992ء: تقریباً دو لاکھ کارسیوک اجودھیا پہنچ گئے۔

5 دسمبر 1992ء: (گیارہ بجے صبح) سنتوں اور مہنتوں کے مارگ در شک منڈل نے منصوبہ بند کارسیوک کے لیے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

(بارہ بجے دوپہر) متنازعہ اراضی کے نزدیک عوامی جلسہ میں دو کارسیوکوں کو بلایا گیا کہ وہ بتائیں کہ گذشتہ دو ماہ سے ان کو کس طرح کی تربیت (Training) دی جا رہی ہے۔ جلسہ کے اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ کارسیوکوں (Volunteers) کے سربراہ واقف ہیں کہ کون تربیت یافتہ افراد ہیں اور ان کو کس کام کے لیے تربیت دی گئی ہے۔

(دو بجے دوپہر) VHP کے Spokesperson شکر اگنی ہوتری نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ کارسیوک منصوبہ کے مطابق سب سے پہلے جولائی میں تعمیر کئے گئے رام چبوترہ کی صفائی کریں گے اور ضروری محسوس ہوا تو مزید تعمیر کا کام ہوگا۔

(ڈھائی بجے دوپہر سے ساڑھے پانچ تک) متنازعہ اراضی کے قریب ایک پہاڑی مقام رام کتھانج میں 500 تربیت یافتہ کارسیوکوں نے ریہرسل کیا۔ اس

ریہرسل میں یہ بھی شامل تھا کہ کس طرح مسجد کے گنبد پر چڑھائی کرنا ہے اور گنبد کو زمین بوس کر دینا ہے۔

(پانچ بجے شام) VHP کے جنرل سیکریٹری اشوک سنگھل نے کارسیوکوں کے کیمپ کا دورہ کیا اور ان سے ملاقات کر کے مخصوص ہدایات دیں۔

(سات بجے شام) بی، جے، پی کے لیڈر ایل کے اڈوانی کو لکھنؤ میں ہدایت کی گئی کہ وہ 5 دسمبر کی شب میں یا 6 دسمبر کو ہر حال میں اجودھیا پہنچ جائیں۔

(گیارہ بجے رات) اڈوانی فیض آباد پہنچ گئے اور اجودھیا کے لئے کوچ کیا۔ اجودھیا میں اڈوانی نے اشوک سنگھل کے علاوہ دیگر لیڈروں سے رابطہ قائم کیا۔

6 دسمبر 1992ء: (آٹھ بجے صبح) ورنے کٹیار کی رہائش گاہ پر ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں شیو سینا پارلیمنٹری پارٹی کے سربراہ موریشور ساوے، بھرننگ دل کے سربراہ اور ایم، پی ورنے کٹیار اور اڈوانی کی شرکت ہوئی۔

(سوا آٹھ بجے صبح) 2.77، ایکڑ اراضی کی نشاندہی کے لیے لگائے گئے لوہے کے ہال کو R.S.S کے رضا کاروں نے آگے بڑھا دیا تاکہ متنازعہ اراضی تنگ ہو جائے۔

(نوبے صبح) R.S.S کے مزید رضا کار 2.77، ایکڑ اراضی پر پہنچ گئے اور PAC کے تعاون سے ایک حفاظتی گھیرا بنا دیا تاکہ دوسرے لوگ اندر داخل نہ ہو سکیں۔ (سوا دس بجے) اڈوانی اور بی جے پی کے صدر ملی منوہر جوشی اجودھیا سائٹ پر پہنچ گئے۔ اس وقت تمام کارسیوکوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ اور کم سے کم 20 منٹ کے لیے حفاظتی گھیرا ختم کرنے کی مانگ کی تاکہ وہ بابر مسجد تک پہنچ سکیں۔ اس کوشش میں بہت سے کارسیوک گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم RSS کے رضا کاروں نے چند کارسیوکوں کو روکنے کی کوشش کی۔

(ساڑھے دس بجے صبح سے ساڑھے گیارہ بجے تک) سیکڑوں کارسیوک پولیس کے گھیرے

کو توڑنے میں کامیاب ہوئے اور بابرئ مسجد کی طرف کوچ کر گئے۔
(صبح گیارہ بجکر پینتیس منٹ) سنتوں اور مہنتوں کی پوجا 2.774، ایکڑ اراضی پر شروع ہو گئی۔

(گیارہ پینتیس سے گیارہ پچاس بجے صبح تک) ہزاروں کارسیوک حفاظتی گھیرا توڑ کر 2.774، متنازعہ اراضی میں داخل ہو گئے اور اسی وقت CRPF پر بھی کارسیوکوں نے حملہ کر دیا اور شدید پتھراؤ کیا۔

(صبح گیارہ بجکر پچاس منٹ) پہلا کارسیوک بابرئ مسجد کے دہنی گنبد پر چڑھ گیا۔ اور جے شری رام کی آواز سے فضا مشتعل ہو گئی۔

(صبح گیارہ بجکر اکاون منٹ) بہت سے کارسیوک بابرئ مسجد کے گنبدوں پر چڑھ گئے اور CRPF پر شدید پتھراؤ ہونے لگا۔

(گیارہ پچپن) ہزاروں کارسیوکوں نے بابرئ مسجد پر حملہ کر دیا۔ اس کی ریلنگ کو توڑ دیا اور ہر طرف سے بابرئ مسجد کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

(دوپہر بارہ بجکر دس منٹ) اوما بھارتی کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ بابرئ مسجد سے تمام کارسیوک اتر جائیں لیکن کسی نے پروا نہ کی۔

(ڈیڑھ بجے دوپہر) فیض آباد سے ریپڈ ایکشن فورس (RAF) کی چار بٹالین نے اجودھیا کے لئے کوچ کیا۔ اگرچہ جگہ جگہ سڑکوں پر کارسیوکوں نے مزاحمت کی لیکن RAF ساکیت ڈگری کالج تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جو متنازعہ جگہ سے مشکل سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(دو بجے دوپہر) فیض آباد ضلع مجسٹریٹ رابندر ناتھ سری واستو کی طرف سے RAF بٹالین کے کمانڈر کو وائرلیس پیغام موصول ہوا کہ صورت حال قابو میں ہے۔ لہذا مزید مرکزی فورسز کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کمانڈروں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ فی الفور فیض آباد لوٹ آئیں تاکہ محفوظ رہ سکیں۔ بٹالین فیض آباد

کے لیے کوچ کر گئی۔

(دوپہن دوپہر) بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہو رہی تھی اور مسجد کا بایاں گنبد گرا دیا گیا۔

(تین بجکر پانچ منٹ دوپہر) دایاں گنبد بھی منہدم کر دیا گیا۔

(تین بجکر پندرہ منٹ دوپہر) اڈوانی نے لاؤڈ اسپیکر کی آواز سنی کہ کارسیوک اپنے ساتھیوں کو جلد سے جلد کارروائی ختم کرنے کے لئے مشتعل کر رہے تھے اور متنبہ کر رہے تھے کہ کام فی الفور انجام پذیر کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ مرکزی فورس پہنچ کر ان کی اس انہدامی کارروائی پر اثر انداز ہو جائے۔

(چار بجکر پچاس منٹ شام) بابری مسجد کا مرکزی گنبد بھی زمین بوس کر دیا گیا۔

(چھ بجکر دس منٹ شام) بابری مسجد کی علامت بھی برقرار نہ تھی سوائے ملبہ کے۔ بابری مسجد مکمل طور پر شہید ہو چکی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(چھ بجکر پینتیس منٹ شام) بابری مسجد کے انہدام کے دوران لام لالا کی مورتی مسجد کے اندر سے ہٹالی گئی تھی۔ اب مورتی پھر سے مسجد کے اندر اس جگہ کھڑی کر دی گئی جہاں پر اس سے قبل رکھی گئی تھی۔

(سات سے گیارہ بجے رات) سات بجے شام سے گیارہ بجے شب کے درمیان مسجد کی عمارت کے تمام ملبے کو صاف کر دیا گیا اور ہر طرف پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ دریں اثنا مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں پر حملے بھی جاری رکھے گئے۔

(ایک بجے رات) رات کو ایک بجے رام کی مورتی کو صحیح ڈھنگ سے مسجد کے مقام پر نصب کیا گیا اور اس کے چاروں اطراف میں زعفرانی رنگ کے کپڑے تان دیئے گئے۔ یہ کام اشوک سنگھل، ورنے کٹیار، آچاریہ دھرمیندر اور آچاریہ وام دیو کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔

6 دسمبر 1992: پہلی دو FIR بابری مسجد انہدام کے دن ”رام جنم بھومی پولیس

تھانے“ میں درج کی گئی۔ ایک FIR نہتے کارسیوکوں اور 198 FIR لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، اشوک سنگھل، اور چار دیگر افراد کے خلاف تھی۔ بابری مسجد شہادت کے بعد کلیان سنگھ کی حکومت برخاست اور یو۔ پی۔ میں صدر راج نافذ۔

7 دسمبر 1992: پورے ملک میں قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خون خرابہ کا طوفان اربوں روپے کی املاک تباہ، ہزاروں مسلمانوں کی جانیں گئیں، سیکڑوں مکانات، کارخانے، دکانیں نذر آتش کر دی گئیں۔ فسادات کا سلسلہ ۲۰ جنوری 1993 تک جاری رہا۔

اجودھیا میں ایک سو سے زائد مسلمانوں کے مکانات اور دکانیں نذر آتش کی گئیں۔ 50 مسلمان ”رام جنم بھومی پولیس چوکی“ میں پناہ گزیں اور دن بھر کھانا پانی کے بغیر بھوکے پیاسے رہے۔ صبح میں پانچ فٹ دیوار کی تعمیر بابری مسجد کے اطراف میں مکمل کی گئی۔ سنگھل نے تمام کارسیوکوں کو مزید تباہی سے روکا اور اعلان کیا کہ خاموشی سے اجودھیا سے نکل جائیں۔ اسی دن شام کو تمام کارسیوک اسپیشل ٹرینوں کے ذریعہ اجودھیا سے باہر چلے گئے۔

اسی دن RSS کے سرنگھ چالک بالا صاحب دیورس نے ڈھانچہ (بابری مسجد) گرائے جانے کو افسوس ناک قرار دیا۔ اڈوانی حزب اختلاف کی لیڈر شپ سے مستعفی ہو گئے۔

8 دسمبر 1992: پیرالمٹری فورسز کی چار ہٹالین کو متنازعہ اراضی کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس وقت بھی کارسیوکا جاری تھی۔ اسی دن شام سوا چار بجے کارسیوک مکمل ہو گئی اور سیکورٹی فورسز نے پورے کمپلکس کو اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ دن بھر اسپیشل ٹرین کے ذریعہ کارسیوکوں کو اجودھیا سے باہر جانے کا نظم رکھا گیا۔ رات میں ساڑھے گیارہ بجے اشوک سنگھل اور ونے کٹیار کو چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ

کے حکم سے گرفتار کر کے آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔

10 دسمبر 1992: آر، ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بھنگ دل، جماعت اسلامی ہند،

اور اسلامی سیوک سنگھ (I.S.S) پر مرکزی حکومت نے پابندی عائد کر دی۔

16 دسمبر 1992: راجستھان، مدھیہ پردیش اور ہماچل پردیش کی بی جے پی

حکومت برخاست۔

☆ مرکزی وزارت داخلہ کے ایک آرڈر کے تحت شہید بابری مسجد کے انہدام کی تفتیش کے لئے لبر اہن کمیشن قائم کیا گیا۔

16 دسمبر 1992: اتر پردیش میں للت پور کے مائٹیلہ میں خصوصی عدالت قائم کی گئی۔

☆ جہاں 198-FIR کے تحت اڈوانی اور دیگر سات افراد کا مقدمہ للت پور کی خصوصی عدالت کو سونپ دیا گیا۔

7 جنوری 1993ء: مرکزی حکومت نے بابری مسجد سمیت اس سے متصل 163 ایکڑ اراضی اپنی تحویل میں لے لی۔

27 فروری 1992: سی، بی۔سی، آئی، ڈی نے للت پور کی خصوصی عدالت میں

198-FIR میں ایک چارج شیٹ داخل کر کے اڈوانی و دیگر افراد پر دفعہ

147، 149 (153A، 153B، اور 505 کے علاوہ) کے تحت چارج لگایا

گیا۔

اڈوانی کے خلاف چارج شیٹ (198-FIR)

دفعہ 153 A: مختلف گروہوں کے درمیان مذہبی جھگڑے کو بڑھاوا دینا۔

دفعہ 253 B: قومی اتحاد کے خلاف بیان۔ دفعہ 147: دنگا، فساد

دفعہ 149: غیر قانونی میٹنگ، اجتماعی جرم کے لئے ہر شخص قصور وار

دفعہ 505: بیانوں سے لوگوں کو گمراہ کرنا۔

کارسیوکوں کے خلاف چارج شیٹ (FIR-197)

دفعہ 395: ڈکیتی

دفعہ 297: قتل اور شدید زخم پہنچانے کی کوشش کے ساتھ ڈاکہ۔

دفعہ 332: سرکاری اہل کاروں کو اپنا فرض نبھانے سے جان بوجھ کر روکنے

کی کوشش۔

دفعہ 337: دوسروں کے تحفظ کو خطرے میں ڈال کر نقصان پہنچانا۔

دفعہ 338: دوسروں کے تحفظ کو خطرے میں ڈال کر شدید نقصان پہنچانا۔

6/ جون 1993: اتر پردیش سرکار نے FIR-198 کو ملت پور سے رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں منتقل کر دیا۔

2001ء: بابری مسجد انہدام کے نو برس مکمل ہونے پر وشو ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کا عزم نو۔

جنوری 2002ء: وزیراعظم اٹل بھاری واجپئی کے دفتر میں 'اجودھیاسیل' کا قیام۔

فروری 2002ء: بی جے پی کی جانب سے انتخابی منشور میں سے رام مندر کی تعمیر کی

شق خارج۔ اجودھیاسے واپس آنے والے ہندوؤں کی ٹرین پر حملہ، اٹھاؤں

ہلاک۔ وشو ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کے آغاز کے لئے پندرہ

مارچ کی تاریخ کا اعلان۔

مارچ 2002ء: گجرات مسلم کش فسادات میں دو ہزار افراد ہلاک۔

اپریل 2002ء: اجودھیاسے کے متنازعہ مقام کی ملکیت کے بارے میں مقدمے کی

سماعت کا آغاز۔

جنوری 2003ء: ماہرین آثار قدیمہ کی جانب سے عدالت کے حکم پر متنازعہ مقام

کے جائزے کا آغاز۔

اگست 2003ء: ماہرین آثار قدیمہ کی جانب سے مسجد کے نیچے مندر کی موجودگی کے شواہد کا اعلان۔ مسلمانوں کی جانب سے اعتراضات۔

ستمبر 2003ء: عدالت کی طرف سے بابرہی مسجد کے انہدام پر اکسانے کے الزام میں سات ہندو رہنماؤں پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ۔

اکتوبر 2003ء: مسلم تنظیموں کی جانب سے ماہرین آثار قدیمہ کی رپورٹ کو مکمل طور پر مسترد کرنے کا مطالبہ۔

دسمبر 2003ء: انہدام کی گیارہویں برسی پر حیدر آباد دکن میں فسادات۔ پانچ افراد ہلاک۔

جولائی 2004ء: شیو سینا کے رہنما بال ٹھا کرے کی جانب سے مسئلے کے حل کے لئے متنازعہ مقام پر قومی یادگار کی تعمیر کی تجویز۔

اکتوبر 2004ء: لال کرشن اڈوانی کی جانب سے مندر کی تعمیر کے عزم کا اعادہ۔
نومبر 2004ء: الہ آباد ہائی کورٹ کی جانب سے بابرہی مسجد معاملے میں لال کرشن اڈوانی کو نوٹس۔

30 جون 2009ء: لبر اہن کمیشن نے بابرہی مسجد کے انہدام کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔

25 نومبر 2009ء: حکومت نے لبر اہن کمیشن کی رپورٹ کا روایتی رپورٹ کے ساتھ پارلیمنٹ میں پیش کی۔

7/8/9 اور 10 دسمبر 2009ء کو پارلیمنٹ میں رپورٹ پر بحث۔

سلگتے شہر کا سفر نامہ اور چند حقائق

کملیشور

(کملیشور کا شمار ان سیکولر اور انصاف پسند ہندی ادیبوں اور صحافیوں میں ہوتا ہے جو حق بات کہنے سے بھی نہیں ڈرتے۔ انہوں نے بابرؒی مسجد انہدام سے قبل اجودھیا کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لیا تھا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کا یہ سفر نامہ آج بھی اہمیت کا حامل ہے۔)

جن مورچہ کے ایڈیٹر شیلا سنگھ نے صحافیوں کی ایک اہم میٹنگ منعقد کی تھی جس کے سلسلے میں فیض آباد جانا پڑا۔ مگر فیض آباد جانے کا مقصد یہی تھا کہ بابرؒی مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کی ضروری معلومات حاصل کی جائے اور کسی جذبہ یا تعصب کے تحت نہیں بلکہ غیر جذباتی ہو کر اس کا جائزہ لیا جائے، اس تنازعہ کو اس وقت سمجھا جاسکتا تھا جب وہاں جایا جائے اس مقام کو دیکھا جائے اور حقائق اکٹھے کئے جائیں اور ایک ہندوستانی کی نظر سے انہیں پرکھا جائے۔ اس کے لئے قدیم تاریخ کو اس کے سیاق سے الگ نہ کیا جائے۔ مذہبی جذبات اور قتل و غارت کو دماغ پر حاوی نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ یہ تاریخ ہندو مذہب اور اسلام کے تصادم کی تاریخ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مذہبی جنگ نہیں تھی بلکہ سلطنتوں کی جنگ تھی اسلام نے کبھی بھارت پر حملہ نہیں کیا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کی سلطنتیں قائم کرنے کے لئے جو حملہ آور یہاں آئے وہ اسلام کے پیرو تھے۔ انہوں نے ان مسلمانوں سے بھی جنگ کی جو پہلے سے یہاں حکمران تھے اس لئے عہد وسطیٰ کی لہو لہان ہندوستانی تاریخ کو اسلام اور

ہندو مذہب کی جنگ کے سیاق و سباق میں دیکھنا ایک نہایت غلط نظریہ ہے۔

بہر حال ہماری گاڑی گنگا جمن فیض آباد ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ میرا ڈبہ جہاں رکا اس کے سامنے دیوار پر ایک چیتا ہوا نعرہ دکھائی دیا۔ دیو استھانوں کا اپمان۔ نہیں سہے گا ہندوستان۔ بجرنگ دل۔ میرے کان کھڑے ہوئے اور ایک جھٹکے لگا۔ تعجب اس پر ہوا کہ یہ نعرہ پلیٹ فارم کی دیوار پر لکھا ہوا تھا اور ریلوے افسران نے اسے مٹانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

اسی اثناء میں اشوک ٹنڈن، اروڑہ جی اور شیتلا سنگھ آگئے اور ہم شہر کی طرف چل دیئے۔ میں دوستوں کی باتوں پر ہاں ہوں کرتا رہا مگر میں دراصل شہر کو دیکھ رہا تھا، شہر کے ماحول بستیوں اور بازاروں کے مزاج کو پرکھ رہا تھا اور جو کچھ میں نے دیکھا اور پرکھا وہ یہی تھا کہ فیض آباد کی سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں کہیں بھی کشیدگی نہیں تھی ورنہ ظاہری طور پر سڑک کے کنارے کھڑے درختوں پر لگے پرچم بتا دیتے ہیں مزاروں، مسجدوں پر، مندروں پر ہوئے نئے رنگ و روغن کے اشارے بتا دیتے ہیں کہ اس شہر کا مزاج کیسا ہے؟

فیض آباد کے مزاج اور موڈ میں مجھے کوئی ترشی نہیں دکھائی دی۔ اجودھیا چلنے کے لئے تیار ہوئے تو باتوں باتوں میں ایک خبر سننے کو ملی کہ محلے میں پانی کی قلت کی وجہ سے جلدی جلدی پانی بھرنے کی ہوڑ میں کچھ کہا سنی ہو گئی اور کچھ لوگ جو کہ کسی بھی بات پر بھڑکنے کے لئے تیار بیٹھے تھے موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک مسلمان درزی کی دکان جلا دی۔ وہ مسلمان درزی ایک ہندو مکان مالک کا کرایہ دار تھا۔ ویسے بھی مکان مالک اور کرایہ دار کے تعلقات خوشگوار نہیں ہوتے، کچھ اس بات کا بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ اس مسلمان درزی کا قصبائی کلیجہ اور سوچنے کا طریقہ بھی کچھ عجیب تھا۔ وہ نہ تو سلیمان سیٹھ تھا، نہ شہاب الدین اور نہ امام بخاری۔ وہ تو فیض آباد جیسے معمولی قصبے کا ایک معمولی ہندوستانی مسلمان تھا۔ اس نے اپنی دکان میں آگ لگ جانے

کے بعد کہا۔ ارے صاحب! میں مسلمان ہوں تو کیا ہوا، سب کپڑے ہندوؤں کے ہی سلتا ہوں، دکان بھی ہندو مالک کی ہے، نقصان تو ہندوؤں کا ہی ہوا، بہانہ میں بن گیا۔

اتنی سیدھی اور سخی بات ایک ہندوستانی مسلمان تو کہہ سکتا ہے ایک ”مسلم انڈیا“ کالیڈرا اور رہنما نہیں کہہ سکتا۔ یہی فرق ہے عام ہندوستانی اور خاص انڈین میں۔

بہر حال ہم فیض آباد سے سات کلومیٹر دور اجودھیا کی طرف چل پڑے۔ وہی اجودھیا جہاں باری مسجد بھی ہے اور رام جنم بھومی بھی۔ اجودھیا تک کا راستہ الگ تھلگ ہی ہے دونوں بستیوں کی شناخت بالکل علیحدہ ہے۔ فیض آباد اودھ کے نوابوں کی راجدھانی تھی، گرجستھوں، کام کرنے والوں اور تاجروں کا شہر تھا، لیکن اجودھیا میں ایسے لوگ نہیں رہتے۔ کچھ گھر ضرور نظر آتے ہیں لیکن اجودھیا صرف مندروں اور اکھاڑوں میں رہنے والے سنیا سیوں کی ہی ہے۔

سب سے پہلے ہم سرجو کے پل پر گئے۔ یہ گھاگھرانڈی ہے جسے صدیوں سے سرجو پکارا جاتا ہے۔ اجودھیا اس سرجو ندی کے موڑ پر بسا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسے منو نے اپنے بیٹے اکشوا کو کے لئے بسایا تھا، آج بھی وہاں نوگزی لمبی ایک قبری ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں عقیدت و احترام سے پوجتے ہیں۔ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اجینی کے مہاراجہ وکرمادتیہ نے اسے ازسرنو بسایا تھا۔ انگریز مورخ ہنٹر اور اسمتھ اسے ازسرنو بسانے کا سہرا چندر گپت ثانی کے سر باندھتے ہیں جس کا لقب وکرمادتیہ تھا۔

”وکرمادتیہ نے ہی عیسوی سنہ سے ایک صدی قبل رام جنم مندر بنوایا تھا، اسے تاریخ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا مگر لوگوں میں صدیوں سے جو اعتقاد چلا آ رہا ہے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔“ دراصل یہ سب کچھ مجھے رامانندی دگمبر

اکھاڑے کے سربراہ پرم ہنس رام چندر داس نے بتایا۔ پرم ہنس رام چندر داس اکھاڑے کی اس چھاؤنی کے سربراہ ہیں اور اس تنازعہ کے اصل مدعی بھی۔ ان کے اکھاڑے کے عالی شان دروازے پر لفظ چھاؤنی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔

پرم ہنس جی نے مزید اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا تھا ”عہد وسطیٰ میں جب دھرم پر بھیانک مصیبت آئی تھی تو سادھوؤں کے الگ الگ اکھاڑے بنادیے گئے۔ ہر اکھاڑے میں ہزار ہزار سادھو ہوتے تھے آج بھی ہیں ہمارے اکھاڑے ہی میں چھ سات سو سادھو ہیں۔ ہم پوجا رچنا کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں، ہم بلیم، بھالا، تیرکمان، گھڑ سا بگھنکھا، تلوار، چاقو، خنجر، گنڈا سہ سب اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔ یہ جو محراب کے درمیان بڑا سا گھنٹہ اور نگاڑا آپ دیکھ رہے ہیں ان کو بجا کر ہم جنگ کا اعلان کر سکتے ہیں، دوسرے اکھاڑے والوں کو اس میں شامل ہونے کے لیے پکار سکتے ہیں یا آگاہ اور ہوشیار کر سکتے ہیں اسی لئے ان اکھاڑوں کو چھاؤنی کہتے ہیں۔“

یہ سب بتاتے ہوئے پرم ہنس جی نے مجھے ایک وسیع عمارت دکھائی تھی جو ایک اور اوسط قلعہ کی مانند تھی جن میں ان کے اکھاڑے کے چھ سات سو سادھو رہتے تھے اس قلعہ یا گڑھی میں سے خفیہ سرنگیں بھی کئی سمتوں میں جاتی تھیں جو اب بند ہیں۔ مجھے اکھاڑوں کی یہ تاریخ معلوم نہیں تھی یہ سب سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے ایسا لگا کہ اجودھیا واقعی اندر اندر سلگ رہا ہے اور یہ اکھاڑے کبھی بھی متحرک اور سرگرم ہو سکتے ہیں مگر میرے اس شبہ کو انہوں نے فوراً رفع کر دیا ”یہ روایت چلی آرہی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہ سب طے ہے کہ کون سا اکھاڑہ جنگ میں ہر اول دستہ بنے گا اور کون درمیانی۔ مگر اب یہ تاریخ کا حصہ ہے کیونکہ جو تقریباً تین سو اکھاڑے اجودھیا میں ہیں وہ اب بھکتی اور پوجا میں اپنا وقت گزارتے ہیں..... یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس ریاست میں فرقہ وارانہ امن قائم رہے۔ ہم ہندو اور مسلمان اسکے

لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہاں فساد نہیں ہو سکتا۔ ہوگا کیسے ہم جو موجود ہیں۔“

مجھے پرم ہنس جی کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چائے پینے کے دوران ان سے تقریباً مناظرہ ہی ہوتا رہا..... انہوں نے ہی بتایا تھا کہ یہیں یعنی ان کے اکھاڑے میں اور اس کے سامنے والے مقام پر ہی گو سوامی تلسی داس نے رامائن کی تخلیق کی تھی۔ ان کی باتیں سن کر جذبات میں آنے سے میں نے خود کو سنبھالا، کیونکہ میں اس سلگتے شہر کی معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔ جس شہر میں چل رہے تنازعہ نے پورے ملک میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ میں کسی پر بھی یقین کرنا نہیں چاہ رہا تھا سب کچھ سن کر جان کر، دیکھ کر اور محسوس کر کے میں خود نتیجہ نکالنا چاہتا تھا۔ ہم پرم ہنس جی کے ساتھ چل دیے، وہ دھوتی پہنے ہوئے تھے جٹا تو تھی ہی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

ہم جہاں پہنچے وہ ہاشم صاحب (ہاشم انصاری) کا مکان تھا۔ ایک معمولی سے کاروباری آدمی کا معمولی سا گھر۔ باہر بکریاں گھوم رہی تھیں ایک ایببسڈ رکار کھڑی تھی۔ ہاشم صاحب ٹھیکیداری کرتے ہیں۔ بابر مسجد کی طرف سے انہوں نے مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔

ہم لوگ ہاشم صاحب کی بیٹھک میں داخل ہوئے، سب سے آگے پرم ہنس جی تھے۔ ہاشم صاحب کے لڑکوں، بھتیجیوں نے ایسے استقبال کیا جیسے ہم روز کے آنے جانے والے ہوں۔ انہوں نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہاشم صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ہم کچھ سوچتے کہ پرم ہنس جی صوفے پر جم کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ایک لڑکے نے یہ خبر دی ہاشم صاحب نماز پڑھنے گئے ہیں آتے ہوں گے۔

پانی آیا، ہم سب نے پیا۔ تب تک ہاشم صاحب آ گئے۔ دبلے پتلے چھوٹے سے۔ پرم ہنس جی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”بھائی تم بابر مسجد پر قبضہ کرنے گئے تھے ہم نے تمہارے گھر پر ہی قبضہ کر لیا۔“

ہاشم صاحب معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بات شروع ہونے سے پہلے میں نے سنا۔ ہاشم صاحب پر مہنس جی کو بتا رہے تھے۔
 معلوم ہوا اپنے شکلا جی کو کچہری کے پیچھے کسی نے دو چار لٹھ مار دیئے.....
 یہ تو سراسر غلط بات ہے۔

میں سلگتے شہر کے دھکتے لوگوں کے درمیان تھا۔ رام جنم بھومی اور بابر مسجد معاملے کے مدعی اور مدعی علیہ پر مہنس رام چندر داس اور ہاشم صاحب ایک ہی صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے جن کی لڑائی کو لے کر پورا ہندوستان لڑائی کی آگ میں جل رہا ہے۔ ان میں کوئی ترشی کوئی رنجش، کوئی مخالفت، کوئی دشمنی شمع برابر بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

ہاشم صاحب نے بتایا۔ جب لکھنؤ میں تاریخ پڑتی ہے تو ہم ساتھ ہی ساتھ جاتے ہیں..... اس کے پاس تو گاڑی ہے نہیں۔

اور ہنستے ہوئے پر مہنس جی نے بتایا کہ ہم نے رام جنم بھومی کے لئے گوئڈہ، بستی، سلطان پور، فیض آباد میں ہڑتال اور بند کا نعرہ دیا تھا سوال اٹھا کہ دیکھا جائے کہ ہمارے اعلان کا کیا نتیجہ ہوا ہے۔ ہمارے پاس پٹرول نہیں تھا۔ پٹرول پمپ ”بند“ کی وجہ سے بند تھے۔ ہم اپنی ہی ہڑتال تڑوایا کھلوا نہیں سکتے تھے تب ہاشم بھائی نے ہی بیس لیٹر پٹرول دیا تھا اور بند کی کامیابی کا معائنہ کرنے ہم گئے تھے..... اور سب اس بات پر مہنس رہے تھے۔ لیکن بات تو کہیں بہت گہری، بہت خطرناک اور بہت بھیانک تھی۔ ملک کے اخباروں نے اتنی سنسنی دماغوں میں بھردی تھی کہ سب ایک ڈرامہ لگ رہا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا ایک سادھو اور ایک معمولی سا گریہ ستھ اتنے عیار اور چالاک ہو گئے ہیں کہ اندر دھکتے اور ابلتے آگ کے شعلوں کا احساس تک ہونے نہیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ یہی تو وہ سادھو پر مہنس رام چندر داس ہیں جنہوں نے رام جنم بھومی نہ ملنے پر خودکشی کرنے کا اعلان کیا ہے،

اور یہی تو وہ ہاشم صاحب ہیں جنہوں نے بابرؒ کی بازیابی کی خاطر اپنا وجود داؤ پر لگا دیا ہے۔

باتیں طویل ہوئیں۔ ہر لحاظ سے ہم نے مباحثہ کیا اور شام کی میٹنگ میں ہم سب ہاشم صاحب سمیت فیض آباد کی طرف چل پڑے۔ میٹنگ بابرؒ مسجد، رام جنم بھومی کے بارے میں نہیں تھی کیونکہ فیض آباد اور اجودھیا میں یہ سلگتا ہوا مسئلہ تھا ہی نہیں۔

میٹنگ شروع ہونے سے قبل ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک ایسا سرائیکلا جسے سن کر میں سکتے میں آ گیا۔

ہاشم صاحب نے کہا۔ صاحب۔ ہم پر آپ چھوڑ دیں تو ہم آپس میں سب کچھ طے کر سکتے ہیں۔

پرم ہنس جی نے کہا۔ ہاں یہ سارا معاملہ ہم اپنے درمیان سلجھا سکتے ہیں۔

تو؟..... اور اس ”تو“ کا جواب ایک طمانچہ تھا۔ دونوں بتا رہے تھے کہ ہم فیصلہ کر لیں۔ لیکن صاحب سوال تو یہ ہے کہ کیا ”وہ“ مانیں گے؟

کتنا سنگین، کتنا لاچار اور کتنا بے بسی بھرا تھا یہ ”وہ“

”وہ“ کون سی طاقتیں ہیں جو اس تنازعہ کو سلگا رہی ہیں اور اگر اجودھیا کے عوام اسے سلجھا بھی لیں تب بھی یہ سلجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ ”وہ“ طاقتیں اسے سلجھانے نہیں دیں گی۔

”وہ“ لوگ ہیں سید شہاب الدین، امام بخاری، احمد بخاری، مولانا کچھوچھوی، وشوہندو پریشد کے مہنت اویدھ ناتھ اور داؤد دیال کھنہ وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم ملک کے ذی شعور افراد کے سامنے تاریخی حقائق پیش کرنے جا رہے

ہیں:

تاریخ کا پہلا باب:

(1) بابر نے ہندوستان پر فیصلہ کن حملہ 1526ء میں کیا اس سے قبل بابر 1518ء اور 1519ء میں دوبارہ ہندوستان پر حملہ کر چکا تھا اور لاہور سے واپس گیا تھا۔

(2) بابر کے پہلے دو حملوں کے وقت لاہور کا صوبیدار تھا دولت خاں۔

(3) 1526ء میں جب بابر نے ہندوستان پر فیصلہ کن حملہ کیا تو اس وقت یہاں ابراہیم لودی تخت نشین تھا، اس کی راجدھانی آگرہ تھی، بنگال کا صوبیدار نصیر الدین نصرت شاہ تھا۔ بہار میں اس وقت ایک افغانی قبیلے نعمانیاں کی حکومت تھی، حسن خاں میواتیوں (الور بھرت پور) کا سردار تھا صرف ایک ہندو راجہ رانا سانگا میواڑ میں تھا یہ شمالی ہندوستان کی صورت حال تھی۔

(4) ہندوستان کے بادشاہ ابراہیم لودی کے خلاف دو لوگوں نے سازش کی تھی ان میں سے ایک تھا عالم خان لودی، یہ ابراہیم کا چچا تھا۔ یہ آگرہ کی گدی چاہتا تھا۔ دوسرا تھا دولت خاں۔ لاہور کا صوبیدار۔ دولت خاں نے اپنے دو بیٹوں دلاور خاں اور عالم خاں کو بابر کے پاس بھیجا تھا کہ بابر ہندوستان پر حملہ کرے اور ابراہیم لودی کو شکست دینے میں مدد کرے۔

(5) بابر نے 1525ء میں ہندوستان کے لئے کوچ کیا اور پانی پت میں اس کی ابراہیم لودی سے فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ ابراہیم لودی ہار گیا اور 21 اپریل 1526ء کو اس کا کٹا ہوا سر بابر کو پیش کیا گیا۔ اس فتح کے بعد بابر نے پانی پت سے اپنے بیٹے ہمایوں کو آگرہ روانہ کیا اور اپنے بہنوئی مہدی خواجہ کو دہلی۔

(6) بروز جمعہ 27 اپریل 1526ء خود بابر دہلی میں داخل ہوا۔ شہری مسجد سے اس کا خطبہ پڑھا گیا اور وہ ہندوستان کا پہلا مغل بادشاہ بن گیا۔

تاریخ کے ان حقائق سے یہ واضح ہو جانا چاہئے کہ بابر نے ہندوؤں کے ہندوستان یا ان کے مذہب پر چڑھائی نہیں کی تھی، بابر نے ہندوستان کے ان سلطانوں اور صوبیداروں پر حملہ کیا تھا جو سب مسلمان تھے۔

تاریخ کا دوسرا باب:

(1) رانا سانگا سے بابر کی دو جنگیں ہوئیں لیکن بابر پہلے ان افغانوں کو قابو میں کرنا چاہتا تھا جو قنوج کے مشرق سے بنگال کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ افغان مسلمان صوبیدار تھے۔ ناصر خاں نعمانی اور معروف فرمولی۔ ان سے 1529ء میں بابر کی لڑائی گھاگھرا (سرجو) کے ساحل پر ہوئی تھی۔ یہ افغان سردار بھی مسلمان تھے۔

(2) کہا جاتا ہے کہ 1528ء میں اجودھیا میں بابر کی مسجد کی تعمیر ہوئی۔ حالانکہ بابر ۱۵۲۹ء میں گھاگھرا کی لڑائی لڑنے کے لئے گیا یعنی اجودھیا کے قریب پہنچا۔ اس پر بحث نہ بھی کریں تو بھی یہ معلوم ہونا چاہئے کہ سارا تنازعہ اسی مسجد کو لے کر ہے کہ یہ مسجد رام جنم مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے اور بابر کے فرمان اس سلسلے میں موجود ہیں۔

(3) یہاں پر یہ قابل غور سوال ہے کہ کیا ہندوستان کا مغل بادشاہ اپنے نام پر اتنی معمولی سی مسجد بنواتا۔ جس میں پانچ سو آدمی بھی نماز نہیں پڑھ سکتے۔ یہ بات مسجد کی عمارت دیکھنے سے واضح ہو جاتی ہے۔

(4) انگریز مورخ کننگھم لکھتا ہے کہ (لکھنؤ گزیٹٹر میں) رام جنم مندر گران کے وقت ہندوؤں نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اور ایک لاکھ ۷۴ ہزار ہندوؤں کی لاشیں گر جانے کے بعد ہی میر باقی مندر کو توپ کے گولوں سے گرانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

(5) کنگھم کی تفصیل کو استعمال کرتے ہوئے دشوہندو پریشداس میں یہ اور جوڑ دیتی ہے کہ ایک لاکھ ۷۴ ہزار ہندوؤں کے خون سے گارا بنایا گیا جس سے بابر مسجد کی عمارت چنی گئی۔

اب ان حقائق پر اگر گہری نظر ڈالیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے:

- (1) یہ مسجد میر باقی نے بابر کے حکم پر بنوائی تھی اور بابر گھاگھرا (سرجو) کے ساحل پر افغانوں سے لڑا تھا یعنی وہ اجودھیا گیا تھا۔
- (2) قابل غور بات یہ ہے کہ کنگھم نے گزیٹر میں جو کچھ لکھا ہے وہ 1857ء کے بعد کا ہے، 1857 میں ہندوستان اپنی آزادی کی پہلی مشترکہ جنگ لڑ چکا تھا۔

(3) قابل غور بات یہ بھی ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد سلطان پور گزیٹر کے صفحہ 36 پر کرنل مارٹن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ”اجودھیا کی بابر مسجد کو ہندوؤں کو واپس کرنے کی خبر سے ہم میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ اور ایسا لگنے لگا تھا کہ ہندوستان سے انگریز ختم ہو جائیں گے۔ لیکن اچھا ہوا کہ غدر کا پانسہ پلٹ گیا اور امیر علی (1857ء کی جنگ کے لیڈر) اور بلوائی بابا رام چرن داس (امیر علی کے ساتھ دوسرے لیڈر) کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جس کے بعد فیض آباد کے بلوائیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور پورے ضلع پر ہمارا رعب غالب ہو گیا، کیونکہ گونڈہ کاراجہ دیوی بخش سنگھ پہلے ہی فرار ہو گیا تھا۔ اس کام میں راجہ مان سنگھ مہدو نہ والے نے ہماری بہت مدد کی۔“

(4) کرنل مارٹن کی اس رپورٹ کے حوالے سے اگر کنگھم کی تفصیل کو دیکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ کنگھم نے ایک لاکھ 74 ہزار ہندوؤں کے قتل کی بات کیوں لکھی ہے۔

(5) یہ بھی دشوہندو پریشد کے لوگوں سے پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کنگھم کی

تفصیل کو اگر سچ مانتے ہیں اور گارے میں ہندوؤں کا خون ملاتے ہیں تو جب ایک لاکھ 74 ہزار ہندو مرے تو انہیں مارنے والے بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ رہے ہی ہوں گے اور کچھ اجودھیا کے باشندے زندہ بھی بچے ہوں گے تو کیا 1857ء میں یا اس سے اور پہلے بھی اجودھیا کی آبادی ساڑھے تین چار لاکھ تھی۔

(6) ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا یہ سچ ہے کہ اتنی معمولی سی مسجد بابر نے بنوائی ہوں گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میر باقی نے یہ مسجد اسی طرح بابر کے نام پر بنوائی ہو جیسے آج کل جگہ جگہ اندرا گاندھی نگر یا راجیو گاندھی نگر بنتے ہیں۔

(7) قابل غور بات یہ بھی ہے کہ بابر کی راجدھانی آگرہ تھی اور آگرہ سے متھرا کی مسافت صرف پچاس میل ہے، شری کرشن جنم استھان متھرا میں ہے اور کرشن بھکتی کی روایت اس وقت رام بھکتی کی روایت سے زیادہ جاری و ساری تھی، شری کرشن کو اوتار مانا جا چکا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ بابر نے اپنی راجدھانی کے اتنے قریب ہی واقع شری کرشن جنم استھان کو نہیں توڑا، اور رام جنم بھومی کو توڑنے اور مسجد بنوانے اجودھیا تک چلا گیا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جسے اجودھیا کی بابر کی مسجد کہا جاتا ہے وہ شہنشاہ بابر نے نہیں بنوائی بلکہ اس کے نام پر دوسروں کے ذریعہ بنوائی گئی، بادشاہ بابر سے اس مسجد کو علیحدہ کر دینے سے (جو کہ ایک تاریخی حقیقت ہے) اس تنازعہ کے جذباتی پہلو اور ان روایتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے جو واضح طور پر رنجش پیدا کرنے والی ہیں۔

تاریخ کا تیسرا باب:

(1) بابر کی مسجد کی پوری عمارت کو باریکی سے دیکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی عمارت کو توڑ کر ہی اس کی تعمیر ہوئی ہے۔

- (2) اس مسجد کے دروازوں کے ستونوں کی شکل میں کسوٹی پتھر کے بارہ ستون لگے ہوئے ہیں بالکل ویسے ہی ستون کچھ مسلم مقبروں میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بارہ ستون مسجد کے لئے نہیں بنوائے گئے تھے۔
- (3) ان ستونوں پر مورتیاں بنی ہیں جو واضح نہیں ہیں مگر انسانی شکل کی لگتی ہیں۔
- (4) اس مسجد میں میناریں نہیں ہیں اذان دینے کے لئے کوئی اونچی جگہ بھی نہیں ہے۔

- (5) وضو کے لئے باؤڑی یا کنویں کا انتظام نہیں ہے۔
- (6) اس مسجد کے چاروں طرف پر کرمانی ہوئی ہے۔
- (7) مسجد کے داہنے والے بیرونی دروازے پر شیروں کی دو شکلیں بنی ہیں۔
- (8) اس مسجد میں دو مقامات پر کتبے لگے ہوئے ہیں جن میں لکھا ہے کہ بابر کے حکم سے جس کے انصاف کا پرچم آسمان تک لہرا رہا ہے، نیک دل میر باقی نے فرشتوں کے اترنے کے لئے یہ جگہ بنائی ہے۔
- اس کے مطابق مسجد کی تعمیر کا سال 1528ء طے ہوتا ہے۔

ان حقائق کے باوجود قابل غور بات یہ ہے کہ ہندو وادی سوچ اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ مسجد قطعی طور پر بابر کی بنوائی ہوئی ہے اس نے مندر توڑ کر مسجد بنانے کا حکم دیا۔ میں زور دے کر کہنا چاہوں گے کہ یہ سوچ غلط ہے بادشاہ کے نام پر بہت سے کام ہوتے ہیں یا کسی بھی تعمیر میں بادشاہ کا نام جوڑ دینا ایک روایت ہے اس لئے اس تنازعہ کو بابر سے جوڑنا ایک دور کی کوڑی ہے۔

تاریخ کا چوتھا باب:

ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ ”رام نام“ کی روایت کب سے شروع ہوئی۔ اس کی شروعات سوامی راماند جی نے 1443ء میں کی۔ تلسی داس

1497ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بابر کی آمد کے وقت ان کی عمر 33 سال تھی۔ رام کو اوتار بنانے کا سہرا تلسی داس جی کے سر ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں کہیں رام مندر نہیں ملتے۔ رام جی کی جنم بھومی پر اگر بابر نے اتنا بڑا ظلم کیا تھا تو تلسی داس جی نے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جب کہ وہ اچودھیا میں رہتے تھے۔

تلسی داس نے 12 گرنٹھ لکھے اور آچار یہ رام چندر شکل کے مطابق رام چندر کے دربار میں رکھنے کے لئے عرضیاں لکھی گئیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اپنی عرضی یا فریاد میں بھی تلسی داس جی نے بابر کی کوئی شکایت نہیں کی۔ انہیں یہ اطلاع تک نہیں دی کہ ان کی جنم بھومی کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ تلسی داس جی کو اس کا گواہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

رحیم سے دو ہوں میں ان کی وقتاً فوقتاً مراسلت بھی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی رحیم کو یہ نہیں لکھا کہ بادشاہ بابر نے ان کے پیر و مرشد کی جنم بھومی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے۔

سوامی اگرداس (1575ء) نابھاداس جی (1600ء) اور پران چندر چوہان (1610) یہ تینوں شاعر اور ڈرامہ نگار رامائشری شاخ کے مشہور مصنف رہے ہیں انہوں نے کبھی بھی اور کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ان کے علاوہ سورداس، نندداس، کرشن داس، مکھن داس، چھیت سوامی، میرا بائی وغیرہ نے بھی کبھی اس ”ظلم“ کا تذکرہ نہیں کیا۔

اس تنازعہ کو باہری لوگوں نے الجھا دیا ہے۔ اگر اسے اچودھیا کے شہریوں کی شکل میں سلجھایا جائے تو سلجھ سکتا ہے لیکن تاریخ کی بے بنیاد کتابیں شائع کرنے والے مقامی پبلیشروں نے اسے اور طول دے رکھا ہے اور اس کا خوب استحصال کر رہے ہیں۔

کٹر ہندوؤں کے ذریعہ ایک غلط پروپیگنڈہ یہ بھی کیا گیا کہ 22/23 دسمبر

1949ء کی درمیانی شب میں بابرؒی مسجد کے اندر معجزاتی طور پر بھگوان رام پرکٹ ہوئے۔ اس غلط پروپیگنڈہ کے کچھ حصے اس طرح ہیں ”23 تاریخ کو بابرؒی مسجد ہی جانے والی اصل رام جنم بھومی میں بھگوان کے پرکٹ ہونے کی خبر پورے ملک میں بجلی کی مانند پھیل گئی، اس وقت رام جنم بھومی پر ابوالخیش نام کے ایک مسلم حوالدار کی ڈیوٹی تھی۔ کلکٹر کے سامنے جب اس کا بیان لیا گیا تو اس نے کہا: ”میرا نام ابوالخیش ہے، میں شری رام جنم بھومی (بابرؒی مسجد) پر ڈیوٹی کے لئے تعینات کیا گیا ہوں، برابر ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ 22/23 دسمبر 1949ء کی شب میں تقریباً دو بجے جب میں ڈیوٹی پر تعینات تھا اچانک بابرؒی مسجد میں کچھ چاندنی سی نظر آئی۔ میں اس طرف بغور دیکھنے لگا۔ اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک خدائی روشنی مسجد کے اندر ہو رہی ہے، رفتہ رفتہ وہ روشنی سنہری ہوتی گئی اور اس کے اندر ایک بہت ہی خوبصورت چار پانچ سال کے بچے کی مورتی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر میں بے ہوش ہو گیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میری یہ حالت کب تک رہی۔ جب میں ہوش میں آیا تو دیکھتا ہوں کہ صدر دروازے کا تالا ٹوٹ کر زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اور مسجد کے اندر ہندوؤں کی بھیڑ گھسی ہوئی ہے جو کہ ایک سنگھاسن جس پر کوئی بت رکھا ہوا ہے۔ بھئے پرکٹ کر پالا دین دیا لا، گا کر آرتی اتار رہے ہیں، تب فوراً میں نے افسران تک اس کی خبر بھجوائی اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔“

یہ کہانی کٹر پنہتی ہندوؤں کی ایجاد کردہ ہے اور جس ابوالخیش کا نام استعمال کر کے اس کہانی کی تصدیق کی گئی ہے وہ ایک خوفناک سازش ہے۔ میں نے خود فیض آباد میں پرانے کاغذات اور فائلوں کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ابوالخیش نام کے کسی مسلم حوالدار نے کہیں بھی کوئی ایسی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے اور نہ ہی اس نے اس طرح کا کوئی بیان دیا ہے۔

اس جھگڑے کے اٹھتے ہی مقدمہ بازی شروع ہو گئی، اور عمارت کے پانچ سو

گزر کے دائرے میں مسلمانوں کے داخلے پر پابندی لگادی گئی۔ البتہ ہندوؤں کو جنگلے سے درشن کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

ہندوؤں نے جو چمٹکار دکھایا تھا اسکے خلاف فیض آباد کے مسلمانوں نے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے ملاقات کر کے مورتی ہٹانے کا مطالبہ کیا۔

اسی درمیان ہندو مہاسبھا کے ایک ورکر ٹھاکر گوپال سنگھ وشارد نے سب جج فیض آباد کے یہاں پوجا کرنے کی اجازت کیلئے دعویٰ ٹھونک دیا۔ جو منظور کر لیا گیا، اور ضلع جج دیر سنگھ نے مسجد کے باہر مسلمانوں کا ”اشار ہوٹل“ بند کروا کر وہاں ہندوؤں کے ”گومتی ہوٹل“ کا افتتاح کر دیا۔

یہ معاملہ 1949ء سے 1984ء تک خاموش پڑا رہا کہ اچانک وشو ہندو پریشد نے رام جنم بھومی مکتی یکیہ سمیتی بنالی۔ اور رام جانگی رتھ یا ترا شروع کر دی۔ اس یا ترا میں انہوں نے رام جی کو سلاخوں میں قید دکھایا، اسی دوران یعنی ۱۹۸۵ء میں کٹر پنہتی ہندوؤں کا دل بھرنگ دل بن گیا۔

بالآخر 25 جنوری 1986ء کو فیض آباد کے وکیل امیش چندر پانڈے نے ”رام جنم بھومی میں پوجا کرنے کی اجازت“ کیلئے دعویٰ دائر کر دیا۔

ضلع جج کے ایم پانڈے نے یکم فروری 1986ء کو پانچ بجکر بیس منٹ پر تالا کھولنے کا حکم دے دیا۔ اور فیض آباد کے کو تو ال بی پی سنگھ نے تالا کھول دیا۔

تالا کھلتے ہی بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنی اور شہاب الدین نے اس کی قیادت سنبھال لی، بالآخر یہ معاملہ ہندو مسلم تنازعہ کی شکل اختیار کر گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر بابری مسجد ایکشن کمیٹی 1949ء سے اب تک کیوں سو رہی تھی اس وقت شہاب الدین کہاں سو رہے تھے۔

مسلمانوں میں عدم تحفظ کا جذبہ عدالت نے اتنا نہیں بھڑکایا جتنا کہ ٹی وی پر تالا کھلنے کی خبروں اور رام جانگی رتھوں نے۔ میرٹھ اور احمد آباد کے فرقہ وارانہ

فسادات انہیں کے مرہونِ منت ہیں۔

ہندوؤں کو جاننا چاہئے کہ وہ جسے رام جنم بھومی کہتے ہیں اس کے پیچھے رام جنم استھان نامی جگہ موجود ہے وہیں پر کوشلیہ، کیکی، سمترابھون بھی ہیں، وہیں بھرت، لکشمی اور شترگھن کے جنم استھان بھی ہیں، رام جنم بھومی کی یہ متنازعہ جگہ اس سے علیحدہ ہے۔

جس رام چبوترہ پر پوجا ہوتی رہی ہے اسے اکبر کے وزراء راجہ ٹوڈرمل اور بیربل نے اس تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے بنوایا تھا اور اسے اس وقت کے ہندوؤں نے فوری طور پر مان لیا تھا، آج بھی ہندو اپنے بزرگوں کے فیصلے کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اعتقاد بہت بڑی چیز ہے ہندو عقیدہ مسجد کے جس خاص گنبد والے حصے کو ہی رام جنم بھومی مانتا ہے۔ اس عقیدہ کو ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ ثابت نہیں کیا جاسکتا، اور پھر مسجد کے اصل گنبد سے رام چبوترہ صرف تیس چالیس گز دور ہے اور وہ اکبر کے زمانہ سے ہی پوجا کی جگہ مانا جاتا ہے، اعتقاد کو دس گز زمین کا جامہ پہنا دینا کہ زمین کا یہ ہاتھ بھر ٹکڑا ہی رام جنم بھومی ہے، مذہبی کٹرپن اور زیادتی ہے۔ اعتقاد کو رواداری کی شکل میں تیس چالیس گز کھسکایا جاسکتا ہے جس سے ہندو عقیدہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے۔

کٹر مسلمان بھی مسجد کو چھوڑ سکتے ہیں، کیونکہ اس میں بہت دنوں سے پوجا ہو رہی ہے اور نماز کا سلسلہ بند ہے۔ ضروری ہے کہ بابر مسجد ایکشن کمیٹی اس تنازعہ میں کسی بھی قسم کی مداخلت بند کر دے اور تنازعہ کو فیض آباد کے مسلمانوں اور عدالت پر چھوڑ دے۔

و شوہندو پریشد بھی اس تنازعہ سے علیحدہ ہو جائے تاکہ فیض آباد کے ہندو اس کو سلجھالیں اور نہ سلجھ سکے تو عدالت کا فیصلہ مان لیں۔

اس تنازعہ کا فائدہ اٹھا کر چندہ جمع کرنے والی جو ہندو مسلم تنظیمیں ہیں جو ۸۶ء

کے دوران اچانک کمر متوں کی مانند پیدا ہو گئی ہیں ان پر پابندی لگائی جائے اور فیض آباد و اجودھیا کے ڈاک خانے میں آنے والے اوسطاً دس ہزار روپے یومیہ کے چندہ کو حکومت کے ذریعہ ضبط کیا جائے۔

ضروری ہے کہ دونوں فرقے عدالتی فیصلے کو تسلیم کریں، کیونکہ ملک کا قانون کسی بھی فرقہ کی ضد اور متعصبانہ دھمکیوں سے جھکایا، دبایا یا توڑا نہیں جاسکتا۔ ملک کا قانون ”کعبہ اور بت خانہ“ کی مانند پاک ہے، اگر کٹر ہندو مندر کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور کٹر مسلمان مسجد کی تو اس ملک کا امن پسند ہندوستانی اپنے ملکی قانون کی حفاظت کرنے کا اتنا ہی حقدار ہے کیونکہ اسی قانون اور آزادی کو حاصل کرنے کے لئے فیض آباد کی جیل اور اجودھیا سے متصل اضلاع میں ہمارے شہیدوں نے قربانی دی تھی۔

19 دسمبر 1926ء کو آلہ آباد جیل میں روشن سنگھ شہید ہوئے تھے۔ اسی تاریخ کو گورکھ پور میں رام پرشاد بکسل شہید ہوئے تھے اور اسی تاریخ کو فیض آباد جیل میں اشفاق اللہ خاں کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا گیا تھا۔

ہمیں اپنی اس انقلابی روایت کا تحفظ کرنا ہے، قرآن پاک ہاتھ میں لے کر پھانسی کا پھندہ چومتے ہوئے اشفاق اللہ نے کہا تھا۔

تنگ آ کے ہم بھی تیرے ظلم بیداد سے

چل پڑے سوئے عدم زندان فیض آباد سے

وہ تو چلے گئے لیکن اسی فیض آباد اور اسی ہندوستان میں، ہمیں اور پر مہنس و ہاشم جیسے لوگوں کی مدد کرنی ہے تاکہ وہ یہ قضیہ باہری لوگوں کی مداخلت کے بغیر سلجھالیں۔

ضرورت رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعہ کو لے کر لگے خون کے بدنما دھبوں کو مٹانے کی ہے نہ کہ اور خون بہانے کی۔ اسی میں ملک کا اور اہل ملک کا فائدہ ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی برابر سے شریک ہیں۔

اجودھیا کی تاریخی دستاویزات میں رام مندر کا کوئی ثبوت نہیں

معروف تاریخ داں دوچندر نرائن جھا کے خیالات

(دوچندر نرائن جھا ایک سرکردہ تاریخ داں ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے بھگوا کرن یا فرقہ وارانہ رنگ دینے کے خلاف سخت لڑائی لڑی ہے۔ انہوں نے تین دیگر تاریخ دانوں کے ساتھ مل کر بابرؒ مسجد رام جنم مندر قضیہ کے تاریخی حقائق پیش کئے ہیں اور ثبوتوں کے ساتھ بتایا ہے کہ بابرؒ مسجد کی جگہ پر رام مندر کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ آرائس ایس نے اس تحریک کو سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے کھڑا کیا تھا۔ ذیل میں پیش ہیں ان کے خیالات)

بابرؒ مسجد کی تعمیر بابر کے ایک سپہ سالار میر باقی نے 1528-29 میں کروائی تھی۔ سنگھ پر یوار کا کہنا ہے کہ اسے رام مندر توڑ کر بنایا گیا تھا۔ لیکن آپ دیکھیں گے 1948-49 میں جا کر کرشناقی طور پر وہاں رام کی مورتیاں برآمد ہوئیں۔ اس وقت ریاست کے وزیر اعلیٰ گووند بلھ پنت اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اس وقت سے لے کر 1970 تک اس تنازع کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں سنا۔ وہ تو جب وشو ہندو پریشد نے کاشی متھرا اور اجودھیا کو تیرتھ استھل بنانے کی بات شروع کی تب یہ معاملہ منظر عام پر آیا اور پھر اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بالآخر 1986 میں مسجد کا تالا کھولا گیا اور پھر شیلپو جن کرائی گئی۔ یہ سب کچھ ہندو تو خیمے میں وشو ہندو پریشد، آرائس ایس اور بجرنگ دل وغیرہ کے

عروج کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے اس کا سیاسی فائدہ اٹھایا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندو تو خیمے نے بنیادی، فائدے اٹھانے کے لیے اس تنازع کو گرم کیا اور بالآخر 1992 میں بابر کی مسجد توڑ دی گئی۔ اس وقت تک ایسے نعرے لگائے جاتے رہے کہ مندر وہیں بنائیں گے۔ لیکن اگر آپ تاریخی دستاویزات پر نظر ڈالیں تو رام جنم بھومی کو کوئی حیثیت حاصل نہیں رہی ہے۔

مثال کے طور پر ایک اہم دستاویز اسکند پُران ہے۔ جس میں اجودھیا کے بارے میں تفصیلات ہیں۔ سواشلوکوں میں رام کے بارے میں ہے لیکن صرف دس اشلوکوں میں ان کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے جنم استھان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ البتہ اہمیت اسکی تھی کہ وہ کس جگہ سے سورگ میں گئے۔ اسے سورگ دوار کہا گیا ہے اور وہ اب بھی سر جو اور گھاگھرا کے قریب موجود ہے۔ صرف سورگ دوار ہی کو تیرتھ کا درجہ حاصل ہے۔ بھٹالال لکشمی دھر کی دستاویز میں جو کہ گیارہویں صدی کی ہے، اور جس کا نام ”ستو چنتھن منی“ ہے، اس میں تیرتھ استھانوں کا ذکر ہے، یہ بہت طویل فہرست ہے۔ اس کا مصنف گہروال راج میں ایک وزیر تھا جس نے اجودھیا پر بھی راج کیا تھا۔ اس نے تیرتھ دو تچن کنڈ میں اجودھیا کو تیرتھ استھان کے طور پر نہیں لکھا ہے۔ اب ایک مثال رام چرت مانس کے مصنف تلسی داس کی دیکھیں۔ وہ رام اور اجودھیا کے بارے میں لکھتے ہیں لیکن انہوں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ رام مندر کو منہدم کیا گیا تھا۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ یہ لوگ رام مندر کے بارے میں اتنا شور کیوں مچاتے ہیں۔

آثار قدیمہ کی دیگر شہادتوں میں بھی شمالی ہند میں کسی رام مندر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جنوبی ہند میں دسویں سے بارہویں صدی میں چولہ دور میں اس کا ثبوت تو ملتا ہے لیکن شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی کے اوائل تک کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ رام سے متعلق دو تین مندر مدھیہ پردیش میں ہیں۔ لیکن یوپی بہار اور اڑیسہ میں بھی کوئی رام

مندرنہیں ہے۔ شمالی ہند میں سترہویں صدی کے بعد رام مندروں کا ذکر ملنے لگا۔ نیپال میں جنک پوری میں سیتا کا مشہور مندر ہے اس کا بھی انکشاف انیسویں صدی کے اوائل میں ہوتا ہے۔ دراصل اجودھیا جین ازم اور بودھ ازم کے لیے مشہور تھا۔ چینی سیاح زوانگ زنگ کے ریکارڈ کے مطابق اجودھیا میں 630 قبل مسیح میں 100 کے آس پاس بودھ عبادت گاہیں تھیں۔ اور برہمنوں کی صرف دس عبادت گاہیں تھیں۔ وشنو اسمرتی میں بھی تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں 85 تیرتھ استھانوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس میں اجودھیا کا نام نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اجودھیا میں اتنا اہم کوئی مندر تھا تو اس کا ثبوت 1528 سے قبل، جبکہ مسجد کی تعمیر ہوئی، کیوں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ اسے گیارہویں اور بارہویں صدی میں تو ملنا چاہئے تھا۔

میں ایک تاریخ داں بی بی لال کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے اپنی پہلی رپورٹ میں اجودھیا میں کسی مندر کا ذکر نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ متنازع عمارت میں اوپری سطح کنکروں سے تعمیر کی گئی ہے۔ وہ محکمہ آثار قدیمہ سے 1985-86 میں سبکدوش ہو گئے۔ اب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسجد کے ستون مندر کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ صرف ان کی زبانی باتیں تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے پٹنہ میں ایک سمینار میں ایک مقالہ پیش کیا۔ اس وقت تک بھی ان کو اجودھیا میں کوئی رام مندر نہیں ملا۔ اور اس پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ رام مندر کا کوئی ثبوت نہ ملنے پر دھرتی مانتا انہیں معاف کرے۔ بعد میں وجے واڑہ میں ایک سمینار میں انہوں نے کہا کہ اس تنازع کو اسی صورت میں حل کیا جاسکتا ہے کہ اس مقام کی کھدائی کرائی جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسجد کو منہدم کر دیا جائے۔ وہ اور ان کے ساتھیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مسجد کے انہدام کے لیے کچھ کرنا چاہئے۔ اس وقت تک وہاں پی ڈبلیو ڈی کا کام اور کارسیوا کے لیے زمین کو ہموار کرنا شروع

کر دیا گیا تھا۔

آثار قدیمہ ایک سائنٹفک علم ہے۔ اس میں اس طرح کام نہیں ہوتا۔ ستون دراصل 1.70 میٹر اونچے ہیں اور جو ماہرین میرے ساتھ اس مقام پر گئے تھے انہوں نے کہا کہ یہ ستون ایسے نہیں ہیں کہ اتنا بڑا بوجھ برداشت کر سکیں۔ مسجد کے اوپر تین بڑے گنبد تھے۔ اور اس میں جو سولہ ستون تھے۔ ان کی اونچائی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مندر کے نہیں ہو سکتے۔ ایسا ہوا ہوگا کہ ان کو آرائش کے مقصد سے باہر سے لایا گیا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس علاقے میں ویسے پلر اسٹون نہیں پائے جاتے۔ ہم نے جن آرٹ تارٹخ دانوں سے رابطہ قائم کیا ان کا کہنا تھا کہ یہ ستون یا تو بنگال سے لائے گئے ہوں گے یا پلاس سے۔

یہاں تک کہ کسی بھی تصنیف میں جنم استھان لفظ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اس پورے علاقے کو انیسویں صدی میں جا کر اہمیت حاصل ہوئی۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس پورے دور میں اجودھیا میں سنگ تراشی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اتر پردیش کے میوزیم میں دو یا تین کیٹلاگ ہیں۔ ایک لکھنؤ میں اور دوسرا فیض آباد میں۔ ان دونوں میں سے کسی میں بھی رام کا ذکر نہیں۔

بہر حال اجودھیا میں انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں چھ ہزار مندر تھے۔ میں پرم ہنس بنام وقف بورڈ مقدّمے کے حوالے سے کہنا چاہوں گا کہ ممکن ہے کہ ویسے تنازعات پہلے بھی رہے ہوں اور انگریزوں نے اس سلسلے میں کوئی رول ادا کیا ہو۔ لیکن اگر انہوں نے کوئی رول ادا بھی کیا تو اس کی کیا اہمیت ہے، یہ ان کی حکومت کا انداز رہا ہوگا کہ جھگڑا پیدا کرادو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جگہ کوئی مندر نہیں تھا۔

پروین تو گڑیا جیسے لوگ ہندوؤں کے تئیں مسلمانوں کے معاندانہ رویے کا ذکر کرتے ہیں لیکن کرناٹک میں کیا ہوا۔ لنگایتوں نے جین مندروں پر قبضہ کر لیا۔

انہوں نے جین کی مورتیوں کو ہندو مذہب کی مانند تلک لگا دیے۔ یہاں تک کہ جینیوں پر لنگایتوں نے اتنے ظلم ڈھائے کہ انہوں نے وجے نگر کے حکمرانوں سے تحفظ کی آواز بلند کرنی شروع کر دی۔ اگر مسلمانوں نے ظلم کیا ہے تو وہ تنہا نہیں ہیں۔ سب نے ظلم کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات یورپ میں بھی پیش آئے ہیں۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے آپس میں جنگ کی ہے۔

دراصل عام ہندوستانی کو رام مندر بابر کی مسجد تنازع سے کوئی لینا دینا نہیں۔ جب ہم اجودھیا گئے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس تنازع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کارسیوکوں کو باہر سے لایا گیا اور ان سے سیاسی فائدہ اٹھایا گیا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہاں کوئی تنازع تھا اور مقامی لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا تو ریاستی حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ حالات کو خراب نہ ہونے دیتی۔ جن لوگوں کو اس تنازع سے فائدہ پہنچ رہا تھا صرف انہی کی اس میں دلچسپی تھی۔ وہ اس وقت رام مندر کی بات کرتے ہیں۔ دہلی میں ایسے ہزاروں ہنومان مندر ہیں جو سرکاری زمینوں پر ناجائز قبضے کر کے بنائے گئے ہیں۔ اور حکومت ان کو روکنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔

ہمارا آئین ایک سیکولر آئین ہے۔ اور اس کا کہنا ہے کہ کوئی بھی سرکاری افسر اپنی ڈیوٹی کے دوران اپنی مذہبی شناخت کا اعلان اور اظہار نہیں کر سکتا۔ جب ملک کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد نے پریاگ میں جا کر ڈبکی لگائی تو اس پر زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ صدر کی حیثیت سے مذہبی رسوم ادا کرنے پر عوام نے سخت اعتراض کیا تھا۔ لیکن آج وزیراعظم گورو دوارے میں جاتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ کچھ لوگ عازمین حج کو سبسڈی دینے پر اعتراض کرتے ہیں لیکن ویشنو دیوی، امر ناتھ یا ترا اور کبھ میلے کے لیے حکومت کی طرف سے دی جانے والی خطیر رقم پر کوئی بھی اعتراض نہیں کیا جاتا۔

آج تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے، اور اس کے لیے میں تاریخ دانوں کو مورد الزام ٹھہراؤں گا۔ گجرات میں 2002 میں جو کچھ ہوا وہ ریاست میں چالیس سال سے پڑھائی جانے والی تاریخ کا نتیجہ ہے۔ شمالی ہند میں ششومندروں اور ودیا بھارتی اسکولوں میں تاریخ کے نام پر غلط تاریخ پڑھائی جا رہی ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کے 90 فیصد تاریخ داں سیکولر ہیں، اور حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں یکساں تعلیم کا بندوبست کرے۔ جو بھی چیز حقائق کے برعکس ہو اس کی تعلیم روک دینی چاہئے۔



آرکیالوجی آف بابری مسجد اجودھیا

مصنفہ: محترمہ سریندر کور اور مسٹر شیر سنگھ آئی اے ایس

(نوٹ: بابری مسجد کے انہدام کے وقت آثار قدیمہ کے دو ماہرین اور دیانت دار دانشوروں نے ایک نہایت معلومات افزا اور آثار قدیمہ کے فن کے نقطہ نظر سے نہایت معتبر اور مدلل کتاب تصنیف کی جسے 1992ء میں جینون پبلیکیشنز نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اس کتاب نے وشو ہندو پریشد کے بابری مسجد کے سلسلہ میں نہایت غلط اور جھوٹے پروپیگنڈے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اس کتاب پر ایک تبصرہ پیش ہے)

یہ تصنیف آثار قدیمہ کے سلسلہ میں جملہ فنی معلومات رکھنے والے اور بابری مسجد کی پوری تاریخ اور اس کے آثار کا پچشم خود معائنہ اور اس پر طویل المدت تحقیقی کام کرنے والے ذہین و بے باک نڈر اور حق گو افراد کی محنت کا نتیجہ ہے۔ کلکتہ میں مقیم اس دراک اور باشعور جوڑے نے ڈاکٹر ایس پی گپتا کی خرافات اور تحقیق کے پردے میں وشو ہندو پریشد کے عزائم کی درپردہ تکمیل اور اس کی شرانگیزیوں کے لئے جواز پیدا کرنے کی کوششوں کا پردہ اس طرح فاش کیا ہے کہ اب شاید کسی ذرہ برابر غیرت رکھنے والے انسان کو دوبارہ اس جھوٹ کو دہرانے کی ہمت نہ ہو کہ بابر نے کسی مندر کو توڑ کر مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔ کتاب کو شہید بابری مسجد کے نام معنون کرتے ہوئے مصنفین لکھتے ہیں: ”اس مقدمہ بابری مسجد اجودھیا کے نام جسے

ناپاک و منہدم کر کے 6 تا 8 دسمبر 1992ء کو اس کے ملے کو فاسٹ غنڈوں نے پورے ہندوستان میں بکھیر دیا۔ اور ”منہدم مسجد کی اس مقدس زمین کے نام جو مسلمانوں کی شناخت اور حقوق انسانی بالخصوص مذہبی ثقافتی حقوق کی علامت بن گئی ہے“ اور ”اس تمنا کے ساتھ کہ منہدم مسجد کی جلد از جلد اپنے اصل مقام پر تعمیر ہو جس کی پوری قوم نے سنجیدگی کے ساتھ یقین دہانی کرائی ہے۔“

کتاب کے مقدمہ میں مصنفین نے سچ لکھا ہے کہ فاشزم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ خواہ وہ سرخ لبادہ زیب تن کر کے آئے یا کیسریا، مسٹر شیر سنگھ اور ان کی رفیقہ حیات نے اس کتاب میں دلائل کے ساتھ سب سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف اس بات کا کیا ہے کہ آج جسے بابرؒ مسجد کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے وہ دراصل بابر سے پہلے مشرقی بادشاہوں کے عہد میں حسین شرقی کی تعمیر کردہ ایک تاریخی مسجد تھی اور اس کی تعمیر 1468ء میں ہوئی تھی۔ 1857ء کے غدر کے بعد اسے بابرؒ مسجد کا نام دیا گیا اور ایک طبقہ نے اسے رام جنم بھومی مندر کی جگہ پر بابر کے ذریعہ تعمیر شدہ قرار دینا شروع کر دیا لیکن مصنفین نے اس حقیقت کو پورے دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر سے پہلے کسی بھی مندر کا وجود تاریخی دستاویزوں یا حوں کے سفر ناموں، زمین کے معافی ناموں یا کتبوں اور قدیم تحریروں سے ثابت نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں مایوس ہونے کے بعد وی ایچ پی کے فاشسٹوں نے اعلیٰ درجہ کے تکنیکی مگر گمراہ کن مضمون یعنی فن آثار قدیمہ کا سہارا لیا تاکہ وہ اپنے تخیلاتی جنم بھومی کو حقیقت کا جامہ پہنا سکیں۔ بد قسمتی سے آثار قدیمہ کے جھوٹے ثبوت مہیا کرنے اور اس کا مسلسل پروپیگنڈا کرنے کی کوششوں میں وی ایچ پی نے اس درجہ کامیابی حاصل کر لی کہ بہت سے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بابرؒ مسجد کسی رام مندر کو توڑ کر تعمیر کی گئی تھی۔ فن آثار قدیمہ کی اس درگت اور اس کو جگہ ہنسائی کا سامان بنانے والوں کو پروفیسر شیر سنگھ نے اس کتاب میں خوب خوب بے

نقاب کیا ہے۔ مسٹر شیر سنگھ کا خیال ہے کہ فن آثار قدیمہ میں بدنیت انسانوں کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ بے جان چیزوں کو جو بول نہیں سکتیں جو بھی معنی چاہیں پہنادیں۔ اور اپنے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے لئے جس طرح چاہیں ان کی تاویلیں اور تشریحیں دوسروں کے سامنے کریں۔ کتاب کے مقدمہ میں مصنفین نے یہ رونگے کھڑے کر دینے والا انکشاف کیا ہے کہ جب وہ بابرؒی مسجد کے سلسلہ میں اپنے تحقیقی مضامین لکھ رہے تھے، وشوہندو پریشد کے وکیل اور خود کو ماہر آثار قدیمہ کہنے والے ڈاکٹر ایس پی گپتا نے انکو 5 مارچ 1990ء کے ایک خط میں یہ دھمکی دی تھی کہ مسٹر شیر سنگھ ان کے آثار قدیمہ سے متعلق آراء کو چیلنج نہ کریں ورنہ اس پر ان کو پچھتانا پڑے گا! مگر مسٹر شیر سنگھ اس ماحول میں جبکہ فاشزم کی راہ پر گامزن کارسیو کوں نے ایک طوفان مچا رکھا تھا اور وہ ذرائع ابلاغ کے لوگوں اور دانشوروں کو بھی اپنے حملہ کا نشانہ بنا رہے تھے اپنی تحقیق و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ مسٹر شیر سنگھ نے انڈیا آفس لائبریری کے ان ریکارڈز کی مدد سے جو اس وقت برٹش لائبریری میں موجود ہیں ممتاز محقق فرانسیسی ہیملٹن بکانن کی اس تحقیقات کو حاصل کیا جو 14/1813ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہدایت پر گورکھپور ضلع کے سروے کے وقت اس نے بابرؒی مسجد کے سلسلہ میں کی تھی اور اس نے عربی و فارسی کے ان کتبوں کو جو مسجد کے اندر لگے ہوئے تھے نقل کیا تھا۔ لیکن اس کی تحقیقات کے مسودات شائع نہ ہو سکے اور اپنی اصل صورت میں انڈیا آفس لائبریری میں رکھے رہے تا آنکہ مسٹر شیر سنگھ نے اپنے ڈی لٹ کی تھیس کے سلسلہ میں انہیں وہاں سے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پھر انہوں نے ایک کتبہ پر کندہ عربی عبارت کا مسٹر زین العابدین کی مدد سے ترجمہ کیا۔ اس کتبہ کو محمد فتح اللہ نام کے کاتب نے لکھا تھا اور اس میں مسجد کی تعمیر کی تاریخ درج ہے جو اس مقبرہ سے برآمد ہوئی۔ ”میمون علیہ بخطے“ اس مقبرہ کے حروف سے 872 کی گنتی برآمد ہوتی ہے جو بابر کی پیدائش سے

2 سال پہلے کا سن ہے۔ مسٹر شیر سنگھ نے مزاحیہ انداز میں لکھا ہے کہ اب شاید فتنہ جو سنت مہنت کہنا شروع کر دیا کہ چلے بابر نے نہ سہی اس سے پہلے حسین شرقی نام کے خواجہ سرانے ہی رام مندر توڑا ہوگا اور یہ مسجد بنائی ہوگئی لیکن یہ بات باعث شرم ہے کہ اپنی بہادری اور قربانی کے بلند بانگ دعوے کے باوجود ایک خواجہ سرا کے مندر پر حملہ کو یہ سنت مہنت اس وقت نہ روک سکے۔

مسٹر شیر سنگھ نے پیڑوان ڈیرویر کی تصنیف ”گاڈ آن ارتھ“ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سنت مہنت لوگوں کو قدیم مسودات میں تحریف اور جعل سازی کرنے کا ملکہ حاصل رہا ہے تاکہ وہ بزعم خویش ہندو دھرم کو تقویت پہونچائیں اور اس پر ناز کریں۔ اس سلسلہ میں وہ سبھاش کمار چٹرجی کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ٹیفن تھالر 1782ء کے لاطینی زبان میں لکھے گئے سفر نامے میں تحریف اور اس کی غلط ترجمانی کی مثال دی ہے۔ مسٹر شیر سنگھ نے سفر نامے کے جرمن اور فرانسیسی تراجم کا ذکر کیا ہے جو 1785ء میں کئے گئے۔

مسٹر شیر سنگھ نے اس گراں قدر تصنیف میں ابتدائی باب میں فن آثار قدیمہ اور اس کے تاریخ سے تعلق پر روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے ڈاکٹر ایس پی گپتا کے اس دعوے کی کہ بابر نے مسجد رام جنم بھومی مندر توڑ کر بنائی گئی تھی جس کی گیارہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی، تردید کی ہے۔ مسٹر گپتا نے اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ذریعہ 80-1975ء میں کی گئی کھدائی سے برآمد ہونے والی اشیاء کو پیش کیا ہے۔ مسٹر گپتا کا خیال ہے کہ مسجد سے ۱۸ فٹ کی دوری پر کھدائی میں زمین کے اندر کھمبوں کے لئے اینٹوں سے بنی ہوئی بنیاد دراصل اس رام مندر کی یادگار ہے جس کی عمارت میں 84 کھمبے تھے اور انہیں میں سے 14 کھمبے خود بابر نے مسجد میں موجود ہیں باقی منہدم کر دیئے گئے تھے۔ مسٹر شیر سنگھ نے اس بے بنیاد قیاس کو چیلنج کیا ہے اور اس کی حقیقت کو بے شمار دلائل اور حقائق

کی روشنی میں واشگاف کیا ہے۔

مسٹر شیر سنگھ نے وشو ہندو پریشد کے الٹی گنگا بہانے والے لوگوں سے سوال کیا ہے کہ کیا بابر نے رام مندر کو اپنی توپوں سے گرایا تھا۔ اس لئے کہ اس نے سب سے پہلے ہندوستان میں توپوں کو استعمال کیا تھا۔ اگر اس نے توپیں استعمال کی تھیں تو کم از کم 10،9 فٹ زمین کے اندر تک اس کے اثرات ہوئے ہوں گے پھر یہ کھمبوں کی بنا دیں کیونکر سلامت رہ گئیں۔ مزید برآں دس میٹر بلند مٹی کے ٹیلے پر بابر کی مسجد واقع تھی تو آخر رام مندر کے بلے کو پوری طرح صاف کرنے اور زمین کو مسطح کرنے کی بابر نے ضرورت کیوں محسوس کی۔ اگر جنم بھومی کو توڑنے سے پہلے نذر آتش کیا گیا تو پھر اس کی راکھ اور جلی ہوئی اینٹیں کہاں گئیں اور یہ صحیح سالم مورتیاں اینٹوں کی بنی ہوئی بنیادیں کیونکر برقرار رہ گئیں۔ پھر مسٹر شیر سنگھ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ مسجد اس جگہ پر بنی ہو جہاں بہت پہلے کوئی بودھ و ہارر ہا ہو، ہون سا نگ نے جس کا ذکر کیا ہے اور کھدائی میں جو اشیاء ملی ہیں وہ اس سے متعلق ہوں۔ دراصل وشو ہندو پریشد جس کے پاس کوئی بھی تاریخی دستاویزی اور ٹھوس ثبوت نہیں ہے قیاسات کی ایسی عمارتیں کھڑی کر رہے ہیں جو ایک پھونک سے اڑ سکتی ہیں۔ مسٹر شیر سنگھ سوال کرتے ہیں کہ کیوں کسی بھی سیاح نے جو ہندوستان آیا کسی بھی ایسی جنم بھومی مندر کا ذکر نہیں کیا ہے جس میں سیاہ پتھروں کے کھمبے ہوں۔ خود لکشمی دھر جنھوں نے گیارہویں صدی میں ہندوؤں کے لائق زیارت مقامات اور عمارتوں کی تفصیل بیان کی ہے کہیں جنم بھومی مندر کا ذکر نہیں آیا ہے۔ دراصل یہ انیسویں صدی سے کچھ لوگوں کے تخیل کی زائیدہ و پروردہ ہے۔ مسٹر شیر سنگھ نے سچ لکھا ہے کہ وشو ہندو پریشد کے نقطہ نظر کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے والے کسی طرح کی دلیل اور سند کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بابر کی مسجد کا نام آتے ہی ان کا خون کھولنے لگتا ہے۔ اس قدر زہریلے پروپیگنڈے سے ان کے ذہنوں کو مسموم کر دیا گیا ہے۔

مسٹر شیر سنگھ کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہرین آثار قدیمہ کے اقوال کو اپنی کتاب میں جگہ جگہ نقل کیا ہے اور اس فن کی جو اخلاقیات ہیں اس پر روشنی ڈالی پھر ایس پی گپتا اور بی لال جیسے لوگوں کے کردار کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے علم و تحقیق کو چند سیاسی بازیگروں کی ہوائے نفس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ وہ دعوت دیتے ہیں کہ بابرؒی مسجد میں 1813ء تک لگے ہوئے کتبوں کی تصویر کو جسے ڈاکٹر فرینس بچانن نے وہاں محفوظ کر دیا ہے جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ بچانن نے اعتماد اور استناد کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اجودھیا کی یہ مسجد 1467-68ء یعنی 1172ھ میں تعمیر کی گئی جو حسین شاہ شرقی کا عہد تھا۔ مسٹر گپتا کو ان کے ہفوات پر چیلنج کرتے ہوئے مسٹر شیر سنگھ نے لکھا کہ آپ اجودھیا کے بارے میں اس قدر ناقص معلومات کے ساتھ پوری دنیا کا چکر لگاتے رہتے ہیں اور وہ بھی عوام کے پیسے کی مدد سے اور افسوس ہے کہ کوئی عالمانہ اور تحقیقی بات کہنے کے بجائے وہاں کے پنڈوں کے ذریعہ پھیلائی گئی بیہودہ اور لغو باتوں کو سند کا درجہ عطا کرتے ہیں اور جو آپ کی فرضی کہانیوں کو جنہیں آپ حقیقت بنا کر پیش کر رہے ہیں چیلنج کرتا ہے اسے آپ دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔

مسٹر شیر سنگھ کہتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں بادشاہوں نوابوں اور راجاؤں نے مندروں کو زمین اور معافیاں عطا کی ہیں۔ جن کے ریکارڈ اب بھی موجود ہیں۔ حیرت ہے اس طرح کا کوئی بھی کاغذ یا ریکارڈ کسی بھی معافی یا پٹے یا نذرانے کا اس جنم بھومی مندر کے سلسلہ میں کیوں نہیں ملتا جو مسٹر گپتا کے مطابق پندرہویں صدی تک موجود تھی۔ ایک دلچسپ حقیقت کی طرف مسٹر شیر سنگھ مزید اشارہ کرتے ہیں کہ اجودھیا کے پنڈے 1785ء تک یہ دعویٰ کرتے تھے۔ بابرؒی مسجد کی جگہ جو رام مندر تھا اسے اورنگ زیب نے گرایا تھا پھر یہ کہنے لگے کہ بابرؒ نے توڑا تھا۔ پھر کبھی یہ کہتے ہیں کہ مندر کو گرایا گیا تھا اور کبھی یہ کہ وہ جگہ دراصل رام کی جائے

پیدائش تھی مسجد کے لئے غصب کر لی گئی، پھر یہ بھی قطعیت سے ہمیں نہیں بتاتے صرف رام وہاں پیدا ہوئے تھے کہ چاروں بھائی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ مسٹر شیر سنگھ ایک دلچسپ بات یہ بھی لکھتے ہیں کہ بابر مسجد جس مقام پر تعمیر ہوئی تھی وہ ایک ٹیلہ نما زمین ہے اور اندازہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے کوئی آبادی یا عمارت یہاں رہی ہوگی جسے گرے ہوئے مدتیں گزریں اور وہ ایک مستحکم ٹیلے کی شکل اختیار کر گئی۔ ہندو شاستر میں جیسی زمین پر مندر کی تعمیر ہو سکتی ہے اس کے اصولوں کے بالکل خلاف ہے نہ کہ ایسے ٹیلے پر جہاں زمین کے اندر انسانی کھوپڑیاں ہو سکتی ہوں۔

ولیم فنچ نے 1685ء میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ 1208ء میں مسجد کے قریب پٹھان کوٹ یا قلعہ کی مسلمانوں نے تعمیر کی تھی۔ اس پٹھان کوٹ کو اجودھیا کے پنڈے سولہویں صدی کے بعد رام کوٹ کے نام سے پکارنے لگے۔ غرض بابر مسجد جس ٹیلے پر ہے اس معے کو مسٹر گپتا وغیرہ حل کرنے سے قاصر ہیں۔

بابر مسجد میں شرقی دور کی طرز تعمیر کی عمارت کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر شیر سنگھ لکھتے ہیں کہ اس کی محرابیں غیاث الدین تغلق کے مقبرہ تعمیر شدہ 1315ء سے مماثل ہیں۔ اسی طرح اس کی ڈاٹ اٹالہ مسجد کی ڈاٹ کی مماثل ہے جو 1408ء میں تعمیر کی گئی اور یہ شیر شاہ کی مسجد سے بھی مماثلت رکھتی ہے جو دہلی میں 1540ء میں بنائی گئی۔

یہی مسٹر گپتا ہیں جن کے گمراہ کن اور بے بنیاد انکشافات کو وی ایچ پی نے بڑے فخر کے ساتھ مسجد کے انہدام سے پہلے وزارت داخلہ کو اس ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا کہ یہ دراصل مندر ہی کی اشیاء سے تعمیر شدہ ایک عمارت ہے جسے سولہویں صدی میں منہدم کر دیا گیا تھا حالانکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1975ء میں سرکاری طور پر جو کھدائی کی گئی تھی اس میں باضابطہ طور پر مسٹر گپتا شامل نہیں تھے۔

مسٹر شیر سنگھ نے مسٹر سوشیل سری واستوا کے حوالے سے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ بابر مسجد کے سب سے باہری جنوبی پھاٹک پر جو دو شیر بنے ہوئے ہیں وہ مشرقی عہد کے سکوں پر بنے ہوئے شیروں کے مماثل ہیں۔

مسٹر شیر سنگھ اس کتاب کے چھٹے باب میں اس ضابطہ اخلاق پر بین الاقوامی سطح کے مصنفین کے حوالوں سے روشنی ڈالتے ہیں اور اس باب کی تفصیلات اور شرائط و قواعد کو سامنے رکھیں تو مسٹر شیر سنگھ اور ان کے قبیل کے لوگوں کے لئے بابر مسجد کے گرد کھدائی کے بعد جس طرح کی چیزیں بزمِ خویش برآمد کی گئیں وہ سب ایک تماشا یا بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں جو دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے مترادف ہیں۔

مسٹر شیر سنگھ نے اس کتاب کے ساتویں باب میں جس کا عنوان ہے ”آثار قدیمہ فاشزم کا فرمانبردار“ میں مسولنی، ہٹلر کے عہد میں آثار قدیمہ سے جو منفی اور شررائگیز کام لیا گیا اس کا موازنہ و شوہندو پریشد کی اجودھیا میں کی گئی سرگرمیوں سے کیا ہے۔ وہ گراہم کلارک کی تصنیف ”آرکیالوجی اور معاشرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مسولنی نے روم امپائر کے آثار قدیمہ کی کھدائی اور اس کی نمائش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تاکہ اٹلی کے لوگوں کو ایک نہایت پر شکوہ شاہانہ ماضی کا احساس دلایا جائے۔ اس ساری کاوش کا مقصد سیاسی فوائد حاصل کرنا تھا تحقیق اور علم و فضل سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس طرح ہٹلر نے بھی جرمنی کے لوگوں کو غرور و تکبر کی بلندیوں تک لے جانا اور دوسرے لوگوں کو حقیر تصور کرنے کے لئے آثار قدیمہ کا سہارا لیا۔ نازی حکومت نے آثار قدیمہ کی طرف خاص توجہ کی تھی اور پروفیسر ہرمن شیندر نے اعلان کیا تھا کہ جرمنی کی عظمت کے نقوش ہم کو ہر قیمت پر قدیم ترین جرمنی میں تلاش کرنا ہے اور اس کے لئے ضرور کھدائی اور تلاش کرنی ہوگی۔ ہرنی اور اچھی ایجاد اور انکشاف کا سلسلہ قدیم جرمنی سے استوار کرنا ضروری قرار پایا۔ مسٹر

شیر سنگھ کا خیال ہے کہ اگر جرمن کی جگہ ہندو اور جرمنی کی جگہ ہندوستان لکھ دیا جائے تو ہٹلر کے عہد کی ساری سرگرمیوں پر و شو ہندو پریشد کی سرگرمیوں کا دھوکہ ہونے لگے۔ چنانچہ مسٹر شیر سنگھ کی رائے کے مطابق مسٹر گپتا اور مسٹر لال کی خوش گپیاں اس لائق ہیں کہ ان کو مضحکہ خیز قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ بیمار قوم پرستی کا نتیجہ ہیں اور ایک ایسے طاعون کی حیثیت رکھتی ہیں جسے انسانی نسل کی بقا کی خاطر کچل دینا چاہئے۔

مسٹر شیر سنگھ نے مسٹر گپتا کو چیلنج کیا ہے کہ انہوں نے بابر کی مسجد کے بغل میں کھدائی میں جو قدیم اینٹیں برآمد ہوئیں جن کی بنیاد پر وہ گیارہویں صدی عیسوی کے مندر کا وجود ثابت کرتے ہیں کیا ان کو سائنٹفک طریقوں سے آزمایا اور ان کھمبوں کو جو بابر کی مسجد میں تھے اور جنہیں انہوں نے گڑھوال کما یوں کا قرار دیا ہے۔ مسٹر سنگھ پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مسٹر گپتا نے پیڑ و گرافک ٹسٹ کے بغیر ایک مفسدانہ اعلان کر دیا انہیں اس کے لئے جعل سازی کے جرم میں ماخوذ کیا جانا چاہئے اس لئے کہ مسٹر شیر سنگھ نے اس سلسلہ میں جو سائنٹفک ٹسٹ کر کے معلومات کی ہیں وہ اس کے برعکس ہیں۔

مسٹر شیر سنگھ نے مسٹر لال کے اجمودھیا کے محل وقوع کے بارے میں دعوے کو بھی چیلنج کیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے ٹھوس دلائل دیئے ہیں جس میں سر جو کے شمالی کے بجائے جنوبی کنارے پر اس کی آبادی کا پتہ والمیکی رامائن سے چلتا ہے۔ اپنے آخری ابواب میں وہ یہ نتیجہ پورے اعتماد کے ساتھ اخذ کرتے ہیں کہ شرقی مسجد کو پنڈوں نے بابر کی مسجد بنا دیا۔ پروفیسر سوشیل شریو استوا استاد شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی نے بھی بابر کی مسجد کو شرقی یا تعلق عہد کی تعمیر قرار دیا ہے جس کی بابر کے عہد میں تزئین و آرائش کی گئی ہوگی اور جسے بعد میں بابر کی مسجد کہا جانے لگا۔ اس لئے کہ اس مسجد کی پوری بناوٹ شرقی انداز کی ہے اور طرز تعمیر مکمل طور پر اس عہد کے متعلق

ہے اور مغل عہد میں یہ طرز تعمیر برقرار نہیں رہا تھا۔

غرض یہ ایک نادر اور نرالی کتاب ہے اور یہ اس وقت تک تاریخ کے ایک بہت بڑے جھوٹ بہت بڑے اندھیر اور بہت بڑے ظلم کا پردہ چاک کرتی رہے گی جب تک انصاف اور قانون کا تقاضہ پورا نہ ہو اور یہ مسجد اپنی قدیم جگہ پر دوبارہ نہ بنادی جائے اور ان لوگوں جنہوں نے حکومت و اقتدار کے بل پر ان غنڈہ گردوں کو پوری آزادی دلائی کہ وہ اس مسجد کو ان کی سرپرستی میں منہدم کر دیں یا تو قانون قدرت کے مطابق عبرتناک سزا نہ ملے یا پھر ملکی قوانین کے شکنجے ان کو کیفر کردار تک نہ پہنچادیں۔



رام مندر کی موجودگی کا دعوا بے معنی

معروف مورخ پروفیسر رام سرن شرما

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر میں یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ گیارہویں، بارہویں صدی میں اجودھیا میں رام مندر تعمیر کیا گیا تھا، انکی تائید میں شہہ برابر بھی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ آثار قدیمہ کی دریافتیں اور کھدائی کے نتائج اس طرح کے کسی دعوے کی تائید نہیں کرتے۔ رام سیتا اور لکشمن کی مورتیاں چھٹی صدی کے آس پاس ہمیر پور ضلع میں ملتی ہیں۔ جھانسی ضلع میں دشاوتار مندر کی باہری دیوار پر ان تینوں کی ایک ساتھ تصویریں بھی کندہ ملتی ہیں۔ بہار کے نواہہ ضلع میں بھی مجسمے ملتے ہیں اور تقریباً اسی زمانے کا رامائن کا مٹی کا مرقع بکسر سے بھی ملا ہے۔

مدھیہ پردیش میں رام کے صرف تین ایسے تاریخی مندر ہیں جو بارہویں صدی کے ہیں (بیکر، اجودھیا حصہ اول صفحہ 84) لیکن اتر پردیش میں ہمیں سولہویں صدی تک نہ تو کسی رام مندر کے وجود کی بات سنائی دیتی ہے، نہ رام جنم بھومی مندر کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ کنک منڈپ یا کنک بھون جو سب سے پرانا مندر ہے، سترہویں صدی کا ہے، 1804-1805ء میں اودھی زبان میں لکھے گئے گرنٹھ ”شری مہاراج چرت“ میں کہا گیا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کنک بھون اور رتن سنگھاسن رسک فرقے کے مراکز کے روپ میں پختے تھے۔ یہ غالباً کنک بھون کے وجود کا سب سے پرانا مرکز ہے۔ کنک مندر نیپال کی ترائی میں

جنک پوری میں سیتا کا سب سے پرانا مندر ہے۔ کنک بھون اور کنک مندر، دونوں ہی سترہویں صدی میں مغل دور حکومت میں تعمیر کئے گئے تھے، وہ فن تعمیر کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے ہیں۔ ان دونوں مندروں کے سترہویں صدی کے ہونے کی بات اس لئے بھی زیادہ درست نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں رام کی پوجا اپنانے اہمیت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ اس کا سبب تھیں پندرہویں صدی میں راما نند کی تعلیمات اور اس کے بعد کے زمانے میں ملوک داس، کبیر، رائے داس اور دادو جیسے ان کے شاگردوں کی کوششیں۔ اٹھارہویں صدی کے دوران اودھ کے شیعہ نواب کے ہندو اور مسلمان دیوانوں نے اجودھیا کے ہندو مندروں اور دوسری مقدس عمارتوں کو تحفظ فراہم کیا تھا، لیکن اس وقت بھی کسی رام مندر کا خصوصی تذکرہ نہیں ملتا۔

کسی مصنف یا قلم کار کے لئے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی دور سے کیوں نہ ہو، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات میں اپنے زمانے کے تمام واقعات اور اہم باتوں کا تذکرہ کرے یا ان کی جھلک پیش کرے۔ لیکن اس کی کتاب کا تعلق جس موضوع سے ہو، وہ جس تناظر میں اسے لکھ رہا ہو، اسے تو وہ ضروری اہمیت تو دے گا ہی۔ رام کے بے مثال بھکت اور اجودھیا میں اپنی عظیم تخلیق کی شروعات کرنے والے تلسی داس سے تو یہ توقع بجا طور پر کی ہی جاسکتی ہے کہ اگر رام مندر وہاں تھا تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ اگر رام سے جڑے ہونے کے سبب، ان کے زمانے میں اجودھیا تیرتھ استھان ہوتا تو وہ اس کا تذکرہ بھی ضرور کرتے۔

اجودھیا میں کچھ جین اور شیو مندر رہے ہوں گے۔ اجودھیا میں شیو کو ماننے والا فرقہ وشنو کو ماننے والے اس فرقے سے کہیں پہلے وجود میں آیا تھا جس کے ساتھ عہد وسطیٰ میں رام کو بڑے پیمانے پر جوڑ دیا گیا۔ شیو کے بیٹے کار تک کی سواری مور کی تصویر پہلی اور دوسری صدی اجودھیا کے سکوں پر کندہ ملتی ہے۔ بارہویں سے

سترہویں صدی کے دوران لکھے جانے والے ”اجودھیا مہاتمیہ“ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اجودھیا میں وشنو کی پوجا کے آغاز کے بعد بھی عہد وسطی کے اواخر تک یہاں شیو کی پوجا کا زور بنا رہا تھا۔ مہاتمیہ میں گیارہ وشنو مندروں کا ذکر ملتا ہے ان کی تعداد ان سے دو گنی تھی (ہنس بیکر، اجودھیا، جلد ۳ صفحہ ۲۶/۲۷) اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ مسجد میں استعمال کئے جانے والے ستون کسی وشنو مندر کے ہیں۔ یہ ستون شیو مندر کے بھی ہو سکتے ہیں۔

اجودھیا کے بارے میں بیکر کی جامع اور تحقیقی کتاب سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہاں کوئی رام مندر تھا۔ لیکن انہوں نے کہیں کہیں رام رکھش ترپاٹھی کی تصنیف ”رام جنم بھومی کا رکت رنجت اتھاس“ پر بھی تکیہ کیا ہے اور بابر کی مسجد سے متعلق تنازعہ کے بارے میں گمراہ کن باتیں کہہ گئے ہیں۔

بابر کی مسجد میں جو ستون استعمال کئے گئے ہیں وہ کسی شیو یا جین مندر کے بھی ہو سکتے ہیں، کسی مسجد میں پرانی عمارتوں کے ملبہ کے استعمال کی مثالیں دوسری جگہوں پر بھی ملتی ہیں۔

مثال کے طور پر قطب مینار کے پاس کی عمارتوں کے حوالے سے اس طرح کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کئی عمارتوں میں پہلے کی عمارتوں کا ساز و سامان استعمال کیا گیا ہے۔ کھدائی کے ذریعہ جو دریافتیں ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کشان دور کی اینٹیں گپت دور کی عمارتوں میں استعمال کی گئی ہیں۔ ایسا صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہوا ہے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی الگ الگ ادوار میں اس طرح کی روایتوں پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔ جہاں تک بابر کی مسجد کا تعلق ہے یہ بتانے کے لئے یا یہ دکھانے کے لئے کوئی بھی ثبوت نہیں ملتا کہ اس کی تعمیر کے لئے کسی رام مندر کو منہدم کیا گیا تھا اور اس کی جگہ پر مسجد بنائی گئی تھی۔ اجودھیا اور فیض آباد کے آس پاس کے علاقوں میں مسلمان پندرہویں صدی کے آس پاس بسے

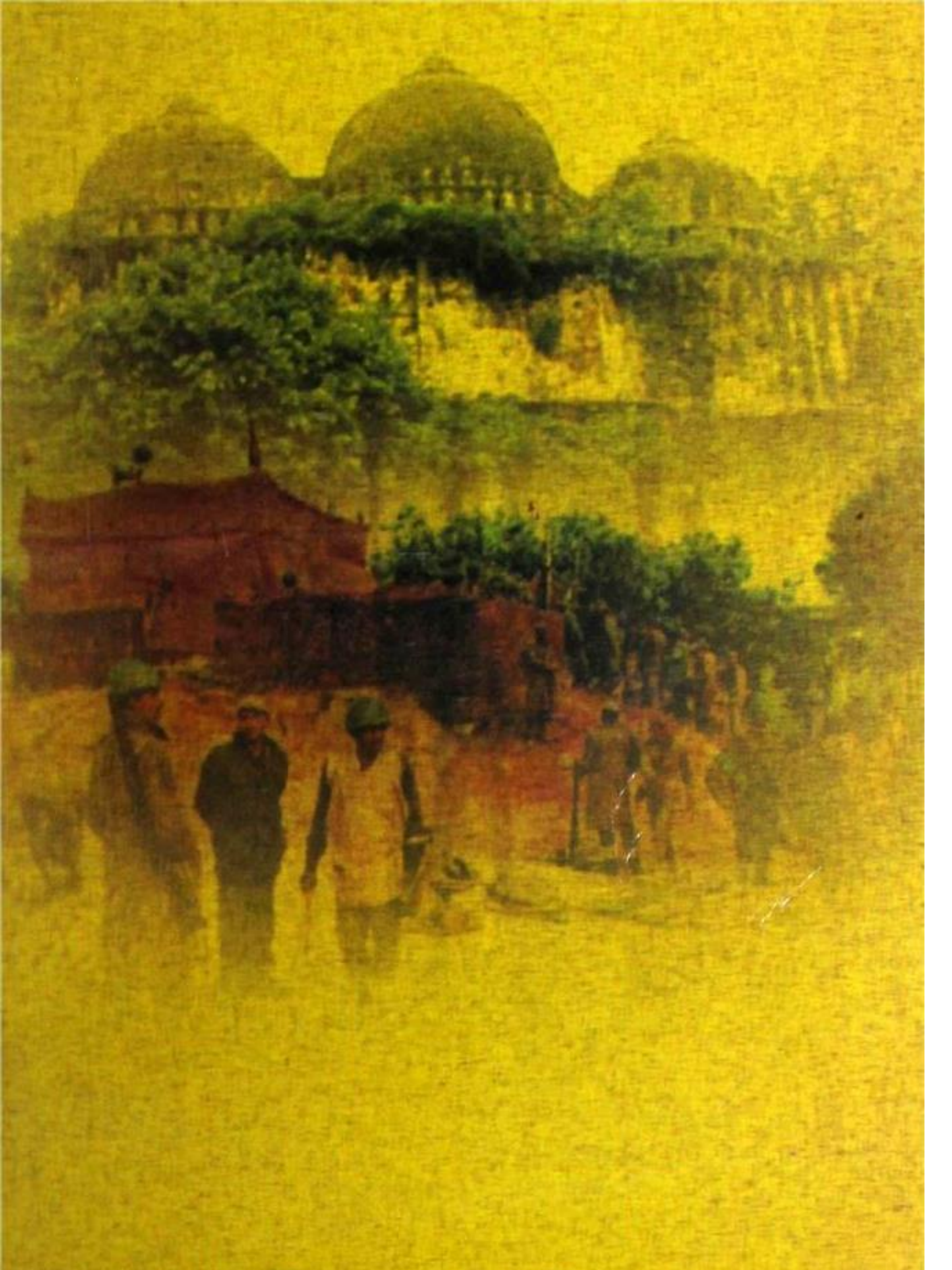
شروع ہوئے تھے اور غالباً وہاں مسجدیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ لیکن اس طرح کی کسی مسجد کی تعمیر کا کوئی تذکرہ بابر نامہ میں نہیں ملتا۔ یہ تو مسنر بیورتج کے تحریر کردہ حاشیوں میں ملتا ہے جنہوں نے بابر کی خودنوشت سوانح کا 1921ء میں ترکی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا، انہوں نے ایک ایسے کتبے کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق میر باقی نے بابر کے حکم پر 15 دسمبر 1526ء سے 5 دسمبر 1529ء تک کے آس پاس ایک مسجد بنوائی تھی۔ میر باقی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس کتبے میں مندر کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اس لئے یہ قیاس کرنا کہ کسی رام مندر کو منہدم کر کے مسجد بنائی گئی تھی بالکل بے بنیاد ہے۔

شریمتی بیورتج کے حاشیوں کی بنیاد پر اے آر خاں نے 12 اپریل اور 18 ستمبر 1928ء کے درمیان کے تین دنوں کا ذکر کیا۔ یہ ناقابل یقین ہے کہ مسجد ان تین دنوں کے اندر بنائی گئی ہوگی۔ مگر فیصلہ کن مسئلہ بابر کی تعمیر کا نہیں بلکہ مبینہ رام مندر کی تباہی کا ہے۔ یہاں شریمتی بیورتج اس صدی کے پہلے دہے میں نیول کے ذریعہ تحریر کردہ ”فیض آباد گزیٹ“ سے حوالہ پیش کرتی ہیں۔ نیول کا کہنا ہے کہ ایک قدیم مندر کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی گئی تھی۔ بلا کسی بنیاد کے ایک ”قدیم مندر“ الفاظ کے بعد بیورتج قوسین میں لکھتی ہیں کہ ”رام کا جنم استھان ظاہر کرنے والی صرف شریمتی بیورتج ہی ہیں، جو ”قدیم مندر“ کو رام مندر کہتی ہیں، جس کا بابر نامہ میں یا کسی اور جگہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔

بابر اودھ کا ذکر کرتا ہے مگر اچودھیا کا نہیں، دوسری طرف وہ گوالیار کا تذکرہ بھی کرتا ہے بڑے تجسس کے ساتھ، وہ وہاں کی عام اور مذہبی عمارتوں کی تعمیر کا چرچا کرتا ہے، ان میں الٹمش کے ذریعہ تعمیر کردہ ایک مسجد ہے بقیہ بھی ہندو عمارتیں ہیں۔ بابر مورتیوں اور بت خانوں کا تذکرہ تعریفی انداز میں کرتا ہے۔ یہ المیہ ہے

کہ ہندو فن اور فن تعمیر کے ایک شیدائی کے سر پر مندر گرانے کا سہرہ باندھا جائے۔
 ایک ایسا مندر گرانے کا جس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ بابر مسجد
 اجودھیا کے کسی رام مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی۔ ہندو دھرم کی روایتیں انہیں انصاف
 پر مبنی نہیں ٹھہراتیں۔ 1980ء تک اتر پردیش آثار قدیمہ کے ذریعہ اجودھیا میں
 تقریباً 6 ہزار چھوٹے بڑے مندر رجسٹرڈ کئے گئے۔ رام کے پجاری اس تعداد کو
 اور زیادہ بڑھانے میں آزاد ہیں۔





Al-Kitab  انٹرنیشنل
International

Jamia Nagar, New Delhi-25

9312508762, 011-26986973